پاکستانی اردو ناول میں معلّم کے کردار کی پیشکش کا مطالعہ

(''راجہ گدھ''، ''دیوار کے پیچھے''، ''جنم کنڈلی'' اور ''آدھے ادھورے خواب'' کے خصوصی حوالے سے)

مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)

مقالہ نگار:

خالد محمود

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

پاکستانی اردو ناول میں معلّم کے کردار کی پیشکش کا مطالعہ

(''راجہ گدھ''، ''دیوار کے پیچھے''، ''جنم کنڈلی'' اور ''آدھے ادھورے خواب'' کے خصوصی حوالے سے)

مقالہ نگار:

خالد محمود

یہ مقالہ

پی ایچ ڈی (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **پاکستانی اردو ناول میں معلّم کے کردار کی پیشکش کا مطالعہ**
(''راجہ گدھ''، ''دیوار کے پیچھے''، ''جنم کنڈلی'' اور ''آدھے ادھورے خواب'' کے خصوصی حوالے سے)
پیش کار: **خالد محمود** رجسٹریشن نمبر: PhD/Urd/S17-۱۲۶۷

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان وادب

ڈاکٹر عابد حسین سیال ______________________
نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ______________________
ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل محمد جعفر (ر)، ہلال امتیاز (ملٹری) ______________________
ریکٹر

تاریخ: ___________

اقرارنامہ

میں، خالد محمود حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے پی ایچ ڈی اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عابد حسین سیال کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

خالد محمود

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

Abstract

A novel does not cover a single person or event, but a society as a whole. The various characters in a novel reflect the thinking of their creator. The writing under review also includes four different novels; Bano Qudsia's "Raja Gadh", Fahim Azmi's "Janam Kundli", Shahid Siddiqui's "Aadhy Adhooray Khawb" and Anis Nagi's "Dewar K Peechy" through which an attempt has been made to analyse the thoughts of four worldly-known novelists.

This literature discusses the background of the four novels in three important aspects. In the aforementioned four novels, the lead role ,being a teacher, has been critically analyzed as a friend, a philosopher and a leader. The essay also discusses the process of education and other factors influencing it.

The teachers, characterized in the four novels, and their teaching methods have also been examined in the light of the opinions of various educators. Different examples, from these four novels, have been selected and examined while keeping in view the significance of Philosophy and its impact from the perspective of a teacher. Likewise, an attempt has been made to examine the role of the teacher as a friend through this article. Thirdly, in the context of these four novels, a teacher has been made a part of the analysis as a leader, and meanwhile, teacher has been portrayed as a philosopher as well.

اظہارِ تشکر

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تحقیقی مراحل کی ایک ایک کر کے تکمیل ہو رہی ہے وہ تحقیقی عمل جو ایک انتہائی دشوار گزار عمل ہے، میرے بس کی بات نہیں تھی اور میں یقیناً ان ہی راستوں میں کہیں گم ہو جاتا لیکن ایسے میں ڈاکٹر عابد سیال صاحب کی علمی اور مہربان ہستی نے اس مشکل کو آسان بنا دیا۔ یہاں یہ ذکر کرنا لازم ہے کہ میں ان دشواریوں کی طرف کبھی رخ نہ کرتا اگر ماں جیسی مہربان اور اُستاد جیسی شفیق ہستی ڈاکٹر روبینہ شہناز صاحبہ نے مجھ میں یہ حوصلہ نہ پیدا کیا ہوتا۔ یہ انھیں کی بدولت ہوا کہ مجھ جیسا شخص بھی علمی اور تحقیقی دریا میں بے دھڑک کود پڑا۔

پاکستانی اردو ناول میں معلّم کے کردار کی پیشکش کا مطالعہ میں ناول، معلّم، دوست، قائد اور فلسفی جیسے مباحث میرے بس کی بات نہیں تھی لیکن نمل کی علمی فضاء اور شعبہ اردو کے مایہ ناز اساتذہ نے باتوں ہی باتوں میں تعلیم کر دی اور میرے لیے ان مباحث کو سمجھنا آسان ہو گیا، میں شعبہ اردو کے اساتذہ کا ممنوں اور مقروض رہوں گا۔

میں آخر میں اپنے مرحوم دوست میاں محمد اسلم صاحب کا تذکرہ ضرور کروں گا، جن کی فکر اور روح نے مجھے ہمیشہ کام میں جان کھپانے کی طرف راغب رکھا، یہ انہی کی خواہش پہ شروع ہوا اور انہی کی یاد سے مکمل ہوا۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کی آخرت کی تمام منزلوں کو آسان کر دے۔

تمام رفقاء کار اور دوستوں نے بھرپور مدد کی جس کا نتیجہ اس مقالے کی صورت میں حاضر ہے۔

خالد محمود

باب اول

تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

i۔ موضوع کا تعارف:

دنیا بھر میں ناول کی صنف کی مقبولیت کی بڑی وجہ زندگی اور معاشرت سے اس کی براہِ راست جڑت ہے۔ ناول کے فنی اور فکری ڈھانچے میں یہ گنجائش موجود ہے کہ یہ زندگی کی حقیقتوں کو نسبتاً واضح صورت میں نہ صرف منعکس کرتا ہے بلکہ پیش کردہ احوال کے محرکات اور عوامل پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اُردو ناول میں برصغیر کے معاشرے کے خدوخال جس تفصیل اور تنوع کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اردو ادب میں اس کی ایک جداگانہ اہمیت ہے۔ ناول کے مختلف کردار، اگر وہ ہنر مندی سے تخلیق کیے گئے ہوں تو، نہ صرف اپنے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ اپنے انفرادی خدوخال بھی رکھتے ہیں۔ اُردو ناول نگاروں نے شہری اور دیہی زندگی کے متعدد ایسے گوشے بہت کامیابی کے ساتھ پیش کیے ہیں جن سے اس طبقے کے مسائل و معاملات بھی اجاگر ہوتے ہیں اور زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے ربط و تعلق پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ایسے ہی کرداروں میں سے ایک اہم کردار معلّم کا بھی ہے جس کے وسیلے سے ہمارے معاشرے کی تعلیمی صورتحال کو روشنی میں لانے کی سعی کی گئی ہے۔ مجوزہ موضوع اسی تناظر میں چار منتخب ناولوں کے مطالعے پر مشتمل ہے جس میں بانو قدسیہ کا ناول ''راجہ گدھ''، انیس ناگی کا ناول ''دیوار کے پیچھے''، فہیم اعظمی کا ناول ''جنم کنڈلی'' اور ''شاہد صدیقی کا ناول ''آدھے ادھورے خواب'' شامل ہیں۔

ii۔ بیانِ مسئلہ

اُردو ناول میں معلّم کے کردار کے کئی روپ پیش کیے گئے ہیں۔ یہ کردار پرائمری سکول کے اساتذہ سے لے کر یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے اساتذہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ معاشرے کے دیگر طبقوں کی طرح ان میں بھی اچھے اور برے دونوں طرح کے کردار موجود ہیں جو معاشرے کے اس طبقے کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ یوں معلّم کا کردار ایک دریچہ ہے جس سے ہم اپنے معاشرے کے علمی اور اخلاقی

پہلو پر نظر ڈال سکتے ہیں۔ مجوزہ تحقیق کے سامنے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ معلّم کا مثالی کردار کن خدوخال کا مجموعہ ہے اور اردو ناول میں پیش کیے گئے کردار کس حد تک ان خصوصیات پر پورا اترتے ہیں۔

iii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

اُردو ناول پر کردار نگاری کے حوالے سے کچھ کام ہوئے ہیں لیکن یہ پہلو ابھی تک واضح روشنی میں نہیں گیا تھا۔ اس مطالعے سے نہ صرف اردو ناول کا ایک اہم گوشہ اجاگر ہوا ہے بلکہ ہماری معاشرتی صورتحال میں اُستاد کے کردار کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں بھی مدد ملی ہے۔

iv۔ تحقیق کی اہمیت

مجوزہ تحقیق کی اہمیت دو طرح ہے، اوّل یہ کہ اس کے ذریعے اردو ناول میں پیش کیے گئے ایک ایسے کردار کا تجزیہ کیا گیا ہے جو ہمیشہ ناول کے اہم کرداروں میں شامل رہا ہے لیکن کردار نگاری کے حوالے سے اس پر تاحال کوئی توجہ نہیں کی گئی، دوسرے یہ کہ اس کے ذریعے سماجی سطح پر معلّم کے کردار کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

v۔ تحدید

مجوزہ تحقیق میں چار ناول بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں جن میں بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ''، انیس ناگی کا ''دیوار کے پیچھے''، فہیم اعظمی کا ''جنم کنڈلی'' اور شاہد صدیقی کا ''آدھے ادھورے خواب'' شامل ہیں۔ ان چاروں ناولوں میں معلّم کا کردار موجود ہے جو ناول کے کلیدی کرداروں میں سے ایک ہے۔ یہ مطالعہ اسی کردار کے تجزیے تک محدود ہے۔

vi۔ مقاصدِ تحقیق

مجوزہ تحقیق میں درج ذیل مقاصد پیشِ نظر ہیں:

۱۔ سماجی سطح پر معلّم کے کردار کی فلسفیانہ تشکیل کا تجزیہ کرنا۔

۲۔ مذکورہ منتخب ناولوں میں معلّم کے کردار کی مختلف جہات کا تعین کرنا۔

۳۔ مذکورہ منتخب ناولوں میں معلّم کے کردار کی پیشکش کے محرکات و مضمرات کا تجزیہ کرنا۔

vii۔ تحقیقی سوالات

مجوزہ تحقیق کے دوران درج ذیل تحقیقی سوالات سامنے رکھے گے ہیں:

۱۔ معلّم کیا ہے؟ فلسفیانہ سطح پر اس کردار کی تشکیل کے عناصر کیا ہیں؟

۲۔ اُستاد کی ذات کے کون سے پہلو اُردو ناول میں منعکس ہوئے ہیں؟

۳۔ منتخب ناولوں میں معلّم کے کردار کی پیشکش کی نوعیت، اہمیت اور مضمرات کیا رہے ہیں؟

viii۔ نظری دائرہ کار

انسان کی زندگی اور اس سے متعلقہ تمام امور درحقیقت آج تک کی موجودہ حالت میں بتدریج ترقی کرتے ہوئے پہنچے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان بھی ارتقائی منازل طے کرتا گیا حتی کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور کا حصہ بنا۔ ابتدا میں انسان نے اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کو ترجیح دی مگر رفتہ رفتہ سہولیات کی تلاش میں سرگرداں انسان سائنس کی سیڑھیوں پر قدم جمانے میں کامیاب ہو گیا۔ سائنس اور دیگر تمام تر علوم میں دسترس حاصل کرنے کے بعد ان تمام علوم و فنون کو اگلی نسلوں اور اگلے ادوار تک منتقل کرنے کا وظیفہ عمل تعلیم کے ذمہ ٹھہرا۔ عمل تعلیم کے دیگر وظائف کو سرانجام دینے کی ذمہ داری بنیای طور پر اُستاد کے سر ہے۔

اُستاد یا معلّم ہی وہ ہستی ہے جو عمل تعلیم میں ایک متعلم کے لیے راہنمائی فراہم کرتے ہوئے سیکھنے کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ ایک اُستاد کی شخصیت میں اپنے متعلم کے لیے شفقت و محبت اور دوستانہ رویہ کی موجودگی از حد ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معلّم کی قائدانہ صلاحیتوں اور فلسفیانہ رویہ جات کی بنا پر بھی متعلم کو بہت کچھ سیکھنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔

معلّم بطور فلسفی

کسی مضمون کا محض ایک بار مطالعہ کر لینا کافی نہیں علوم میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، نئے حقائق کا انکشاف ہو رہا ہے، ہر موضوع پر تحقیقات جاری ہیں اور نئے نئے گوشے بے نقاب ہو رہے ہیں، تحریکات جنم لے رہی ہیں، پرانے نظریات کی تصدیق یا تردید کا عمل جاری ہے، تعلیم میں نئے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں، فلسفے جنم لے رہے ہیں۔ اُستاد کے لیے ان سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ اُستاد جو مسلسل اضافی مطالعے کے ذریعے اپنے علم کو وسیع نہیں کرتا اپنے فرائض میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ اس

کے خیالات جامد، شخصیت بے حس اور تدریس غیر موثر رہتی ہے۔ عہد قدیم میں سقراط وہ عظیم فلسفی ہے جس نے پہلی بار اخلاقیات کا فلسفہ پیش کیا۔ اس نے خلاقیات کے بارے میں چند سوالات قائم کیے۔ مثلاً نیکی کیا ہے؟ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ دیانت داری کسے کہتے ہیں؟ جرات، ایمانداری اور صداقت کیا ہے؟ سقراط سوفسطائیوں کے اس مقولے پر کہ "فرد حقیقت اور سچائی کی کسوٹی ہے" پر یقین نہ رکھتا تھا بلکہ اس کے نزدیک "حقیقت صرف وہی افراد پہچان سکتے ہیں جو عالم فاضل ہوں اس لئے حقیقت کو صرف علم کے ذریعے ہی پہچانا جا سکتا ہے۔" سقراط تو اس پر یقین رکھتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھ کر قبول نہیں کر لینا چاہیے بلکہ اگر آپ کا دل اس چیز کو نہیں مانتا تو ہرگز اس چیز کو قبول نہ کریں۔ سقراط نے معلّم کو جہالت دور کرنے کا سبب کہا ہے، جس کو عشرت حسین بصری نے یوں نقل کیا ہے:

"کیا تم معلّم ہو؟ اگر ہو تو دوسروں کی جہالت ختم کرنے سے پہلے اپنی جہالت کس حد تک دور کی ہے؟"(۱)

افلاطون یونانی اساتذہ میں بڑا مقام رکھتا ہے۔ تعلیم، معلّم اور تعلیم کے بارے میں اس کے نظریات بلند پایہ حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جسمانی اور ذہنی تربیت کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ یہ وہ فلسفی ہے جس نے عورت اور مرد کی تعلیم کو لازمی قرار دیا اور ایک اچھا اُستاد اس شخص کو مانتا ہے جس کی صفات کی بنیاد یہ ہو کہ وہ متعلّم کے فطری میلانات کا ادراک رکھنے والا ہو۔ اُستاد کی تعریف کے بارے میں دی جانے والی رائے کو عشرت حسین یوں لکھتے ہیں:

" فطری میلانات کو بھانپنے کے لیے معلّم کا سمجھدار ہونا نہایت ضروری قرار دیتا ہے۔"(۲)

ارسطو کو تمام فلاسفر نے معلّم اوّل قراد دیا ہے اس نے بلاشبہ تعلیمی حوالے سے بنیادی کام کیا اور انسانی صفات کو تعلیم کے ذریعے اجاگر کرنے کے لیے زور دیا۔ اساتذہ کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے انسانی روح، جسم اور عقل کے بارے میں آگاہی کی ذمہ داری لی۔ معلّم کی ذمہ داری پر بات کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اچھا اُستاد وہ ہے جو اپنے شاگردوں کو ایسی تعلیم دے جس کو عشرت حسین بصری نے یوں لکھا ہے:

" وہ جذبات کو عقل پر غالب نہ آنے دیں اور اپنی عقل سے استفادہ کریں۔"(۳)

فلسفہ تعلیم کے مطالعے سے معلّمین میں وسعت فکر پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ تجزیاتی صلاحیت بڑھ جاتی ہے اور تجزیاتی پہلو جس کے ذریعے معقول دلائل تلاش کر کے حقیقت تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے گویا فلسفہ تعلیم کے ذریعے معلّمین اپنی تعلیمی سرگرمیوں کی نظریاتی بنیادوں سے آگاہ ہونے اور تدریسی عمل کو بہترین اصولوں کے تحت جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ دیگر تعلیمی سرگرمیوں کو مثبت انداز میں چلاسکتے ہیں۔

تقریری طریقہ تدریس

فلسفہ دراصل دلائل کا متقاضی ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی فلسفہ یا نظریہ پیش کیا جاتا ہے تو اس کے پیچھے موجود تمام تر محرکات پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ایک معلّم جب بحیثیت فلسفی تقریری طریقہ تدریس کے ذریعے اپنے طلبہ کو سکھانے کی کوشش کرتا ہے اور لگاتار دلائل دیتے ہوئے اپنی گفتگو کو موثر سے موثر ترین بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے موضوع کی مختلف جہات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے طلبہ کے سامنے اس کو ثابت کرتا ہے۔ متعلم اپنے معلّم کی اس تقریر سے اپنے علم بساط کے مطابق علم کو اخذ کرتا ہے۔

بحثی / سقراطی طریقہ تدریس

انسان اپنی ابتدا سے آج تک سیکھنے کے عمل میں متحرک ہے۔ لیکن ہماری گفتگو میں دولوگ موضوعِ بحث ہیں ایک تو معلّم اور دوسرا متعلم، کیوں کہ عملِ تعلیم ان دونوں کے درمیان ہی ایک مستقل رابطہ ہے۔ ایک معلّم اپنے طلبہ کو علوم وفنون سے آراستہ کرنے کے لیے مختلف طریقہ ہائے تدریس کو اپناتا ہے۔ اپنے تجربات کی روشنی میں متعدد فلسفے اور نظریات بھی پیش کرتا ہے۔ بعض اوقات اپنے نظریات کو زیادہ موثر بنا کر پیش کرنے کے لئے مباحث کے در کھولتا ہے یا یوں کہہ لیں کے سقراطی طریقہ تدریس کو اپناتا ہے۔

یہ طریقہ تدریس دراصل اس وقت اپنایا جاتا ہے جب موضوع بحث عنوان پر متعلم کو بھی کسی حد تک ادراک حاصل ہو جب کہ معلّم کو اس عنوان پر مکمل دستگاہ حاصل ہو۔ ایک معلّم سقراطی طریقہ تدریس میں کسی فلسفیانہ نقطہ کو اپنے طلبہ میں بحث کیلئے پیش کرتا ہے اور پھر اس بحث سے نتائج اخذ کرتے ہوئے اس نظریہ کی حقیقتوں پر روشنی ڈالتا ہے

استقرائی طریقہ تدریس

علم کے میدان میں آج تک انسان جو کچھ بھی حاصل کر سکا وہ سب ملا کے دراصل حقیقی علم کے کل کے مقابلے میں جزہے بالکل ویسے ہی جیسے کہ سمندر کے مقابلے میں قطرہ ہو۔ بہت سا علم ہم استقرائی طریقہ

کار سے اخذ کر چکے ہیں مگر یہ کہنا بے جا نہیں کے جتنا علم اصطلاحی طور پر حاصل ہوا اس سے کہیں زیادہ قیاس آرائیوں پر مشتمل ہے۔

استخراجی طریقہ تدریس

انسان حصول علم کے سفر میں آج کے اس ترقی یافتہ سائنسی دور تک آن پہنچا ہے۔ سائنسی قوانین کا اطلاق مشاہدہ اور ادراک کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ ایک معلّم مشاہدہ اور ادراک کے حصول کے لیے اپنے طلبہ کو استقرائی طریقہ کار کے ذریعے بہتر سے بہترین نتائج تک پہنچاتا ہے۔ مختلف تجربات کی روشنی میں حقائق کی پردہ کشائی کرتا ہے۔ استقرائی طریقہ کار دراصل استخراجی علوم کو عملی اور حتمی میں شکل پیش کرتا ہے۔ معلّم اپنے متعلم کو مختلف تجربات کے ذریعے نتائج کو اخذ کرنا سکھاتا ہے

معلّم بطور قائد

ہر نظام تعلیم میں اُستاد مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ بہ الفاظ دیگر تعلیم میں اُستاد کو وہی حیثیت ہے جو جسم میں روح کو۔ اس کے بغیر اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ تعلیمی نظریات، بدلے نصاب اور طریقہ ہائے تدریس میں انقلابی تبدیلیاں آئیں لیکن استاد کی حیثیت اپنی جگہ مسلمہ رہی۔ اس کا مقام ہمیشہ بر قرار رہا کسی زمانے میں بھی اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکا اور نہ اس کی اہمیت میں کسی قسم کی کوئی کمی محسوس ہوئی، بعض مفکرین دوسری خوبیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو ایک اچھے معلّم میں ہونی چاہیے۔ مثلاً وہ نظم و ضبط کا حامل ہو، کسی فلسفہ حیات کو عزیز رکھتا ہو۔ وہ طلبہ کے انفرادی اختلافات اور نفسیاتی تقاضوں کا خیال رکھتا ہو۔ اس میں قیادت کی صلاحیت ہو۔ فراخ دل ہو، سنجیدہ ہو اور خوش و خرم اور جوش و خروش کا حامی ہو اور تدریس کے طریقوں سے آگاہ ہو۔ اس میں انانیت نہ ہو، وہ جمہوری قدروں پر یقین رکھتا ہو۔ تدریس ایک فن ہے لہذا معلّم کو اپنے فن میں تربیت یافتہ بھی ہونا چاہیے۔ پروفیسر محمد عثمان، اُستاد اور معلّم کو لیڈر اور رہنما قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ” تعلیم میں ایک بنیادی مسئلہ اس کی قیادت کا مسئلہ ہے۔ یوں تو قیادت کی ضرورت ایک ہمہ گیر تقاضا ہے۔انسانی سرگرمیوں کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ وہ اچھی اور موزوں قیادت میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہ کرے اور بری یا نا اہل قیادت میں بہتر ذوق عمل زنگ آلود نہ کردے۔ سائنس ، ٹیکنالوجی، مذہب، انجینئرنگ

،صحت، انتظامیہ، دفاعی افواج اور زندگی کے دوسرے شعبوں کے لیے لیڈر مہیا کرے۔ لہٰذا اس کے لیے قیادت کا سوال دوہری اہمیت رکھتا ہے۔"(۴)

تاہم تعلیم سے لیڈر اور قیادت کا بنانا بنیادی تقاضا ہے اور وہ ایک قائد / معلّم ہی سے ممکن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ قرون وسطیٰ کے علما، معلّمین میں یہ کوئی تخصیص نہ تھی کہ کون ان میں معلّم ہے اور کون نہیں ہے۔ ہر عالم کسی نہ کسی طرح درس و تدریس میں مشغول رہتا تھا۔ کوئی تو باقاعدہ کسی جگہ بیٹھ کر درس دیتا تھا اور کوئی کتابیں شائع کر کے اشاعت علم میں مصروف رہتا تھا، تاہم اگر ہم اس جگہ ان علما کا بھی تذکرہ کریں جو پیشہ ور اُستاد نہ تھے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس دور میں ہر طالب علم کے لیے لازم تھا کہ وہ صرف کتابوں ہی سے اپنے علم میں اضافہ نہ کرے بلکہ کسی اُستاد کی خدمت میں رہ کر براہ راست درس لے۔ بعض مسلمان تو اس بات کو بد بختی تصور کرتے تھے کہ اُستاد / معلّم کو چھوڑ کر محض کتاب پر اکتفا کیا جائے اور بعض تو یہاں تک کہتے تھے کہ بے اُستاد طالب علم بے دین ہے جس نے شیطان کو اپنا رہنما بنالیا ہے۔ تاہم ایک طالب علم کی سند کے لیے معلّم کے پاس رہ کر علم حاصل کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ عام تھی کہ جو علم اجتماعی صورت میں حاصل کیا جاسکتا ہے وہ انفرادی یعنی گھر بیٹھ کر کتاب سے حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اُستاد / معلّم کو رہنما اور لیڈر کے طور پر لینا ضروری ہوتا تھا۔ علاوہ اس کے بہک جانے کا خدشہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات مشہور تھی جس کا کوئی اُستاد نہیں اس کا شیطان اُستاد ہے۔

کسی بھی سماج میں اُستاد کا مقام نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اُستاد دانش مندانہ روایات کی منتقلی اور تہذیب کے چراغوں کو روشن کرتا ہے۔ تعلیم کی جدت کاری اور تعمیر میں سب سے اہم کردار اُستاد کا ہوتا ہے۔ تعلیمی عمل میں اُستاد محور ہوتا ہے جس کے اردگرد تمام تعلیمی نظام گردش کرتا ہے ۔ اُستاد پیشہ تدریس میں ایک قائدانہ کردار کا حامل ہوتا ہے اسی لئے اس سے بہت سی توقعات بھی وابستہ کی جاتی ہیں کہ وہ تعلیمی اغراض و مقاصد پر کامل دسترس کا حامل و عامل ہو تاکہ ہر حال میں پیشہ کا تقدس برقرار رہ سکے۔ صرف کسی بھی پیشے کا انتخاب کر لینے اور اس کی تربیت کے حصول سے ایک قابل اُستاد کی تیاری ممکن نہیں ہے چند پسندیدہ شخصی اوصاف اور پیشہ وارانہ مہارت کے امتزاج سے ایک موثر اور کامیاب اُستاد کو تیار کیا جا سکتا ہے۔ اُستاد اپنا بیشتر وقت طلبہ کی قربت میں گزارتا ہے جس کے نتیجے میں اساتذہ کے رویے، حرکات و سکنات، پسند و ناپسند اور برتاؤ کا طلبہ پر گہرا اثر پڑتا ہے ۔ اپنے دوستانہ برتاؤ، صبر ،خاموش مزاجی

کے ذریعے اُستاد کمرۂ جماعت میں ایک اچھی جذباتی فضاء ہموار کرتا ہے۔ قائدانہ صلاحیتوں کی بناپر اس دنیا میں عظمت کی جتنی داستانیں ملتی ہیں، وہ ایک اُستاد ہی کی بدولت وجود میں آتی ہیں۔ عظیم لوگ اُستاد کی ہی عظمت کا نتیجہ ہیں۔ کسی نے اگر خاک سے اٹھ کر آسمان کی بلندیوں پر پرواز کی ہے، تو یہ ایک اُستاد کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی سے ہی ممکن ہوا ہے۔ کوئی بھی قوم اور معاشرہ تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ بلا شبہ اُستاد ہی قوم کے معمار ہیں اور وہی ہیں جو قوم کی ترقی میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

منصوبی طریقہ تدریس

بڑے لوگوں کا قرینہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں آگے بڑھنے کے لئے منصوبہ بندی کو ایک اہم جز کے طور پر شامل کرتے ہیں بالکل اسی طرح تدریس کو موثر بنانے کے لیے بھی ایک معلّم کا منصوبہ بندی کرنا بہت اہم ہے۔ تدریسی منصوبہ بندی ہی دراصل وہ بنیاد ہے جو ایک معلّم میں موجود قائدانہ صلاحیتوں کو ظاہر کرتی ہے۔ جس طرح کوئی قائد اپنے نقش قدم پر چلنے والوں کے لیے بہترین منصوبہ بندی کے ذریعے راہ ہموار کرتا ہے اسی طرح ایک اُستاد اپنے طلبہ کے لئے اعلیٰ ترین منصوبہ بندی کے تحت تدریس کو آسان اور دلچسپ بناتا ہے۔ نصاب، مدرسہ کا ماحول، ہم نصابی سرگرمیاں اور ادارہ کے قواعد و ضوابط دراصل طالب علم کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی منصوبہ بندی کا حصہ ہی ہوتی ہیں۔

ماہرین تعلیم کی نظر میں ایک کامیاب اُستاد موثر درس و تدریس کے لئے سازگار اکتسابی فضاء ہموار کرتا ہے۔ تدریسی افعال کو سہل اور دلکش بنانے کے لئے ماہرین تعلیم اور تجربہ کار اساتذہ نے اپنے تجربات کی روشنی میں چند ایسے تدریسی اصولوں اور مہارتوں کو وضع کیا ہے جو کمرۂ جماعت کے ماحول کو بہتر بنانے میں سود مند ثابت ہوئے ہیں۔ تدریسی اصول اور طریقہ کار کا ایک اہم جزو سبق کی منصوبہ بندی بھی ہوتی ہے۔ در حقیقت سبق کی ذہنی منصوبہ بندی کافی نہیں ہے بلکہ منصوبے کو ذہن سے صفحہ ء قرطاس پر منتقل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ تحریری منصوبہ بندی کا مقصد متعین تدریسی اہداف کا حصول ہوتا ہے۔ متعدد ماہرین تعلیم نے سبق کی منصوبہ بندی کے مختلف اصول وپیمانے وضع کئے ہیں لیکن تقریباً ماہرین تعلیم اس بات سے متفق ہیں کہ سبق کی موثر منصوبہ بندی یوں کی جاسکتی ہے:

i سبق کی منصوبہ بندی کا خاکہ

ii مقاصد تدریس

iii ذہنی آمادگی

iv بلند خوانی

v تفہیمی سوالات

vi نئے الفاظ و معنی کا تعارف

vii سرگرمیاں

viii سبق کا خلاصہ

ix تفویضی کام (ہوم ورک) ضروری ہیں

سبق کی تدریس سے پہلے سبق سے وابستہ مقاصد کا تعین کر لینا ضروری ہوتا ہے اور معلّم کو اس بات کا علم ہونا ضروری ہے کہ وہ سبق کی تدریس کے ذریعے طلباء میں کن صلاحیتوں کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ سبق کی موثر منصوبہ بندی میں ترغیب و تحریک اہم تصور کی جاتی ہے جس کے ذریعے اُستاد سبق کے آغاز پر اپنے سوالات اور تجربات کی روشنی میں طلبہ کے ذہنوں کو تیار کرتے ہوئے درس و تدریس کے کام کو مزید دلچسپ بنا دیتا ہے۔ سبق شروع کرنے سے پہلے طلبہ سے موضوع سے متعلق دلچسپ سوالات کرنے سے طلبہ درس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اسباق کی منصوبہ بندی کرنے سے تدریس نہایت ہی آسان ہو جاتی ہے۔

معلّم بطور دوست

انسان اپنی تمام تر زندگی ہمدردی، احساس اور مروت و محبت کے سایہ میں گزارنا چاہتا ہے لیکن بہت سے انسان جو ان احساسات کا تقاضا تو کرتے ہیں مگر خود ان میں ان تمام لطیف جذبات و احساسات کا فقدان ہے۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہم وقت کے دائرے میں تیرتے ہوئے لوگ، اپنے آس پاس کے ماحول کو دوستانہ بنانے پر مُصر ہیں۔ ایک بچہ اپنے گھر کے ماحول میں، ایک طالب علم اپنی درس گاہ میں اور ایک ورکر اپنی کام کرنے والی جگہ پر دوستی تلاش کرتا پھرتا ہے اگر اسے وہاں دوست مل جائے تو وہ پُر سکون رہتے ہوئے اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے نہیں تو مایوس ہو کر واپسی کی راہ لے لیتا ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ اگر انسان اپنے ماحول میں دوستی کو پا لیتا ہے تو اس کے آگے بڑھنے، پروان چڑھنے اور پھلنے پھولنے کے امکانات پہلے سے کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔

اگر معاشرے کی فلاح و بہبود، جذبۂ انسانیت کی نشو و نما اور افراد کی تربیت سازی کی بات کی جائے تو یہ بھی اُستاد ہی کی بدولت ہے اور اسی وجہ سے اُستاد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، وہ اپنے شاگردوں کی تربیت

میں اس طرح مگن رہتا ہے، جیسے ایک باغبان اپنے پیڑ، پودوں کی نگہداشت میں۔ تدریس وہ پیشہ ہے، جسے صرف دینِ اسلام ہی میں نہیں، دنیا کے ہر مہذب معاشرے میں نمایاں مقام حاصل ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیائے علم میں اُستاد کی اصل قدر و منزلت جس طرح اسلام میں اجاگر کی گئی، کسی اور مذہب میں نہیں۔

اللہ ربّ العزّت نے قرآن پاک میں نبی اکرم ﷺ کی شان بحیثیت معلّم بھی بیان کی ہے۔ اُستاد کے ادب و احترام اور عظمت کے حوالے سے اکابرین کے بیان کردہ متعدد واقعات اِس بات کا ثبوت ہیں کہ اساتذہ کی عزّت اور ادب و آداب کے بغیر انسان کبھی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔ اُستاد اگر معلّم ہونے کے ساتھ ساتھ دوست بھی ہو تو درس و تدریس کے دوران ایک ایسا تعلیمی ماحول پیدا ہوتا ہے جو طلبہ کو اُستاد کے مزید قریب کر دیتا ہے اور سیکھنے سکھانے کا عمل بخوبی سرانجام پاتا ہے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ

اُردو ناول میں کئی جہات سے کام کیا جا چکا ہے جن میں کرداری مطالعے بھی شامل ہیں اور ناول میں سماجی مسائل و عوامل کی عکاسی کی جہات بھی موجود ہیں۔ اس حوالے سے منتخب کتب و دیگر ماخذات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ خاص طور پر اردو ناول کے کلیدی کرداروں کے حوالے سے کیے گئے کام پیش نظر رہے ہیں۔

x۔ تحقیقی طریقہ کار

تحقیق کا موضوع چار منتخب اردو ناولوں میں معلّم کے کردار کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ موضوع کی تکمیل کے لیے چاروں ناولوں میں معلّم کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے تحقیق کے مختلف طریقہ ہائے کار سے مدد لی گئی ہے جن میں تقابلی اور تجزیاتی طریق کار نمایاں ہیں۔ بنیادی مآخذ دستیاب ہیں۔ اور مقالہ نگار کو فراہم ہیں۔ تنقیدی کتب و دیگر مواد تک رسائی کے لیے تحقیقی مقالات و مضامین، خطوط اور علمی و ادبی رسائل و جرائد سے بھی مدد لی گئی ہے۔ انٹرنیٹ اور جدید ٹیکنالوجی کے وسائل بھی حسبِ ضرورت بروئے کار لائے گئے ہیں۔

ب: معلّم کے معانی و مفاہیم

معلم کی تعریف:

مقالہ میں آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ معلّم کی لغوی، مصنوعی و مرادی حیثیت کو واضح کرلیا جائے۔ لفظ ''معلّم'' عربی النسل لفظ ہے جو مذکر ہے مولوی سیّد احمد دہلوی'' معلّم ''کے یہ معنی مقرر کرتے ہیں:

''علم سکھانے والا، اخوند، اُستاد، ادیب، گرو، ہاٹک، پنڈت، ملّا، مولوی، ٹیچر، منشی، مدرس، میاں جی''(۵)

غور کریں تو مولوی سیّد احمد دہلوی کے مقرر کردہ معانی سے ایک بات عیاں ہوتی ہے کہ معلّم بہر حال روحانی پیشوا اور تہذیب باطن اور تربیت ظاہر کرنے والا ہی ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔ معلّم کو سکھانے کے معنی میں بیان کرنا اور سارے الفاظ جو سیّد احمد دہلوی نے استعمال کیے وہ معاشرے کو سدھارنے کے لیے اپنی اپنی جگہ فرائض انجام دے رہے ہیں۔ انہی کی طرح محمد عبد اللہ خان خویشگی نے معلّم کے معانی کو اپنی لغت ''فرہنگ عامرہ'' میں واضح کیا ہے وہ معلّم کے بارے میں اپنا موقف کچھ یوں اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''آگاہ کرنے والا، نقشین چیز، نقش کا کام کیا ہوا، آگاہ کیا ہوا، علامت، نشانی، جمع معالم، تعلیم دیا ہوا، سکھلایا ہوا، تعلیم دینے والا، سکھانے والا، جہاز کا ملاح جمع معلّمین''(۶)

عبد اللہ خویشگی کے معلّم، لام بہ تشدید اور لام بہ تشدید یا فتح الگ الگ معانی ترتیب دیے ہیں دوئم، لام بہ کسرہ و زیر، سکھانے والے کے معنوں میں جب کہ معلّم، لام بہ فتح بن تشدید نقش نگار کے معنوں میں ہر چند ان دونوں کا املا ایک جیسا ہے مگر معانی حرکات حروف کے سبب جدا اور مختلف ہیں۔ معلّم کے معانی و مفاہیم کو تمام اہل زبان نے بیان کیا ہے ان میں ایک مولوی سیّد تصدق حسین نے معلّم کے لفظ کو اسم فاعل حقیقی اور مجازی یا کنائیتاً معانی کے تناظر میں واضح کیا ہے۔ وہ اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

''معلّم: نقاشی کیا گیا، نقش دار
معلّم: سکھانے والا، اُستاد، اور کشتی کے ملاح اور جہاز کے ناخدا کو بھی معلّم کہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اس فن کا ماہر ہے۔

معلّم: سکھایا گیا، تعلیم دیا گیا ادب سکھایا گیا اور اکثر استعمال اس کا حیوانات میں ہوتا ہے جیسے سگ معلّم، طوطی معلّم وغیرہ

معلّم: علامت، نشانی۔" (۷)

مولوی تصدق نے معلّم کو اپنے خیالات کی مدد سے پرکھا ہے انھوں نے اسے پہلے سے سکھایا گیا اور تعلیم دیا گیا بتا کر اس بات کی وضاحت کی ہے کہ معلّمی درجے پر فائض ہونے والا فرد پہلے سے ہی سکھایا گیا ہوتا ہے۔ مذکورہ معانی تائید کرتے ہوئے وارث سرہندی لکھتے ہیں:

"۱۔ معلّم (ع) مذکر، علم سکھانے والا، اُستاد، مدرس، ادیب۔

۲۔ گرہ، ملاح

۳۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں وہ شخص جو حج وغیرہ میں لوگوں کو دعائیں پڑھاتا ہے۔" (۸)

وارث سرہندی نے معلّم کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ مکہ معظمہ میں حج کے دوران دعائیں پڑھانے والے کو بھی اس ضمن میں شامل کرتے ہیں۔ لالہ رام نرائن لال بھی نورالحسن نیّر کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ معلّم کے لیے درج ذیل معنی تشکیل دیتے ہیں:

"معلّم، اسم فاعل ہے تعلیم کا معنی سکھانے والا، تعلیم دینے والا اُستاد، کشتی کا ملاح، جہاز کا ناخدا" (۹)

ہندی زبان میں معلّم کے متبادل جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں ان میں پنڈت اور پاٹھک زیادہ اہم ہیں یہ الفاظ بھی معاشرے میں انسانیت کو درس دینے والے لوگوں کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ ان معانی کی توضیح کرتے ہوئے راجہ راجیو راؤ اصغر لکھتے ہیں:

"پاٹھک، پڑھانے والا، اوستاد، معلّم، مدرس پڑھنے والا، طالب علم، شاگرد، برہمنوں کا ایک لقب۔۔۔ پنڈت، عالم، فاضل، معلّم، ہادی ملت، عالموں کا ایک لقب" (۱۰)

مذکورہ آراء کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ معلّم کا تعلق تعلیم و تعلّم سے ہے جس کے لوازمات میں فاعل و مفعول کاغذ و قلم اور کتاب کا ہونا لازم ہے اسے کسی خاص دائرے میں قید نہیں کیا جا سکتا یہ معانی کے اعتبار سے متعدد طرفوں کا حامل ہے جس کا مقصد و مدعا دوسروں کو ایک خاص رنگ ڈھنگ پہ لانا ہوتا ہے

اسے صرف پڑھنے پڑھانے پر محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ای۔ ایل تھارن ڈائیک معلّم کو سکول کی تعلیم تک محدود کرتے نظر آتے ہیں لکھتے ہیں:

"Teacher: person who teaches, especially one who teaches in a school" (١١)

معلّم، تعلیم دینے کے علاوہ ہدایت دینے والا بھی ہوتا ہے اب غور کریں تو ہادی و راہنما کی صفات کا تناظر بہت وسیع بنتا ہے اس لفظ معلّم کے جتنے مترادفات سامنے آتے ہیں ان کا صفاتی مادہ دراصل راہنمائی کا ہی ہے، جو تہذیب باطن سے ترتیب ظاہر تک ہر مرحلہ ہر معاون و مددگا ثابت ہوتا ہے، وارث سرہندی نے اس کے مترادفات میں فارسی الاصل الفاظ کو ترجیح دی ہے، لکھتے ہیں:

"معلّم، دانش آموز، علم آموز، مدرس آموز گار، اُستاد، گروہ، آخوند، اتالیق"(١٢)

مذکورہ بالا تمام تر آرا سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اُستاد یا معلّم کا کردار کسی بھی تہذیب و ثقافت میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اُستاد ایک ماڈل کی صورت میں تہذیب و تربیت کرتا ہے۔ اچھے اُستاد ہی اچھی قوم پیدا کرتے ہیں۔ اُستاد کی عملی فضیلت، شخصیت، حسن و سلوک اور کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ تمام مذاہب عالم میں اور جملہ عوام میں اُستاد کی حیثیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے اُستاد کا ہمیشہ احترام کیا جاتا رہا ہے۔ معلّم کے معانی و مفاہیم کو سمجھنے کے لیے مختلف حوالوں سے بیان کیا جاسکتا ہے۔

فلسفے کے حوالے سے

ایک معلّم دراصل ایک شخص نہیں بلکہ اپنی ذات میں ایک فلسفہ ہے۔ معلّم کی شخصیت کی تکمیل اس کے علم سے نہیں بلکہ اس کے عمل کو بھی اپنے علم کے مطابق ڈھالنے سے ہوتی ہے۔ طلبہ اپنے اساتذہ کرام کے الفاظ اور کردار سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ ایک معلّم وہ ہنرور ہے جو کسی پیغام کو اپنے طلبہ کی سوچ کی گہرائی تک پہنچانے کے لیے نہ صرف نصاب بلکہ اس کی تہوں میں موجود فلسفہ کو آسان سے آسان ترین اور آفاقی اہمیت کی حامل مثالوں کو اپنے کلام کا حصہ بناتا ہے اور مختلف موضوعات پر فلسفیانہ مباحث کے ذریعے روشنی ڈالتا ہے۔ لفظ معلّم، حرکات حروف کے سبب چار معانی سے گزرا ہے۔ مذکورہ بالا اقتباسات املا کے یکساں اور معانی کے منفرد ہونے پر دال ہے۔ ایک بات طے شدہ ہے کہ یہ لفظ کلیتاً عربی نژاد ہے اور صوت و حرکات کے سبب معانی بدلتا ہے۔ لفظ معلّم کے کنایۃً معانی کے وضاحت کرتے ہوئے سیّد تصدق حسین "لغات کشوری (فارسی)" میں یوں لکھا ہے:

""معلّم اوّل، کنایہ ارسطو حکیم سے اس لیے کہ پہلے پہل اسی نے علم حکمت کو کتاب میں
لکھ کر شاگردوں کو پڑھایا۔ اور قبل اس کے حکماء شاگردوں کو زبانی تعلیم دیتے تھے۔
معلّم ثانی، ابو نصر فارابی اس لیے کہ کتب حکمت کو جو حکمائے سابق نے یونانی زبان میں
لکھا تھا، اس نے عربی زبان میں ان کا ترجمہ کر کے شاگردوں کو پڑھایا۔
معلّم ثالث، بو علی سینا" (۱۳)

حقیقی، لغوی اور مرادی معانی کی وضاحت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس لفظ کا مادہ دراصل سیکھنے، سکھانے سے ہی ترتیب پاتا ہے۔ بہر حال صیغہ معلّم میں سیکھنا یا سکھانا معانی کے طور پر شامل رہے گا۔ صفاتی اعتبار سے اس لفظ کے معانی کا سیاق و سباق بدلتا جائے گا۔ مولوی نورالحسن نیّر نے لفظ معلّم کی وضاحت "نوراللغات" میں درج ذیل تفصیل سے پیش کی ہے، وہ یوں لکھتے ہیں:

"۱۔ معلّم (ع) صفت، مذکر، اُستاد، علم سکھانے والا، مدرس مونث کے لیے معلّمہ
۲۔ ملاح، ۳۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں وہ شخص جو دعائیں پڑھاتا ہے، معلّم
الملکوت، مذکر شیطان جو پہلے فرشتوں کو تعلیم دیا کرتا تھا۔

غرور جس نے کیا مور دعتاب رہا
معلّم الملکوت آج تک خراب رہا (سحر)

اس معنی میں معلّم ملائک، معلّم ملائکہ بھی مستعمل ہے معلّم اول (ف): مذکر، حکیم،
ارسطو کا لقب، جس نے علم حکمت سب سے پہلے کتابت میں لاکر پڑھانا شروع کیا۔
۲۔ عمومی اصطلاح میں شیطان کو کہتے ہیں۔ معلّم ثانی (ف): مذکر، حکیم ابو نصر فارابی
کا لقب جس نے ارسطو کی کتب حکمت عربی میں ترجمہ کر کے تعلیم دی۔
۳۔ معلّم ثالث (ف): مذکر، حکیم بو علی سینا کا لقب، جس نے فارابی کے بعد سو (۱۰۰)
کتابوں کے قریب تصنیف کیں، معلّم گیری مونث بچوں کے پڑھانے کا پیشہ،
معلّمہ (ع) صفت، مونث استانی پڑھانے والی عورت، لڑکیوں کو تعلیم دینے والی،
معلّمی، مونث بچوں کو پڑھانے کا پیشہ۔" (۱۴)

تصدق حسین رضوی اور مولوی نورالحسن نیّر کی وضاحتوں میں بیشتر معانی مماثل و مشترک ہیں مگر معلّم کو بہ طور اسم فاعل نیّر نے زیادہ واضح کیا ہے ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ معلّم کے ساتھ جو ضروری معانی جڑے ہوئے ہیں ان کا تعلق کاغذ و قلم سے لازمی ہے بالخصوص کنایۃً جو معنی مراد ہوتے ہیں ان کا معانی

لکھت، تحریر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، نیرّ نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ تذکیر و تانیث کے آہنگ پہ اس لفظ کی فاعلی حالت کون سی بنتی ہے اور بہ اعتبار پیشہ اس کا کیا معنی ترتیب پاتا ہے۔ معلّم کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے مغربی فلاسفر روسو(Rousseau) کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے اس نے تعلیم، تعلّم، متعلّم اور معلّم کے بارے میں بڑی وضاحتیں پیش کی ہیں۔ اس نے قدیم فلاسفر کے افکار کی پیروی نہیں کی بلکہ جدید فطری تعلیم کا تصور پیش کیا۔ وہ فطرت اور آزادی کا خوگر تھا۔ تعلیم اور نظام تعلیم کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

”بچوں کے دیکھنے، سوچنے اور محسوس کرنے کے اپنے انداز ہوتے ہیں لہٰذا اس سے زیادہ احمقانہ کوئی اور بات نہیں کہ ان کے ذہن کو دبا کر ہم بالغ لوگ اپنی ذہنیت کو ان پر نافذ کر دیں۔“(۱۵)

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی عالم، گرو یا اُستاد کے لیے انتہائی ضروری ایک امر یہ ہے کہ وہ اپنے ہنر یا علم میں کامل ماہر ہو۔ عملی فضیلت اچھے معلّم کی بنیادی صفت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ معلّم اپنے مضمون پر خاصی دسترس رکھتا ہو۔ اس نے اس کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہو۔ اس کے تمام نکات اور باریکیوں سے واقف ہو۔ کسی علم کو محض پڑھ لینا کافی نہیں بلکہ اُستاد نے اس کی تعلیم اس طرح پائی ہو کہ وہ علم اس کی شخصیت کا حصہ بن چکا ہو۔ کہنے کو تو لوگ کہتے ہیں کہ ”آدمی وہ کچھ بھی کر سکتا ہے جسے وہ خود بھی نہ جانتا ہو“، لیکن صحیح تعلیمی نتائج حاصل کرنے کے لیے مضمون میں مہارت نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر تدریسی سعی لاحاصل اور محض تضیع اوقات ہو گی۔ معلّم کی مباحث میں ایک اور مغربی فلاسفر کوئن ٹینین بڑی اہمیت کا حامل ہے تعلیم کے بارے میں اس کے تصورات پوری دنیا میں مانے جاتے ہیں۔ بالخصوص اساتذہ یا معلّمین کے لیے جو اس نے نظریات پیش کیے وہ آج بھی قابل تقلید سمجھے جاتے ہیں۔ معلّم کی تعریف اور فرائض پر بات کرتے ہوئے جن خیالات کو قلم کی نوک پر لائے، ان کو عشرت حسین نے ”تعلیم اور مغربی مفکر“ میں یوں رقم کیا ہے:

”۱۔ معلّم کو اپنے پیشہ سے حقیقی دلچسپی ہو اور اپنے آپ کو اعلیٰ اخلاقی معیار کا ثابت کرے۔

۲۔ معلّم کی شخصیت باکردار ہو اور لوگوں کے لیے بطور نمونہ ہو۔

۳۔ اساتذہ کا یہ فرض ہے کہ وہ طلبا کے ساتھ والدین کی طرح مہربان اور شفیق ہوں۔

۴۔ اُستاد دوران تدریس طلبا کی نفسیات اور مزاج کا خاص لحاظ رکھے۔

۵۔ معلّم کا فرض ہے کہ اپنے انداز بیان میں الفاظ کی ادائیگی میں تلفظ کا خاص خیال رکھے۔

۶۔ اساتذہ کے لیے لازم ہے کہ وہ صرف ذہین اور محنتی بچوں کی طرف توجہ نہ دے بلکہ دوسرے بچوں کی طرف بھی خصوصی توجہ دے۔

۷۔ معلّم بہت جلد غصے میں نہ آئے اور اصلاح طلب خرابیوں سے چشم پوشی نہ کرے۔

۸۔ اُستاد کو ہر قسم کے تصنع سے پاک اور مستقل مزاج ہونا چاہیے۔

۹۔ بچوں کے سوالات کے جوابات نہایت سوچ سمجھ کر خوش دلی سے دے۔

۱۰۔ سوالات نہ کرنے والے بچوں میں سوالات کرنے کی صلاحیت کو بیدار کرے۔"(۱۶)

مذکورہ بالا افکار کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ معلّم کی ذمہ داریاں لامحدود ہیں۔ اُستاد بچے کے ضمن میں ایک ہادی و رہنما کے علاوہ ذہنی نشو و نما کا بھی ذمہ دار ہے اور بچے کی تربیت کے لیے ایک نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک اور مغربی مفکر لیتا پوزی مغربی مفکرین میں بہترین مفکر مانا جاتا ہے، نے اُستاد اور بچے کی بارے میں جو موقف اختیار کیا ہے اسے عشرت بصری نے اپنی تصنیف میں یوں لکھا ہے:

"بچہ ایک پودے کی مانند ہے، پودے سے تشبیہ دے کر نامیاتی نشو و نما کا تصور پیش کیا کہ بچہ ایک پودے کی طرح فطرت کے قوانین کے مطابق پروان چڑھتا ہے جس طرح ایک بیج سے پودا فطری طور پر نشو و نما پاتا ہے اور مالی صرف نگرانی کرتا ہے اور اس کی نشو و نما کے لیے بہتر مواقع فراہم کرتا ہے اسی طرح تعلیمی دنیا میں اساتذہ کا کردار بحیثیت رہنما ہو اور بچے خود متحرک ہوں، اس کے نزدیک اُستاد کی ذمہ داری بچے کی متوازن نشو و نما کرنا ہے۔"(۱۷)

مختلف ماہرین تعلیم نے تعلیم اور تعلم کے بارے میں اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ تعلیمی نظریات کی روشنی میں ہمیں طریقہ تدریس، اساتذہ اور طلبہ کے تعلقات، کلاس کے ماحول اور مدرسہ کے ماحول کے بارے میں جان کاری حاصل ہوتی ہے۔ مغربی مفکر جان ڈیوی نے دور حاضر کے مروجہ تعلیمی طریقے میں اُستاد کی حیثیت اور اس کے کردار پر بھی تنقید کی۔ اس کے خیال میں روایتی طریقے میں اُستاد کو ایسی

حیثیت دے دی گئی ہے کہ اس کا کام صرف نفس مضمون بولنے اور سنانے تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اس طرح طالب علم کو ثانوی حیثیت ملتی ہے۔ اور اس کی ساری تحریک اور سر گرمی اُستاد کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔

حقیقت پسند فلسفوں میں اُستاد کو روحانی باپ کے نام سے ہی حقیقی حیثیت دی گئی ہے یعنی وہ عقل کل اور تمام علوم کا منبع ہے۔ اس نظریے کے رد عمل کے طور پر روسو، پسنالوزی اور فوبل نے اُستاد کو محض ایک خاموش تماشائی بنا دیا کہ وہ باغبان کی طرح اس انتظار میں بیٹھا رہے کہ بچے کی فطری صلاحیتیں خود بہ خود کب ظاہر ہوتی ہیں۔ ڈیوی دونوں انتہا پسندانہ تصورات کے بین بین راستہ نکالتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اُستاد ایک اتھارٹی اور ڈرانے والی شخصیت نہیں ہے۔ جس طرح اسے روایتی تعلیم میں پیش کیا گیا ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ روسو کی بچے کو مرکز بنانے والی تعلیم کی طرح میں اسے بالکل ہی نظر انداز نہ کر دیا جائے بلکہ بچے کی تعلیم میں اس کا دل ضروری ہے کیونکہ وہی بچے کی سر گرمیوں کو ترتیب دیتا ہے اور وہی انہیں اعتدال پر قائم رکھتا ہے کیوں کہ وہ زیادہ معاشرتی تجربہ رکھتا ہے اور تربیت یافتہ بھی ہے اس لیے اس کا بڑا اہم کردار بچے کی سر گرمیوں کے لیے رہنمائی فراہم کرنا ہے۔ بچے کی نفسیاتی نشوونما، بچے کی انفرادی ضروریات اور دل چسپیوں اور سوسائٹی میں اس کے لیے کون کون سے تجربات عملی طور پر مفید ہو سکتے ہیں، ان کا مکمل علم ہونا چاہیے۔ وہ اسی کے مطابق تعلیمی تجربات کا انتخاب کر کے انھیں منطقی طور پر بچے کی ترقی پذیر صلاحیت کے مطابق ترتیب دیتا ہے بچہ جب بھی اپنے طور پر کوئی مشکل حل کرنے کے قابل نہیں ہوتا وہ اُستاد کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ہر ایک کے مفاد کے مطابق ان کے باہمی تعلقات پر بھی نظر رکھنی ہوتی ہے اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُستاد کی حیثیت محض خاموش تماشائی کی ہے۔ ڈیوی کے خیالات کو محمد عیسیٰ خان نے اپنی کتاب "تعلیمی فلسفہ اور تاریخ" میں اس طرح نقل کیا ہے:

"وہ (معلّم) تو تعلیمی سر گومیوں میں ایک مستعد حصہ دار ہے جو طلبا کے تجربات میں شامل ہوتا ہے اور مشکلات کے حل میں ان کی ہر ممکن رہنمائی کرتا ہے"(۱۸)

تعلیم و تعلم کے حوالے رابرٹ منارڈ ہیچنز امریکی فلسفی کے تصورات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ انسان کی فطری آزادی اور اخلاقیات پر زور دیتے ہیں۔ انھوں نے معلّم کی صفات کو اساتذہ کے فرائض کے مماثل قرار دیتے ہوئے درج ذیل امور پر زور دیا ہے ان امور کو عشرت بصری نے اپنی تصنیف "تعلیم اور مغربی مفکر" میں یوں نقل کیا ہے:

"۱۔ طلبا کی آزادانہ فطری ماحول میں تعلیم و تربیت کی جائے۔

۲۔ طلبا کی مضامین کے چناؤ میں پسند و ناپسند کا خاص خیال رکھا جائے۔

۳۔ طلبا معصوم ہوتے ہیں ان کے ساتھ سختی ہرگز نہ کی جائے۔

۴۔ طلبا کی طبعی عمروں کے مطابق ان کی مساوی ذہنی تربیت کی جائے۔

۵۔ طلبا کو آزادانہ فطری ماحول میں لطف اندوز ہونے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔"(۱۹)

ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی اُستاد کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے اُستاد کو مخلص، ملنسار اور نیک نہاد ہونا چاہیے ظریفانہ ذوق اور خوش مزاجی کا حامل ہونا چاہیے اس کے علاوہ بردبار، ہمدرد، منصف مزاج، بچوں کے دلوں کو جیت سکتا ہے، اُستاد کا دل ہر وقت اپنے طلبہ میں ہی مصروف رہتا ہے۔ ایک بہترین اُستاد صرف مدرسے میں ہی نہیں رہتا بلکہ وہ گھر جا کر بھی اپنے طلبہ کے لیے فکر مند رہتا ہے، وہ اپنے طلبہ میں رہ کر ہی مسرت محسوس کرتا ہے، اس کے دل میں اپنے تمام طلبہ کے لیے بے انتہا محبت ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک اعلیٰ درجے کے معلّم کی پہچان یہ ہے:

"اُستاد کی زندگی کے سرِ ورق پر "علم" نہیں لکھا ہوتا "محبت" کا عنوان ہوتا ہے۔ اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے۔ سماج جن خوبیوں کا حامل ہے، ان سے محبت ہوتی ہے، ان ننھی ننھی جانوں سے محبت ہوتی ہے جو آگے چل کر ان خوبیوں کا حامل بننے والی ہیں۔ ان میں جہاں تک اور جس اسلوب سے ان خوبیوں کی تکمیل کا سامان ہے، یہ اس میں مدد دیتا ہے، اسی کام میں اپنے دل کے لیے راحت اور اپنی روح کے لیے تسکین پاتا ہے۔"(۲۰)

فلسفہ اور نفسیات کی رو سے معلّم کی حیثیت پر مذکورہ بالا مفروضات سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی نفسی کیفیات کو بروقت راہنما مل جائے تو ایک عام آدمی، بہت جلد "انسان" کے درجے پر فائز ہو سکتا ہے۔ یعنی اس سارے عمل میں اُستاد / معلّم کو اساسی و بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اُستاد خود بلند پایہ علمی ذوق سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے شاگردوں میں بھی حصول علم کی لگن پیدا کرنے کے قابل ہوتا ہے، وہ طلبہ میں علم کی سچی محبت پیدا کرتا ہے تاکہ وہ اپنی تمام عمر سرمایہ علم میں اضافہ کرنے میں گزار دیں۔ یہ ذوق و شوق طلب تبھی پیدا ہو سکتا ہے جب اُستاد خود بحرِ علم کا شناور ہو اور ساتھ ہی اُستاد کی اپنے طلبہ سے محبت طلبہ کے سیکھنے کے عمل میں انتہائی مفید ثابت ہوتی ہے۔

مذہبیات کے حوالے سے:

مذاہب عالم میں اگر دیکھا جائے تو ایک اُستاد کی حیثیت مسلّمہ ہے۔ ہر مذہب نے اُستاد کا مقام اپنے اپنے انداز میں واضح کیا ہے۔ سکھ ازم میں مذہب کی تعلیم کا آغاز ہی گرو سے ہوتا ہے اور بابا گرونانک کے شاگردان کے افکار کو دنیا تک پھیلاتے ہیں۔ عیسائیت __ جو کہ تعداد کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔اس میں بھی اُستاد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہودیت، کنفیوشس ازم ،ہندو ازم، زرتشت، بدھ مت اور دیگر مذاہب بھی اُستاد کو نمایاں مرتبہ دیتے ہیں جبکہ اسلام نے اُستاد کو جس امتیازی مقام سے نوازا ہے وہ بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُستاد کے مقام کو بیان کرنے کے لیے فرمایا کہ اللہ تعالی نے مجھے معلّم بنا کر بھیجا ہے۔

مذاہب عالم میں بھی اُستاد کی حیثیت و اہمیت کو ہر عہد میں تسلیم کیا گیا ہے۔بطور ایک مذہب اسلام میں تعلیم، تعلّم ، علم ، معلّم، متعلّم کی حیثیت کے بارے میں چند حقائق پیش کرنا لازم ہیں۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں اسلامی تعلیم میں معلّم کا مقام نہایت بلند اور قابل رشک ہے۔ نبی ﷺ کے بعد فرزندان توحید کے لیے اس "روحانی باپ" سے بڑھ کر اور کوئی زیادہ اہم اور واجب التعظیم نہیں۔ جہاں والدین بچوں کی جسم و جان کا خیال رکھتے ہیں یہ ان کو قلب و روح کی غذا فراہم کرتا ہے وہاں اُستاد ان کے فکر و شعور کو جلا بخشتا ہے۔ یہ معلّم ہی ہے جو علم و آگہی کے سچے جذبے کے ساتھ اپنے طلبہ کی تعمیرِ سیرت میں مصروف رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ نے جو خود اعلیٰ پایہ کے مبلغ تھے معلّم کی اہمیت پر بے حد زور دیتے تھے۔ اسلام ایک نظام زندگی ہے اور ایک تہذیب و ثقافت ہے، نظریاتی طور پر زندگی گزارنے کا نام اسلام ہے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق انسان اشرف المخلوق ہے، انسانی زندگی کا مقصود صرف جسم و جبلت کے تقاضے پورے کرنا اور مادی خواہشات کی تکمیل کرنا نہیں ہے۔ انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ انسانی زندگی کا مقصود ہدایت الٰہی کی پیروی کرنا ہے۔ اس لیے سب سے پہلی ضرورت ہدایت الٰہی کا علم حاصل کرنا ہے۔ اس علم کی روشنی میں اپنے افکار و خیالات اور اعمال و کردار کی اصلاح کرنا ہے۔

اسلام کے نزدیک یہ حیات و ممات ، یہ مال و دولت، یہ ظاہری اور باطنی نعمتیں، یہ صلاحیتیں اور استعدادیں سب اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ انعامات ہیں۔ یہ زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری وسائل ہیں۔ مطلوب ان سب سے انسان کی فکری اور عملی آزمائش ہے ان وسائل کے صحیح یا غلط استعمال پر انسان کی کامیابی

یاناکامی کادرومدار ہے۔ یہ دنیا عمل کاگھر ہے۔ انسان یہاں اپنے اعمال کی فصل اگاتا ہے آخرت، دارالمکافات ہے کامیابی اور ناکامی کا پتہ وہاں جاکر معلوم ہوگا، جزا یا سزا کا فیصلہ وہاں ہوگا۔

دوسری اقوام کے نزدیک انسان کا مقصد بہتر زندگی گزارنا ہے۔ بہتر کے مفہوم میں مادی بہتری کا مفہوم نمایاں ہے۔ ان کی جدوجہد کو مقصود مادی سہولتیں اور آسائشیں فراہم کرنا ہے۔ تعلیم ان کے نزدیک عیش و آرام کی زندگی گزارنے کا وسیلہ ہے۔ تعلیم ایک قسم کا کاروبار ہے۔ جس میں محنت، دولت اور وقت اس لیے صرف کیے جاتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں بیش از بیش مادی فوائد اور آسائشیں حاصل ہوں اور زندگی بڑے مزے سے گزرے۔ اسلام کے نزدیک تعلیم ذریعہ روزگار نہیں، یہ مقصد حیات معلوم کرنے کا ذریعہ ہے۔ تعلیم سے ہدایت الہٰی کا علم حاصل ہوتا ہے۔ تعلیم سے انسان خلافت ارضی کے فرائض، تقاضوں اور ذمہ داریوں سے واقف ہوتا ہے۔ تعلیم انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے منصب پر فائز کرتی ہے اور پھر انسان کو فرائضِ خلافت ادا کرنے کے قابل بناتی ہے۔ تعلیم اسلام کے نزدیک سب سے اعلیٰ عبادت ہے۔ تعلیم انسان کو حیوانیت کی پستی سے اٹھا کر انسانیت کی بلندی پر پہنچاتی ہے۔

فکر و نظر کے اس عظیم فرق کی وجہ سے اسلامی نظام تعلیم میں اُستاد اور شاگرد کے نقطہ نظر میں فکر و وہم میں طریقہ کار اور طرز عمل میں عظیم الشان فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں اُستاد اور شاگرد دونوں اخلاص اور للّٰہیت سے سرشار نظر آتے ہیں دونوں پر تقویٰ اور پرہیز گاری کی فضا طاری نظر آتی ہے۔ قناعت، توکل و استغنا کا ماحول نظر آتا ہے۔ لیکن دوسری طرف مغربی نظام تعلیم میں اُستاد اور شاگرد دونوں کا مطمع نظر منفعت اور اغراض پرستی ہوتا ہے، حصول زر کی تگ و دو سے بلند تر کسی تصور کا ان کے حاشیہ خیال میں گزر نہیں ہوتا۔ نہ وہاں محبت نہ وہاں خلوص ہوتا ہے۔ اسلام تعلیم کے بارے میں نہایت واضح انداز میں بتاتا ہے کہ تعلیم کا مقصد بہترین انسان بنانا ہے جو دوسرے انسانوں کا خیر خواہ ہو، انسان جب تک انسان کا دشمن رہے گا تب تک چاہے وہ جتنی مرضی سندیں حاصل کرلے وہ مسلم نظریہ حیات سے کوسوں دور ہی رہے گا۔ اسلامی نظریہ تعلیم میں فلاح انسانی کے لیے جو سبق ملتا ہے وہ کسی اور نظام میں نہیں نظر آتا۔ اسلامی نظریہ تعلیم انسان کو انسان کے قریب کرتا ہے اور محبت کا درس دیتا ہے۔ اس بارے میں جے کرشن مورتی نے یوں قلم فرسائی کی ہے:

> ”حصول علم کا صرف یہ مقصد ہے کہ ہم سائنس داں یا کتابوں پر فریفتہ عالم و فاضل یا کسی خاص علم کے ماہر بن جائیں تو دنیا کے لیے بربادی اور مصیبت پیدا کرنے میں ہمارا

حصہ ضرور رہے گا۔زندگی ایک اعلیٰ اور وسیع اہمیت رکھتی ہے ۔ اگر ہم اسے دریافت نہ کر سکیں تو ہماری تعلیم کس کام کی ؟ ہم اعلیٰ تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں، لیکن ہمارے خیالات اور جذبات میں کافی ترتیب و تناسب نہ ہو تو ہماری زندگی قطعی نامکمل ، مجموعہ متضاد اور طرح طرح کے خوف سے منتشر اور پریشان حال رہے گی۔ جب تک تعلیم سے کوئی مجموعی اور مسلم نظریہ حیات نہ پیدا ہو تو اس کے کوئی معنی نہیں۔"(۲۱)

اسلام کے نظام تعلیم میں دشواری کا عنصر موجود نہیں ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ مدارس کی اہمیت تو واضح ہے ہی لیکن اسلام کے ہاں سکھانے کا فلسفہ بہت وسیع ہے۔ کسی کے پاس کچھ الفاظ ہی کیوں نہ ہوں اسلام اسے ان الفاظ کے ابلاغ پر زور دیتا ہے۔ غزوہ بدر کے قیدیوں کی مثال سب کے سامنے ہے کہ وہاں سے پکڑ کر لائے جانے والے جنگی قیدیوں پر دس مسلمان بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کا فدیہ نافذ کرتے ہوئے ان کی رہائی کا راستہ بتایا گیا تھا۔ اسلام کے لحاظ سے سکھانے والے کے پاس علوم کا سمندر ہونا ضروری نہیں بلکہ سکھانے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ جو آپ کو آتا ہے اور اگلے بندے کو نہیں آتا وہی دوسرے کو سکھا دیا جائے۔ علم کی اہمیت کے بارے میں اسلام نے واضح ہدایات دی ہیں سب سے پہلے قرآن پاک کی روشنی میں ان حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی جارہی ہے جن میں مختلف حوالوں سے رہنمائی کی گئی ہے۔ چونکہ اسلام کا بنیادی اخذ قرآن و حدیث ہے قرآنِ کریم کے محبوب ترین موضوعات میں سے علم یا حصول علم ہے علم کی تلقین بڑے زوردار انداز میں کی گئی ہے۔ یہ مقام صرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ وہ سراسَر رحمت بن کر آیا۔ اس دنیا میں انسان نے اپنے سفر کا آغاز بھی علم ہی سے کیا۔ اس لئے حضرتِ آدمؑ کو اشرف المخلوق بنا کر سر بلندی اور سر فرازی عطا فرمائی۔ پروفیسر محمد اکرام قریشی قرآنِ پاک کی علمی حیات سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ اور تم کو وہ باتیں سکھا دیں جو تم کو پہلے معلوم نہ تھیں۔ (سورۃ نساء)
۲۔ ہم ان مثالوں کو لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں اور ان مثالوں کو بس علم والے ہی سمجھتے ہیں۔ (سورۃ عنکبوت)
۳۔ اللہ ان لوگوں کے درجے بلند کرے گا جو ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا۔ (سورۃ مجادلہ)
۴۔ آپ دعا کیجئے کہ پروردگار میرا علم اور زیادہ کر۔

۵۔ جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے ان کے لیے تو یہ کھلی آزمائش ہے اور ہماری نشانیوں سے سوائے ظالموں (جاہلوں) کے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ (عنکبوت)

۶۔ خدا سے وہی ڈرتے ہیں جنہیں علم بخشا گیا۔ (فاطر)

۷۔ اللہ شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ فرشتے بھی اس پر گواہ ہیں اور اہل علم کا بھی یہی کہنا ہے۔ (آل عمران)

۸۔ کیا علم والے اور جاہل برابر ہیں؟ (الزمر)

۹۔ کہہ دیجیے میرے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ بہترین گواہ ہیں اور وہ جس کے پاس کتاب ہے۔ (سورۃ رعد)

۱۰۔ ہم نے ان کو کتاب دی اور اس کو علم کی بنا پر کھول کھول کر بیان کیا ہے۔

۱۱۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اظہار مدعا کے لیے صلاحیتیں بخشیں۔ (الرّحمٰن)

۱۲۔ بلکہ وہ کھلی کھلی آیات ہیں جو ان لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہیں جنہیں علم بخشا گیا ہے۔ (الاعراف)

۱۳۔ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے علم دیا گیا ہے۔

۱۴۔ خدا نے آدمؑ کو تمام اشیا کا علم دے دیا۔

۱۵۔ اور اہل علم نے ان سے کہا کہ تمہارے لئے خرابی ہو۔ اللہ کا عطا کردہ ثواب کہیں بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لایا اور نیکی پر کاربند رہا۔

۱۶۔ اگر تمہیں علم نہیں ہے تو اہل ذکر و علم سے پوچھ دیکھو۔

۱۷۔ رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی، اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو گویائی سکھائی۔ (الرّحمٰن)''[۲۲]

مذکورہ بالا تمام آیات قرآن میں علم، معلّم، متعلّم کے بارے میں وضاحتیں پیش کی گئی ہیں ان تینوں شعبوں کی اہمیت، افادیت کے بارے میں قرآن میں ذکر کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ علوم قرآن دنیا کے تمام علوم سے سربلند ہے۔ اور پائیدار ہے اور باقی رہنے والے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ علوم قرآن میں تشکیک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ کو جو علم، وحی کے ذریعے عطا کیا گیا تھا وہ بشکل قرآن آج ہمارے پاس موجود ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم انسانیت کے لیے وہ ضابطہ حیات ہے وہ دنیا کی تمام کتابوں سے ارفع واعلیٰ ہے یہ وہ سرچشمہ علم ہے جس سے انسان کو زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی ملتی ہے۔ جب

تک یہ کار خانۂ قدرت کا نظام جاری ہے تب تک یہ ضابطۂ حیات بھی راہنمائی کا فریضہ سر انجام دیتا رہے گا۔ آپ ﷺ نے اصحاب صفہؓ کو تعلیم دے کر پہلی درس گاہ کا قیام عمل میں لایا۔ اس سے پہلے مکہ میں حضرت ارقمؓ کے گھر کو درس گاہ کی شکل میں استعمال کیا۔ دار ارقم اور اصحاب صفہ کے معزز صحابہ اکرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین تبلیغ علم اور حصول علم کے لیے اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔ رسول پاک ﷺ نے ذاتی قول و عمل سے علم، معلّم اور تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ فضلیت علم اور حصول علم کے متعلق احادیث موجود ہیں جن میں آپ ﷺ نے حصول علم کی تاکید بھی فرمائی اور مسلمان مرد و زَن پر تحصیل علم کو لازم قرار دیا۔ پروفیسر محمد اکرام قریشی نے ان تمام احادیث کو بڑی محنت سے یکجا کیا ہے۔ اور وہ یہ ہیں:

۱۔ علم و حکمت کی باتوں کو ایک گھنٹہ سننا ایک ہزار شہیدوں کے جنازے میں شامل ہونے اور ایک ہزار راتوں کی عبادت سے زیادہ قابل تعریف ہے۔

۲۔ خالق دو عالم کی صناعی پر ایک گھنٹہ غور و خوض کرنا ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

۳۔ علم کی باتیں سننا اور دل میں تہہ نشین کرنا ایک سو غلاموں کو آزاد کرنے سے بہتر ہے۔

۴۔ عالم کے قلم کی سیاہی شہید کے خون سے زیادہ قابل ستائش ہے۔

۵۔ جو شخص علم کے بار میں بات چیت کرتا ہے گویا خداوند کریم کی حمد بیان کرتا ہے۔

۶۔ جو حصول علم کے لیے سعی کرتا ہے اللہ کی عبادت کرتا ہے۔

۷۔ جو علم کی اشاعت کرتا ہے وہ گویا زکوٰۃ دیتا ہے اور جو علم کا صحیح استعمال کرتا ہے وہ خدا کی پرستش کرتا ہے۔

۸۔ علم نیکی اور بدی میں تمیز کرنا سکھاتا ہے اور خدا تک پہنچنے کے لیے روشنی کا کام دیتا ہے۔

۹۔ علم صحرا میں ہمارا رفیق ہے اور تنہائی میں مونس ہے جو خوشی کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور مصیبت میں ہمت قائم رکھتا ہے۔

۱۰۔ جو تلاش علم کے لیے اپنا گھر بار چھوڑتا ہے وہ راہ خدا میں آگے قدم رکھتا ہے۔

۱۱۔ علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین جانا پڑے۔

۱۲۔ جو علم حاصل کرنے کی غرض سے سفر کرتا ہے خدا اس کو جنت کا راستہ دکھائے گا۔
۱۳۔ جو علم اور اہل علم کی قدر کرتا ہے خدا دوسری دنیا میں اچھا بدلہ دے گا۔
۱۴۔ جو عالم کی قدر کرتا ہے وہ میری قدر کرتا ہے۔
۱۵۔ جس نے ایک عالم کی قدر کی اس نے ستر سنیوں کی عزت کی اور جس نے ایک طالب علم کی توقیر کی اس نے شہیدوں کی توقیر کی۔ (مشکوٰۃ)
۱۶۔ علم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت پر فرض ہے۔
۱۷۔ طالب علم کے پاؤں تلے از راہ خوشنودی فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں۔
۱۸۔ دوستوں میں علم ہماری نجات کا باعث ہے اور دشمنوں کے خلاف ڈھال کا کام دیتا ہے۔
۱۹۔ علم ہی کے ذریعے انسان نیکی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچتا ہے۔
۲۰۔ ماں کی گود سے لے کر قبر تک علم حاصل کرو۔
۲۱۔ میں ﷺ علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کے دروازہ ہیں۔
۲۲۔ اہل علم کی بخشش کے لیے وہ فرشتے دعائیں مانگتے ہیں جو آسمان اور زمین کی پنہائیوں میں مقرر ہیں۔
۲۳۔ قیامت کے روز علما کی روشنائی کی قدر و منزلت وہی ہو گی جو خونِ شہدا کی ہے۔
۲۴۔ میری امت میں سے جس کسی نے چالیس حدیثیں یاد کر لیں وہ قیامت کے روز اللہ سے فقیہہ اور عالم کی حیثیت سے ملے گا۔
۲۵۔ اللہ نے ابراہیمؑ کی طرف وحی بھیجی کہ اے ابراہیم! میں علیم ہوں اور ہر عالم سے محبت رکھتا ہوں۔
۲۶۔ عالم زمین پر خدائے پاک کا امین ہے۔
۲۷۔ قیامت کے دن تین قسم کے حضرات کو شفاعت کا حق ہو گا۔ پہلے انبیاء کو پھر علما کو اور پھر شہدا کو۔ (ابن ماجہ)
۲۸۔ وہ لوگ جو علم حاصل کرتے ہیں مرتے نہیں۔
۲۹۔ علم سیکھنے کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ (ابو داؤد)

۳۰۔ مومن علم سے کبھی سیر نہیں ہوتا حتٰی کہ جنت میں پہنچ جاتا ہے۔
۳۱۔ عالم کو عابد پر ایسے ہی فصلیلت ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کو سب ستاروں پر۔ (مشکوۃ)
۳۲۔ عالم اور متعلّم دونوں امر ثواب میں برابر کے شریک ہیں۔ (مشکوۃ)
۳۳۔ جو علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلے وہ اللہ کی راہ (جہاد) میں ہے جب تک لوٹ نہ آئے (ابو داؤد)
۳۴۔ جس سے علم سیکھو اس کی عزت کرو۔ (ترمذی)
۳۵۔ اگر طالب علم کو علم کی تلاش میں موت آجائے تو وہ شہید ہے۔ (مشکوۃ)
۳۶۔ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء نے درہم و دینار نہیں علم کا ورثہ چھوڑا ہے۔ (مشکوۃ)''[۲۳]

درج بالا احادیث کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے نہ صرف فضیلت علم بیان کی ہے بلکہ علم دینے والے کی فضیلت واہمیت بھی بیان کی ہے۔ ان تعلیمات کے تحت مسلمانوں کے لیے حصول علم جزو ایمان بن گیا ہے اور تعلیم و تعلّم کو اپنے لیے باعث رحمت سمجھنے لگے۔ اسلام میں تعلیم کا مقصد انسان کو انفرادی اور اجتماعی ہر دو طریق سے راہ مستقیم پر لانا ہے۔ ایک مسلمان کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین یہ ہے کہ احکام خداوندی پر عمل کرتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کو اس طرح بروئے کار لائے کہ قوم وملت ترقی کے راستے پر گامزن ہو سکے۔ اب ضروری ہے کہ مسلم فلاسفر کے ہاں نظریہ تعلیم اور نظریہ معلّم کے حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی جائے اس ضمن میں مسلم فلاسفر میں کندی، فارابی، ابن سینا، سکویہ، غزالی، ابن ماجہ، ابن طوفیل، ابن رشد، ابن خلدون کے نظریات سے فرداً فرداً استفادہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تاہم سب سے پہلے نظریۂ الاہیات، نظریۂ نبوت، نظریۂ امامت کے حوالے سے بحث ضروری ہے لیکن بے جا طوالت کے خوف سے اس سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے اور براہِ راست ان فلاسفروں کے اذکار سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اخوان الصفا کے ہاں نظریۂ تعلیم تھا اس کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر یوسف شیدائی نے اس بارے میں اپنے خیالات کو ''مسلم فلسفہ'' میں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے وہ یوں لکھتے ہیں:

"تعلیم کے ضمن میں اخوان الصفا کا موقف یہ تھا کہ بچہ خداداد صلاحیتوں لے کر پیدا ہوتا ہے تعلیم محض ان صلاحیتوں کو ابھارتی ہے۔ بچہ چار برس کی عمر تک لاشعوری طور پر سماجی مؤثرات کو قبول کرتا ہے بعد ازاں وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کی تقلید کرتے ہوئے مختلف عادات واطوار، فنون ومشاغل اور نظریات وخصائص کی تحصیل کرتا ہے۔ عوام بالعموم برسر اقتدار طبقے کی نقالی کرتے ہیں۔ بچے والدین اور اساتذہ ۔۔۔ اہم تعلیم کے مقاصد اس وقت تک حاصل نہیں کیا جاسکتے جب تک معلّم اور متعلّم میں محبت اور موانست کا گہرا تعلق موجود نہ ہو۔"(۲۴)

امام غزالی مسلم فلاسفروں میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ علم، معلّم، متعلّم کے بارے میں ان کے نظریات خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے مطابق ہر عہد میں معلّمین کا خاص گروہ مقرر ہونا چاہیے جو علم کے پودے کی آبیاری کرنے اور چراغ علم سے تاریکیوں کو منور کرتا ہوا آگے بڑھے ،اگر تعلیم کے لیے مخصوص علما یعنی اساتذہ کو تیار نہیں کیا جائے گا تو ہر طرف تاریکی کا پہرہ ہو گا اور قوم ہر حوالے سے پیچھے رہ جائے گی۔ امام غزالی اُستاد کی طبعی صفات بتاتے ہوئے جن خیالات کو اظہار کیا ہے انھیں اکرام قریشی یوں نقل کرتے ہیں:

"عالم کو بردبار، حلیم الطبع اور صاحب وقار ہونا چاہیے۔ تمسخر اور مزاح سے بچنا چاہیے جو بات معلوم نہ ہو، اس کے اظہار میں شرم نہ چاہیے اور باعمل ہونا چاہیے۔ کیوں کہ بلا عمل دوسروں پر کوئی خاطر خواہ اثر نہیں پڑ سکتا۔"(۲۵)

علما و معلّمین کی صحبت اور شاگردی نہ اختیار کرنے والے کے بارے یہ تصور کیا جاتا تھا کہ جب کوئی طالب علم بنامعلّم کے علم کی سعی کرتا ہے تو اس سے علم و موضوع کے سمجھنے اور تشریح و توضیح و تفہیم میں غلطی ہو سکتی ہے۔ تاہم یہ عام تھا کہ عالم سے ایک درجہ غلطی کا امکان ہوتا ہے اور ایک عام شخص سے سو درجہ غلطی کا امکان ہوتا ہے۔ معلّم کی ضرورت طالب علم کے لیے کتابوں کی دستیابی سے بھی لازم سمجھی جاتی تھی۔ اُستاد کی ضرورت کا اظہار حضرت مصعب بن عمیرؓ، حضرت امام تہافی اور اخوان الصفانے ان الفاظ میں کیا ہے:

" لوگوں نے جو کچھ سیکھا ہے اس میں سے بہترین بات منہ سے نکالتے ہیں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس میں سے بہترین چیز سیکھ لیتے ہیں اور جو کچھ سنا ہے اس میں سے بہترین بات لکھ لیتے ہیں لہٰذا اگر تمھیں علم کی تلاش ہے تو اسے کسی کے ہونٹوں سے حاصل کرو اور اس طرح تمھیں چیدہ اور برگزیدہ علم حاصل ہو گا۔"(۲۶)

تاہم جو شخص کتابوں سے علم حاصل کرتا ہے اسے وہ امتیاز حاصل نہ ہو گا جس کی اسے ضرورت ہے۔ اس لیے ہر طالب علم کے لیے ایک اُستاد / معلّم کی ضرورت ہے جو حصول علم، تعمیر سیرت اور اس کے عقائد و اعمال میں رہنمائی کا کام دے۔ مسلم نظام تعلیم میں علم کا تعلق عمل سے ہے۔ علماء علم و عمل کا گہرا تعلق بیان کرتے تھے۔ نبی ﷺ کی حدیث کا مفہوم ہے جس میں آپ ﷺ نے ایسے علم سے پناہ مانگی ہے جو نفع نہ دے۔ تاہم اسلام میں عمل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تعلیم، تعلّم کے لیے معلّم کی شرط کو کچھ اس لیے بھی لازم قرار دیا ہے۔ چوں کہ اُستاد محض معلومات کو طالب علموں تک نہیں پہنچاتا بلکہ طالب علموں کی تربیت، سوچ اور عمل پر بھی گہرا اثر ڈالتا ہے۔ اسی لیے اہل علم اور علماء و معلّمین کے ہاں ہر یہ مقولہ مشہور ہے کہ بے عمل معلّم کی بات بے اثر ہوتی ہے۔ اُستاد / معلّم پہلے علم پر خود عمل پیرا ہوتا ہے اور پھر طالب علموں کو ایک نمونے کے طور پر اپنا کردار پیش کرتا ہے۔ تاہم اُستاد معاشرت میں بھی ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اُستاد ایک بڑی معاشرتی قوت ہے۔ وہ اپنے افکار و اعمال کی بدولت معاشرے میں تغیّر لاتا ہے۔ وہ اذہان میں تبدیلی لا کر تاریخ کے دھاروں کا رخ بدل دیتا ہے۔ اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ دنیا کے بڑے بڑے سیاسی انقلاب اور اصلاحی تحریکیں اساتذہ ہی کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ وہ یونان کا عروج ہو یا انقلاب فرانس، اصلاح کلیسا کی تحریک ہو یا عربوں کی کایاپلٹ یہ سب اُستاد ہی کے مرہون منت تھے۔ عہد جہالت میں عربوں کی جو حالت تھی اس سے کون آگاہ نہیں۔ لیکن معلّم اعظم حضرت محمد ﷺ کی تعلیم نے ان کو فرش سے اٹھا کر عرش کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ جو پہلے جاہل شتر بانوں سے زیادہ کچھ نہ تھے ساری دنیا کے اُستاد اور تاریکیوں میں بھٹکنے والی قوموں کے رہنما بن گئے۔ اس سے بڑھ کر اُستاد کا اعجاز اور کیا ہو سکتا ہے۔ مصطفیٰ علی خاں اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "اُستاد افراد و قوم کی تشکیل سیرت کرتا ہے۔ ثقافت کا تحفظ اور آئندہ نسلوں تک
> اس کی منتقلی کا فرض ادا کرتا ہے۔ معاشرے میں اصلاحِ احوال کا باعث بنتا ہے اور
> قوموں کی کایاپلٹ کرتا ہے۔"(۲۷)

اُستاد کی کئی ایک جہات ہیں مختلف شعبہ ہائے علم میں اس کی اہمیت و حیثیت الگ الگ ہے بطور خاص فلسفہ اسلام میں معلّم کو داعی و مربی کی حیثیت حاصل ہے وہ اسلامی تہذیب کا پیامبر ہوتا ہے اور پورے تعلیمی عمل کا مرکز و محور ہوتا ہے۔ وہ صرف ماہر تعلیم نہیں بلکہ وہ اصلاح کار اور وارث پیغمبر ہوتا ہے۔ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی اخلاقی تربیت کرتا ہے الہامی ہدایات سے محروم فکر و نظر پر تنقید کا سلیقہ بھی سکھاتا ہے

متعدد صفات کے ساتھ ساتھ وہ بہ حیثیت قائد بہت معتبر ہوتا ہے۔ جب ایک معلم قائد کا روپ دھارتا ہے تو اس کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے طالب علموں کی بھرپور انداز میں قیادت کرے۔ چونکہ متعلقہ نظریات اور علوم کی چھان پھٹک کر کے اپنے طالب علموں میں وہ صلاحیت پیدا کرے جو کہ انہیں اعلیٰ انسان اور اعلیٰ علوم سے روشناس بھی کروائیں اور ان پر عمل کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو۔

اُستاد کو قائدانہ صلاحیتوں کو حامل ہونا چاہیے، اور اسی طریق کو مسلمان مفکرین نے اپنایا۔ امام غزالیؒ جہاں علم التعلیم کے فلسفی ہیں وہاں ایک اچھے معلّم بھی ہیں۔ ان کا نام دنیائے علم میں بڑا روشن ہے۔ ان کا تعلق ایران کے علاقے "طوس" سے تھا۔ انھوں نے علم اور متعلّم کے حوالے سے کئی پہلوؤں سے کام کیا ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد انسانی کردار کی نشوونما اسلامی خطوط و احکامات پر ہو اور اس کی مدد سے انسان کو آخرت کی تیاری میں مدد ملے۔ کیوں کہ اسلام کا مقصد اس دنیا کی زندگی کی حقیقت دراصل آخرت ہی کی تیاری ہے چنانچہ امام الفارابی نے عمل تدریس کو بھی اسی زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ ان کے نزدیک تدریس کے دوران میں اُستاد کو طالب علم کی نفسیات کے مطابق اپنے تدریسی معاملات انجام دینے چاہئیں۔ اسی طرح اسلام کے تعلیمی نظام کے ایک بڑے فلسفی و معلّم ابن طفیل بھی سرفہرست ہیں ان کے نزدیک حصول سعادت و علم کے لیے ضروری ہے کہ انسان اللہ کی ہستی کے بارے میں سوچ بچار کرے چنانچہ اُستاد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دوران تدریس طلبہ کو اس قسم کے موضوعات پر سوچ بچار کرنے کی دعوت دے۔ تدریس کی حکمت عملی کے ضمن میں ابن خلدون کا نام بہت معروف اور مستند ہے۔ ان کے نزدیک تدریس کے تین مراحل ہیں۔ جمالی طریقہ، تفصیل کا مرحلہ اس میں زیر بحث موضوع کی تفصیلات کا مرحلہ، آخری مرحلہ، جمالی طریقہ میں طالب علم کو مطالعاتی یا تدریسی مواد کی موٹی موٹی اور اہم باتوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ اس مرحلے پر چیز کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس مرحلے پر تفصیل میں جانے سے گریز کریں گے۔ دوسرا تفصیل کا مرحلہ اس میں زیر بحث موضوع کی تفصیلات پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی جاتی ہے اور ہر چیز کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے۔ آخری مرحلہ میں زیر بحث موضوع پر ایک اور تنقید اس لحاظ سے ڈالی جاتی ہے کہ اس کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہ جائے جس پر بات چیت نہ کی گئی ہو۔ شاہ ولی اللہؒ برصغیر کے ایک معتبر شخصیت تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی پستی، علم سے دوری کے لیے خاص کام کیا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے مسلمان کے لیے بیش بہا تعلیمی و سیاسی خدمات کو سرانجام دیا۔ ان کے نزدیک تدریس کے دوران میں اُستاد کو طالب علم کی ہمہ جہت اور متوازن نشوونما کا خیال رکھنا چاہیے۔ وہ ہر بات میں نفاست اور لطافت کو تلاش کرتے تھے۔ وہ

تدریس میں بھی طالب علم میں اس خصوصیت کو پروان چڑھانے کے حق میں ہیں۔ وہ تدریس حکمت تعلّمی کے حوالے سے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اُستاد مشکل تصورات کی تشریح طلبہ کے سامنے پیش کرے اور مختلف مثالوں کی مدد سے پڑھائے اس مقصد کے لیے وہ انتہائی سادہ اور عام فہم زبان استعمال کرنے کے حق میں ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ کے بعد برصغیر میں اگر کوئی علمی و سیاسی قدر آور شخصیت پیدا ہوئی تو سر سید احمد خاں تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی سیاسی و تعلیمی ترقی کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان عیش و آرام میں مبتلا تھا علم و مدرسے سے دوری اختیار کر چکے تھے۔ علم و تعلیم کی عدم موجودگی کے سبب انگریز اپنی علمی اور جدید ٹیکنالوجی سے مسلمانوں کی حکومت ختم کرنے میں کامیاب ہوئے اور اپنی حکمرانی کا سکہ عام کیا۔ اس دور میں مسلمان انگریز کے خلاف ہتھیار سے آزادی چاہتے تھے مگر سر سید احمد خان وہ شخصیت تھے جنھوں نے موقع کی باریک بینی سے جائزہ لیا اور مسلمانوں کو اصل حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ ان کا مقابلہ ہتھیار سے نہیں بلکہ علمی حیثیت سے کیا جائے اور مسلمانوں کا قدیم اور روایتی نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کو تبدیل کیا اور جدید علوم کو دخل دیا۔ ان کے نزدیک تدریسی عمل میں اُستاد کو طالب علم کی تمام تر سلاحیتوں سے واقف ہونا چاہیے وہ تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کو پستی سے نکالنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم کو زندگی کے لیے مفید ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک اُستاد کو تدریس کے دوران ایک صحیح اور مخلص نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ تاکہ طلبہ اس سے متاثر ہو سکیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اُستاد کو اپنے مضمون پر مکمل عبور حاصل ہونا چاہیے تاکہ وہ طلبہ کو ہر لحاظ سے مطمئن کر سکے۔

علم التعلیم کے حوالے سے

انسان اپنی پہلی سانس کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ما قبل پیدائش سے سیکھنے کے عمل میں مبتلا رہتا ہے۔ یقین محکم تک کا سفر انسان کو بلندیوں تک لے جاتا ہے لیکن اس بلندی تک رسائی کے دوران انسان کا واسطہ مختلف کرداروں سے پڑتا ہے۔ بے قاعدہ سے باقاعدہ تعلیم یا ہنر تک کی پہنچ میں انسان کا تعلق نصاب، تدریس، تعلم اور معاشرت کے علاوہ معلّم سے بنتا ہے۔ درج بالا اجزائے تعلیم کو متعلم کے لیے مربوط کرتے ہوئے نظام تعلیم ترتیب دیا جاتا ہے تاکہ سیکھنے کا عمل تعطل کا شکار نہ ہو۔ اس سارے عمل میں معلّم وہ ہستی ہے جو عمل تعلیم میں موجود تمام تر عناصر کو متعلم کے لیے ہموار کرتا ہے اور ایک طالب علم کی نفسیات کو پرکھتے ہوئے اس کے لیے موثر تدریس کے مختلف طریقہ ہائے تدریس اپناتا ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ معلّم کے سامنے ہمیشہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نصب العین ہونا چاہیے۔ حمد و ثنا کے بعد تدریس کی ابتدا کی

جائے۔ معلّم کا مجموعی اسلوب بیان صاف، شائستہ اور باوقار ہو۔ خیر خواہی اور اچھا طرز کلام اس کی شخصیت کا بنیادی وصف ہو۔ معلّم کی گفتگو اچھے ادبی الفاظ و تراکیب کی حامل ہو لیکن محض خوبصورت جملے بے معنی ہوں گے۔ اگر معلّم کی شخصیت میں اخلاص، انکسار اور اخلاقی علوم نہ ہو۔ کامیاب اور مؤثر تدریس کے لیے علم و عمل کا امتزاج اور قول و فعل میں مطابقت ضروری ہے۔

معلّم کے لیے ضروری ہے کہ اس کا دماغ معلومات سے پر ہو، قلب درد مند ہو اور اس میں سیرت و کردار کی قوت بھی ہو۔ مؤثر ابلاغ کے لیے فطرت انسانی کے اہم تقاضوں کو ملحوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ ان تقاضوں کی بہتر تفہیم قرآن کے متعین کردہ تین خطوط نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کی روشنی میں ہی ہو سکتی ہے معلّم کو دینی امور میں سمجھ بوجھ ہو اور نیک نیتی اس کا تدریسی وصف ہو۔ اُستاد کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ نیکی کی طرف دعوت دینے والے اُستاد کو دعوت کے ثواب کے ساتھ ساتھ اس کے شاگردوں کے اجر کے برابر بھی اجر ملے گا جس نے اس نیک کام کی پیروی کی اور جس اُستاد نے گمراہی کی طرف دعوت دی تو اس کو گناہ کی طرف دعوت دینے کے گناہ کے ساتھ ساتھ اس طالب علم کے گناہ کے برابر گناہ بھی ملے گا۔ تعلیم و تدریس کے دوران میں اگر کوئی خلاف شرع بات کی جائے تو معلّم کو اس بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار دوران تدریس کرنا چاہیے تاکہ شاگردوں پر اس کی اصل حقیقت واضح ہو جائے گی۔

طالب علموں کی تعلیم و تربیت میں اسلامی خطوط پر مختلف طریقوں سے کام لینا باعث ثواب ہے اور ان کو الحاد کے بھنور میں دھکیلنے کے لیے مختلف حربوں سے کام لینا باعث ذلت و عتاب ہے۔ اچھا اُستاد ذوق مطالعہ و تحقیق رکھتا ہے پوری زندگی طالب علم رہتا ہے اور ہمیشہ حصول علم کا شائق ہوتا ہے۔ اس ضمن میں روحانی فیض اور تحرک کا اصل سرچشمہ قرآن و سنت کو تسلیم کرتا ہے اور اسی سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ معلّم اور متعلّم دونوں قابل احترام ہیں۔ یعنی معلّم کو متعلّم اور متعلّم کو معلّم کا احترام کرنا چاہیے۔ معلّم کی تربیت کی خاطر اگر سختی بھی کرے تو اسے جذبہ رحمت کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ معلّم کو اس تدریسی اصول کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ معلّم اور متعلّم کے درمیان باہمی احترام کی فضا بحال کیے بغیر تعلیم اور خوش گوار تعلیمی ماحول ممکن نہیں۔ ایک دینی جذبہ رکھنے والا دین دار اور دعوت دین کے لیے متحرک شاگرد معلّم کے لیے بہترین سرمایہ آخرت ہے۔ اس لیے اُستاد کا یہ فرض ہے کہ وہ طلبہ میں متعلقہ مضمون میں مہارت کے ساتھ ساتھ انھیں دعوت دین کے لیے بھی تیار کرے اور اسی نقطہ نظر سے ان کی تربیت کرے۔ وہ یہ بات پیش نظر رکھے کہ وہ حقیقت میں باقی تمام افراد کی نسبت سب سے زیادہ جواب دہ ہے۔ اس سے اس کے طلبہ کے طرز فکر اور

طرزِ عمل کے بارے میں بھی باز پرس ہو گی۔ اُستاد کا لباس سادہ، حیادار اور صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ اُستاد کی ظاہری شخصیت کا پہلو تدریس کو مؤثر یا غیر مؤثر بنا سکتا ہے۔

اُستاد کو اگر کسی مسئلے کے بارے میں علم نہ ہو تو وہ اس مسئلے کے بارے میں اس کو ایسے اُستاد کے پاس بھیجے جسے اس سوال کا بہتر جواب معلوم ہو۔ یہی صاحب علم اساتذہ کا طریقہ ہوتا ہے اور یہ ثواب کا کام ہے۔ جس اُستاد کو کسی سوال کا جواب نہ آئے اور بغیر جانے جواب دینے کی کوشش کرے تو وہ در حقیقت جاہل ہے اور وہ اس لیے کہ ایک طرف وہ غلط جواب دینے کے لے جواب دہ ہے اور دوسری طرف اس کے غلط جواب سے طلبہ کے عمل کرنے کے لیے۔ سوال اٹھانا اور سوالات کا خیر مقدم کرنا بھی منصب معلّم کا لازمہ ہے لیکن لایعنی سوالات سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔ بہر حال سوالات اور دیگر تعلیمی امور کے بارے میں طلبہ کی عزت نفس مجروح کرنا اور ان کی تضحیک کرنا" تدریسی گناہ" کے مترادف ہے۔ معلّم کو بعض اہم مسائل بار بار دہرانا چاہئیں، تاکہ وہ شاگردوں کے اچھی ذہن نشین ہو جائیں۔ بہر حال اس تکرار کے طریق میں اُستاد کو ایک ہی مسئلے کو بار بار بیان کرنے میں مختلف الفاظ، تراکیب اور دل چسپ اسالیب کو پیش نظر رکھنا چاہیے تاکہ طلبا بوریت یا بیزاری کا شکار نہ ہوں۔

اُستاد / معلّم کو تشکیک سے بچنا چاہیے۔ اس کے برعکس اپنے تدریسی اسلوب میں تاکیدی اور یقینی اندازِ بیان اختیار کرنا چاہیے نیز مضمون کی وضاحت اور تاثیر کے لیے مثالوں، اشارات، عمدہ استعاروں اور تدریسی معاونات سے کام لینا چاہیے۔ معلّم لطیف ذوق مزاح رکھتا ہو۔ اس میں نہ تو خلاف حق کی کوئی بات شامل ہو، نہ کسی کی دل آزاری ہو۔ معلّم کا کام صرف نظری تعلیم ہی نہیں بلکہ طلبہ کو دین و دنیا کی ترقی کا ذمہ دار بنانا بھی ہے۔

مجموعی نقطہ نظر سے ایک معلّم کے لیے ضروری ہے کہ اس کا نفس مضمون پر عبور ہو اور علم التعلیم کے حوالے سے مؤثر طریقہ ہائے تدریس کے استعمال کی تربیت رکھتا ہو لیکن نظریاتی تناظر میں مؤثر حکمت تدریس وہی ہو گی۔ جس میں اُستاد بنیادی مہارتوں کے ساتھ ساتھ، قرآن حکیم اور اسوۂ رسول ﷺ کے حوالے سے بھی اپنا تدریسی اسلوب مرتب کرے اور اس طرح اپنے افکار و کردار میں صالحیت پیدا کرے کیونکہ معلّم کی عملی وجاہت بے معنی ہو گی اور اس کے ساتھ اخلاقی قوت شامل نہیں۔

متعلّم کی نفسیاتی اساس کو مد نظر رکھ کر بات کی جائے تو ضروری ہے کہ ایک معلّم اپنی ذات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اپنے کام کو سمجھنے کی غرض سے اپنے مقاصد پر نظر ثانی کرے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسے سماجی

گرد و پیش کو بھی سمجھنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے جن کے اندر وہ کام انجام دیتا ہے معلّم کو محرکات کو سمجھنے اور دوسرے کے احساسات کا صحیح اندازہ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم ہونا چاہیے۔ چونکہ معلّمی ایک طرح کا اظہار ذات ہے اور اس وجہ سے بھی کہ معلّمی ایک نہایت دشوار قسم کا یکساں ذاتی تقابل چاہتی ہے اس لیے معلّم کو پیش آمدہ مسائل سے نمٹنے کے لیے خود کو صحت مند سرگرمیوں کا حامل ہونا چاہیے اور بطور رہنما اسے نوجوانوں کو کارآمد خود کفیل شہری بننے میں مدد کرے، طلبا کے مقاصد و اعمال کو سماجی سطح پر قابل قبول بنائے اور طلبا و سماج کے معاملات کو متوازن کرے باہمی احترام کی اہمیت پر طلبا کو کاربند کرے طلبا کے ساتھ ساتھ خود کو بھی متوازن رویوں کا حامل ثابت کرے۔

ج: ناول اور کردار نگاری

کردار نگاری ناول کا اہم جزو ہے، ناول میں جو واقعات پیش آتے ہیں ان کے مرکزی کردار کچھ جاندار ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ انسان ہی ہوں۔ حیوانوں سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ افراد قصہ کردار کہلاتے ہیں۔ یہ جتنے حقیقی یعنی اصل زندگی کے قریب ہوں گے ناول اتنا ہی کامیاب ہو گا۔ کردار دو حصوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ ایک پیچیدہ (راؤنڈ) دوسرے سپاٹ (فلیٹ)۔ انسان حالات کے ساتھ تبدیل ہوتا ہے۔ جن کرداروں میں ارتقا ہوتا ہے یعنی جو کردار حالات کے ساتھ تبدیل ہوتے ہیں وہ راؤنڈ کہلاتے ہیں۔ جیسے مرزا ہادی رسوا کے امراؤ جان ادا اور سلطان مرزا۔ اسی طرح کے کردار جیتے جاگتے کردار کہلاتے ہیں اور ادب کی دنیا میں امر ہو جاتے ہیں۔ جو کردار ارتقا سے محروم رہ جاتے ہیں پورے ناول میں ایک ہی سے رہتے ہیں وہ سپاٹ کہلاتے ہیں۔ نذیر احمد کے "مرزا ظاہر دار بیگ" اور سرشار کے "خوجی" اس کی مثال ہیں۔ یہ دلچسپ ہو سکتے ہیں مگر سچ مچ کے انسانوں سے ملتے جلتے نہیں ہو سکتے۔ مکالمہ نگاری پر بھی ناول کی کامیابی اور ناکامی کا بڑی حد تک دارومدار ہوتا ہے۔

ناول کے کردار آپس میں جو بات چیت کرتے ہیں وہ مکالمہ کہلاتی ہے۔ اسی بات چیت کے ذریعے ہم ان کے دلوں کا حال جان سکتے ہیں اور انہی کی مدد سے قصہ آگے بڑھتا ہے۔ ناول میں کردار نگاری ہی ناول کی جان ہے۔ ناول کے کردار ہی قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں یہ کردار جاندار ہونے ضروری ہیں۔

کردار کے حوالے سے بنیادی اور ضروری امور کو مد نظر رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے اس ضمن میں سب سے پہلی بات پسندیدگی ہے یعنی جو کردار پیش کیا جائے وہ خاص حد تک انسانی خصوصیات کا حامل ہو، دوسری بات کردار کی شناخت ہے یعنی کردار کو پڑھ کر یا دیکھ کر خیال کسی خاص ڈھب کے انسان یا کسی فرد واحد یا جماعت کی جانب مبذول ہو، اس ضمن میں تیسری بات کردار کی مطابقت ہے یعنی شخصیت کے مختلف اظہارات، حرکات و سکنات موزوں دکھائی دیں علاوہ ازیں کردار کے محرکات مناسب ہونے کے ساتھ ساتھ معقول بھی ہوں، اگر ایک متن میں زیادہ کردار ہوں تو ان میں توازن اور مطابقت کا ہونا ضروری ہے۔ اور ان کے مابین باہمی تقابل و توازن مناسب ہونا چاہیے۔ سیّد عابد علی عابد نے کردار پر بحث کرتے ہوئے اس کی سات طرفیں نکالی ہیں لکھتے ہیں:

> ''۱۔ کردار کو مناسب حد تک انسانی خصوصیات کا حامل نظر آنا چاہیے۔
> ۲۔ توجہ کسی ڈھب کے انسان کی طرف مبذول ہو۔
> ۳۔ بات چیت، نشست و برخاست، حرکات و سکنات مناسب ہوں۔
> ۴۔ کردار کی مطابقت
> ۵۔ کردار کے محرکات، انہی سے بحث کرنا یا انہیں اس طرح سے پیش کرنا کہ کردار کے اوصاف اور اس کے اعمال کی وجوہ روشن ہو جائیں کردار نگاری ہے۔
> ۶۔ کردار کا انکشاف
> ۷۔ کرداروں کا تقابل و توازن، کرداروں کے تقابل و توازن سے ان کی وحدت ترکیبی میں اجزا کی موزونیت اور خوبی بھی مراد ہے۔''(۲۸)

کردار ناول، داستان، ڈرامے اور افسانے کا لازمی جزو ہے ہر ناول میں ایک یا دو مرکزی کردار ہوتے ہیں جن کے گرد کہانی کا تانا بانا بُنا جاتا ہے لچک دار کردار انسانی اعمال کے قریب تر ہوتا ہے لچکداری ہی اس کی خوبی سمجھی جاتی ہے جمود کا شکار یا خاص وضع کا جامد کردار ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنتا ہے کردار کی وضاحت میں حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> ''کہانی کے واقعات جن افراد قصہ کو پیش آتے ہیں انہیں اصطلاح میں کردار کہا جاتا ہے۔''(۲۹)

اصناف ادب میں وہ تمام اصناف جن میں کہانی کا عنصر پایا جاتا ہو ان میں لازمی طور پر کردار کا عمل دخل ہوتا ہے کسی بھی افسانوی صنف میں بات کرتے ہوئے یا اس کا ادبی مقام و مرتبہ متعین کرتے ہوئے کرداروں کو لازماً زیر بحث لایا جاتا ہے۔

i۔ ناول میں کردار نگاری

ناول وہ نثری قصہ ہوتا ہے جس میں ہماری زندگی کی تصویر ہو بہو پیش کی گئی ہو۔ تمام افعال زندگی ناول کا موضوع ہے۔ ناول ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں زندگی کے سارے روپ دیکھے جا سکتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ پڑھنے والے کو یہ قصہ بالکل سچا محسوس ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ قصہ جتنا جاندار ہو گا قاری کی دلچسپی اس میں اتنی ہی زیادہ ہو گی۔ اب یہ فنکار کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس دلچسپی کو برقرار رکھے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کہانی اس طرح آگے بڑھائے کہ پڑھنے والا یہ جاننے کے لیے بے تاب رہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ گویا کہانی پن برقرار رہے۔ تخلیق کردہ کرداروں کا جامد، متحرک، زندہ، حیثیت کے ذریعے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کس مصنف کے کردار زیادہ پر زور اور سماج سے مطابقت کے حامل ہیں، سیّد عابد علی عابد کردار اور اس کی اقسام کی بابت وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”کردار اصلاً دو اقسام کے ہوتے ہیں: ایک ٹائپ یا جامد دوسرے ڈرامائی یا متحرک۔۔۔۔ جو کردار ٹائپ ہوتے ہیں وہ کسی طبقے کہ گروہ کی یا کسی معاشرتی جماعت کی نمائندگی کرتے ہیں ان کی سیرت ماہ و سال کے سانچوں میں ڈھل کر پختہ ہو جاتی ہے اور ان کا کردار اس اعتبار سے جامد ہوتا ہے کہ زندگی کے بدلتے ہوئے متغیرات کا ساتھ نہیں دیتے۔۔۔۔ ناول میں ایسے کردار کوئی غیر متوقع کام نہیں کرتے۔ ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص حالات میں ان کا ردعمل کیا ہو گا۔ دوسری اقسام کے کردار جنہیں ڈرامائی کہا جاتا ہے بامتداد زماں واقعات کے فشار سے متاثر ہو کر بدلتے رہتے ہیں۔“[۳۰]

کسی ادیب کا وہ کردار کامیاب سمجھا جائے گا جو سماج کے عام انسانوں جیسا ایک انسان ہونے کے باوجود ایسی انفرادیت کا بھی حامل ہو کہ اسے ہم ہجوم میں الگ پہچان سکیں اور اپنی واضح انفرادیت رکھنے کے باوجود وہ سماج کا ایک قرین قیاس انسان معلوم ہو۔ اس پر نہ شیطان کا گمان ہو نہ فرشتے کا دھوکا ہو، کیونکہ وہ مخلوق جسے آدمی کہا جاتا ہے نہ فرشتہ ہے نہ شیطان۔ کسی کردار کی انفرادیت سے مراد اس کردار کی وہ خصوصیت ہے جس

کی بناپر وہ عام آدمی ہونے کو باوجود دوسروں کے مقابلے میں ایک خاص قسم کا انسان بن جاتا ہے اور دوسروں سے ممتاز ہو سکتا ہے۔ کوئی ایک خصوصیت بھی انفرادیت کا باعث بن سکتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک خصوصیت بھی دراصل بعض خصوصیت کا مجموعہ ہے۔ ''امراؤ جان ادا'' میں بسم اللہ جان ایک کردار ہے، وہ بھی دوسری طوائفوں کی طرح ایک طوائف ہے لیکن اس کی طبیعت میں ایک خاص قسم کا چلبلا پن ہے جس کی وجہ سے وہ دوسری طوائفوں سے منفرد نظر آتی ہے۔ اس کی گفتگو میں، کردار میں، لب و لہجہ میں، حرکات و سکنات میں، اعمال و افعال میں دوسروی خصوصیات کے ساتھ مل کر اس کی یہ خصوصیت بھی جھلک دکھاتی ہے خورشید بھی طوائف ہے لیکن اس کے مزاج کی امتیازی خصوصیت اس کے مزاج کا گھریلو ہونا ہے جسے گھر بسانے کی خواہش بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور ناول میں اس کا مظاہرہ کئی شکلوں میں ہوتا ہے۔

فرد، سماج، شاگرد و اُستاد سماجی سطح پر موزونیت کے متلاشی ہوتے ہیں جن میں صحت مند کردار صرف معلّم ادا کر سکتا ہے وگرنہ درست نتائج حاصل نہیں ہو سکیں گے۔ مختلف مکتبہ ہائے فکر میں معلّم کی حیثیت و اہمیت پر معروضات کی پیش کش کے بعد ضروری ہے کہ کردار اور اس کی ادبی حیثیت و اہمیت پر متقدمین کی آراء سے استفادہ کیا جائے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان حالات و واقعات سے متاثر ہوتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے افکار و اعمال میں تفسیرات کروٹ لیتے ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ کچھ واقعات و حادثات کے نتیجے میں کسی شخص کا کردار یکسر بدل جاتا ہے مثلاً ایک بزدل، بہادر بن جاتا ہے ایک راہزن تائب ہو کر اچھا انسان بن جاتا ہے کہانی کی جتنی بھی تعریفیں ممکن ہیں ان سے یہ واضح ہے کہ کہانی بنیادی طور پر زندگی کے اتار چڑھاؤ کا ہی عکس ہوتی ہے افسانہ، ناول اور ڈرامہ میں افراد قصہ بھی انسان ہوتے ہیں اور وہ کردار ہماری عملی زندگی سے مرتب کیے گئے ہوتے ہیں وہ عام انسان کی طرح ہر سطح پر متاثر ہوتے ہیں یا کرتے ہیں۔ اور ان کے خیالات و افکار اور عقائد رسم و رواج، طرز عمل اسی مناسبت سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہی تغیر جو کسی کردار کے حالات و واقعات کے سبب سے ظاہر ہوتا ہے حقیقت میں یہی کردار کہلاتا ہے۔

Character, behaviourism of characterization character میں بنیادی فرق بہروپ، سوانگ رچانا، یا رول ادا کرنا کے معنوں کے لحاظ سے الگ الگ ہوتا ہے دراصل کہانی کے افراد ہوتے ہیں جن کی وضع ادیب یا شاعر کی ذہنی اختراع کے باعث ہوتی ہے جبکہ Behaviour علم نفسیات کی اصطلاح بھی ہے اور ایک شاخ بھی، اس کا موضوع حیوانوں اور انسانوں کے کرداروں کا معروضی سطح پر مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس

سلسلے میں ای ایل تھارن ڈائیک اور دیگر نفسیات دانوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانوں کے کردار اور نچلے درجوں کے حیوانات کے کردار میں مطابقت اور مماثلت پائی جاتی ہے اس پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے حیران کن نتائج بر آمد کیے گئے، کتوں، بلیوں اور چوہوں پر جو تجربات کیے گئے ان سے نفسیات دانوں کے موقف کو تقویت ملتی ہے مختصر یہ کہ:

> ''داریت اس مفروضے کا نام ہے کہ انسان جسم اور محض جسم ہے یہ نظریہ جبریت پر منتج ہے اور یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ کرداریت نے انسانی ذہن اور انسانی ارادہ کے بارے میں قوی شبہات پیدا کرنے میں خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔''(۳۱)

بڑے فنکار جانوروں کو کرداروں کے طور پر پیش کرتے ہوئے ان کی انفرادیت بھی متعین کر لیتے ہیں اور اس پر پورا قابو رکھتے ہیں۔ اسی طرح ''توبۃ النصوح'' ڈپٹی نذیر احمد کے ناول کے کردار دیکھتے ہیں تو وہاں نصوح کے کردار کو ایسا برتا گیا ہے کہ اس کے اثرات اس کے بچوں کے کردار پر بھی نظر آتے ہیں۔ نصوح سماج کا ایک عام پایا جانے والا فرد ہے جو زندگی میں ہر طرح کے کام کرتا ہے اور دوسروں کی اصلاح سے بے خبر رہتا ہے مگر کوئی حادثہ اسے اس بات کی یقین دہانی کرواتا ہے کہ اس کی اولاد بھی اگر اس راستے پر چلے تو اس کو بھی ان معاملات کا سامنا ہوگا تاہم جو مجھے برداشت کرنا پڑا ہے وہ دوسروں کو برداشت نہ کرنا پڑے۔ نفسیاتی حوالے سے یہ ایک ایسے انسان کی خصوصیت ہے جو نہ تو معاشرے میں ایک شیطانی کردار کی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اور نہ ہی فرشتہ ہونے کا گمان لیے ہوئے ہوتا ہے۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کلیم جو کہ نصوح کا بڑا بیٹا ہے، کے علاوہ باقی دونوں بیٹوں سلیم، کلیم اپنے باپ کے سیدھے راستے پر آنے پر زیادہ دیری نہیں کرتے ان دو کرداروں میں نصوح کے نیکی اور رحم دلی کے اثرات مرتب ہیں اور کلیم جو ایک لمبی مسافت طے کرتا ہے اس کے کردار پر نصوح کی توبہ سے پہلے کی زندگی کے اثرات ہیں۔ اگر ہم افسانوی کردار دیکھتے ہیں تو پریم چند کے افسانے ''دو بیل'' میں موتی اور سر کردار دیکھتے ہیں۔ پریم چند نے ان دونوں کی الگ الگ پہچان مقرر کر دی ہے اور وہ یہ ہے کہ موتی برداشت کا کمزور ہے۔ چنانچہ پورے افسانے میں موتی کا ہر جملہ اور اس کی ہر حرکت اس امتیازی خصوصیت کو بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہوتا رہا ہے کہ ان کے اکثر کردار نیکی اور بدی کے مجسمے ہیں۔ اردو ناول کی تاریخ پہ سرسری سی نگاہ ڈالیں تو نذیر احمد کا ظاہر دار بیگ، سرشار فوجی، رسوا کی امراؤ جان ادا، اور راجا گدھ کی سیمی شاہ نیکی و بدی کے ماحول کو قبول کر لینے کی بنا پر آج تک لوگوں کے اذہان میں تازہ ہیں۔ سید عابد علی عابد، سید امتیاز

علی تاج کے حوالے سے کردار اور کردار نگاری Characterization کے مابین فرق و امتیاز کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''کردار جو کچھ ترتیب سے کرتے ہیں، اسے پلاٹ کہا جاتا ہے۔ کردار نگاری کے ذریعے ڈراما نگار ان لوگوں کو پیش کرتا ہے جن کے اعمال و افعال پہ اپنے ڈرامے کی بنیاد رکھتا ہے۔''(۳۲)

کردار نگاری کے سلسلے میں مبالغہ آرائی کی بھی لہر نظر آتی ہے اس سے اجتناب برتنا ضروری ہوتا ہے۔ کردار میں بے تحاشا محاسن بھر دینا یا پھر اسے شیطان کا ساتھی بنا دینا جو کہ قصے سے بھی مطابق نہ رکھتا ہو اسے مصنوعی سا بنا دیتا ہے۔ انسان کی ذات میں اتنی ہی خوبیاں اور خامیاں سموئی جائیں جن کی اس میں فطرت کے اعتبار سے ضرورت ہو۔ گردش رنگ چمن میں ولن کی قلب ماہیت ایک خاص لمحے میں ہوتی ہے جس کی محرک بیاں یا بھیا کی خانقاہ ہے لہذا مصنف کی جانب سے اس کردار کی قبولیت میں نفسیاتی منطق کار فرما ہوگئی ہے۔ پھر اچانک تبدیلی کے لیے مضبوط واقعہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے مثال کے طور پر ''چاندنی بیگم'' میں قرۃ العین حیدر نے اسے ابتدا ہی میں آگ میں جلنے سے موت کا شکار دکھایا اور قصے کو دوسرے کرداروں (ضمنی قسم کے جو مرکزی روپ دھار لیتے ہیں) کی مدد سے اٹھا دیا۔ یہاں مصنفہ نے ہستی کی تبدیلی کا پہلو پیش کیا ہے جو موت کی وجہ سے اچانک پیش آئی۔ اس مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر واقعہ یا انجام کا جواز کردار کو قابل قبول بناتا ہے۔ اس کے لیے ناول نگار کے پاس ٹولز یعنی تخلیقی اوزار ہیں مثلاً داخلی خود کلامی، ڈائری، خطوط، اساطیر کا استعمال یا پھر علامتوں کا استعمال جو احتیاط سے استعمال کرنے سے کردار ہی کو علامت بنا دیتی ہے۔

ii۔ ناول اور افسانے میں کردار کا فرق

افسانہ کے متعلق لوگوں کا یہ عام خیال ہے کہ یہ ناول ہی کی ایک مختصر شکل ہے۔ اس خیال کو غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ناول سے افسانہ نے صرف آرٹ لیا اور اس آرٹ میں بھی ضرورت کے مطابق برابر تبدیلیاں ہوتی رہیں، یہاں تک کہ موجودہ صورت میں ناول اور مختصر افسانہ دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ دونوں کا فن، دونوں کی لطافتیں، دونوں کی اچھائیاں اور برائیاں بالکل الگ ہیں اور اس لیے یہ سمجھنا کہ ناول کی جگہ افسانہ لے سکتا ہے، ایک بڑی نادانی ہے۔ افسانہ اور ناول دو بالکل جداگانہ چیزیں ہیں۔ دنیا کے بہت سے اچھے اچھے ناول نگار کامیاب افسانہ نگار نہیں بن سکے۔ اور بہت سے کامیاب افسانہ نگار باوجود کوشش کے

ناول نگاری کی دنیا میں کوئی ممتاز حیثیت حاصل نہیں کر سکے۔ ناول اور افسانہ میں سب سے نمایاں فرق ان دونوں کا طول اور اختصار ہے اور صرف اس فرق کی وجہ سے دونوں میں بہت سے فنی اور لطیف فرق پیدا ہو گئے ہیں۔

افسانہ اور ناول کے لیے سب سے پہلی چیز اس کا پلاٹ ہے۔ بغیر کسی خاص پلاٹ کے افسانہ اور ناول کا وجود ممکن نہیں ہے لیکن ناول نگار اور افسانہ نگار دونوں اپنے اپنے مقصد کے لحاظ سے اس میں تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں۔ ناول نگار کی دنیا آزاد ہے اور اس کے بعد بھی اسے دلوں کو اپنے قبضہ میں کرنے کی زیادہ پروا نہیں۔ افسانہ نگار مقید ہے۔ اس کی پابندیاں اس کے پاؤں کی زنجیریں ہیں۔ اس کے بعد بھی اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والے کے دل کو اپنے اثر میں رنگ دے اور وہ ہر شخص کو اپنے سحر کی رنگین دنیا کا باشندہ بنا لے۔ کیا اس کے بعد بھی اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کا فن، اگر کوئی حقیقی معنوں میں اسے فن سمجھے تو، ناول سے کہیں زیادہ دشوار اور بلند ہے؟ پلاٹ کو چھوڑ کر ہم افسانوی کرداروں کی طرف توجہ کریں تو ہمیں افسانہ نگار کی دقتوں کا زیادہ اندازہ ہو جائے گا۔

ناول میں ہم اس کے کرداروں کو مختلف شکلوں اور مختلف حالتوں میں دیکھتے ہیں اور انہیں دیکھنے کے بعد ان کے متعلق اپنی رائے قائم کر سکتے ہیں۔ انہیں کبھی ہم نے دوستوں سے، کبھی گھر والوں سے اور کبھی ہمسایوں سے ملتے جلتے، بات چیت کرتے، ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے دیکھا ہے، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ان کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ ہماری ذاتی ہے۔ ناول نگار نے صرف واقعات بیان کر دیئے اور اس کا فرض ختم ہو گیا۔ مختصر افسانہ میں یہ سب چیزیں ایک ساتھ نہیں دکھائی جاتیں اس لیے افسانہ نگار کو اپنے کرداروں کو ہمیشہ کسی نہ کسی خاص اضطراب (Crisis) کی حالت میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان کا ارتقا بھی دکھانا لازمی ہو جاتا ہے اور ان صورتوں میں بھی انتخاب اور دقت نظر کی ضرورت پڑتی ہے اور ناول نگار کے مقابلہ میں ایک دشوار کام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ افسانے کی دقتیں ناول نگار سے کہیں زیادہ ہیں۔ اسے زیادہ باخبر، زیادہ متوجہ اور زیادہ سے زیادہ فن کا پابند ہونا چاہیے۔

iii۔ کلیدی اور ضمنی کرداروں میں فرق

کردار کسی بھی کہانی کا لازمی جزو ہوتے ہیں۔ کہانی داستان کی شکل میں ہو، ناول کی شکل میں یا پھر افسانہ کی صورت میں ہو اس کا پلاٹ کرداروں پر ہی بنیاد پکڑتا ہے۔ عام طور پر کہانی میں موجود کردار دو طرح

کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ مرکزی یا کلیدی کردار جن کے لیے کہانی تحریر کی گئی ہو جبکہ دیگر ضمنی کردار جو مرکزی کرداروں کے ساتھ کہانی کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ افسانہ میں کردار کے ساتھ منسلک مختلف جزئیات کو مختصراً پیش کیا جاتا ہے جبکہ ناول میں کسی کردار کی زندگی اور اس سے متعلقہ دور کی تمام تر تاریخ بلکہ اس کردار کے دور کی تہذیب و ثقافت کو بھی لازمی طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

ناول نگاری میں نذیر احمد کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے ناولوں نے خاص طور کہانی کو تخیل کی دنیا سے باہر نکالا اور اسے معاشرتی زندگی کے مقاصد کا عَلَمبردار بنانے کی تعلیم دی۔ ان کے کردار حقیقی سے زیادہ مثالی پہلو کے حامل ہیں اوان کرداروں کے غیر معمولی افعال و اعمال دنیا کو حیرت زدہ کرتے ہیں۔ اس کے مدمقابل عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار نے کہانی کو حقیقت نگاری اور احترام فن کا ایک نیا انداز سکھایا۔ سجاد حسین، مرزاہادی رسوا، مرزاسعید احمد نے مختلف معاشروں کے مطالبات کو کرداروں کے ذریعے سے پورا کرنے کی کوشش کی اور کرداروں کے ذریعے فلسفہ، منطق نفسیات اور تخیل کی سرزمینوں میں قدم رکھنا شروع کیا۔ پریم چند نے کرداروں کے ذریعے معاشرتی اور سیاسی زندگی کے گہرے مشاہدے کو ایک سانچے میں ڈھالا۔ فنی اعتبار سے ان کے ناول بے حد دل کش اور نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تمام ناول نگاروں نے کرداروں کو ضمنی اور کلیدی حیثیت میں پیش کر کے معاشرے کی اصلاح کا کام لیا ہے۔

د: اردو ناول میں معلّم کا کردار: پس منظری مطالعہ

انسان وقت کی رفتار کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرتا ہوا جس طرح دیگر ضروریات کے لیے کوششیں کرتا گیا اسی طرح ہی ابلاغ کے لیے بھی ذرائع تلاش کرنے میں کامیاب ہوتا گیا۔ بہت وقت گزرنے کے بعد انسان کو الفاظ کا ادراک ہوا تو انسان کے ابلاغ میں روانی پیدا ہوئی۔ الفاظ میں انسان پیار، محبت، نفرت، غصہ اور رنج و غم بیان کرنے کے قابل ہوا تو اسے اپنے ہم خیال لوگ تلاش کرنے میں بھی آسانی محسوس ہونے لگی۔ لفظوں نے انسان کو اتنا کچھ دیا کہ یہ مقدس لگنے لگے۔ یہ جادوئی فارمولوں کا مواد بنے۔ ان کی توقیر اس وقت زیادہ تھی جب یہ زیادہ بے معنی تھے، ان سے نہ صرف سوچ میں وضاحت اور بلاغت آئی بلکہ بہتر معاشی تنظیم بھی وجود میں آئی۔ انھوں نے تعلیم کے بہتر ذرائع اور علم و فنون کے ابلاغ سے نسلوں کو ذہنی طور پر مربوط کیا۔ انھوں نے ابلاغ کا ایسا رابطہ تخلیق کیا جس سے ایک نظریہ یا عقیدہ کے لوگوں کو ایک وحدت میں ڈھال سکتا تھا۔ انھوں نے تصورات کے سفر کی نئی شاہراہیں کھولیں اور زندگی کو وسعت بخشی۔ کیا کوئی دوسری

ایجاد اور طاقت، عظمت میں اسم نکرہ کی ہم سر ہو سکتی ہے۔ الفاظ کا ذخیرہ پیدا کر چکنے کے بعد انسان پر تحقیق کے در ایک ایک کر کے وا ہونے گے۔ سوچ کی وسعت کے بعد گویائی کا سب سے بڑا تحفہ تعلیم تھا۔ تہذیب آرٹ، دانش، عادات واطوار اور اخلاق کا خزانہ ہے۔ جس سے فرد ذہنی ترقی میں اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔ ہر نسل کی نسلی وراثت کے اس دوری اکتساب کے بغیر تہذیب اتفاقی موت مر جائے گی۔ اس کی زندگی تعلیم کی مرہون منت ہے۔

بہت وقت تک انسان کے لیے تعلیم کا مطلب اپنا ہنر ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرنا ہی تھا۔ غیر متمدن لوگوں کی تعلیم میں غیر ضروری نمود و نمائش نہیں تھی۔ ان کے لیے تعلیم فقط مہارت کا ابلاغ اور کردار کی تربیت تھی۔ نو آموز کا اُستاد سے بھرپور رشتہ ہوتا تھا۔ اس براہ راست اور عملی تربیت سے غیر متمدن بچے کی نمو میں تیزی پیدا ہوئی متعدد قبائل کے بارے میں ہے کہ ان کا کوئی دس بارہ سالہ لڑکا اپنے باپ کے تمام فنون سیکھ لیتا اور عملی زندگی کے لیے تیار ہو جاتا۔ ایک قدیم قبیلے الیوٹوں کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کا صرف دس سال کا لڑکا خود اپنا گھر بناتا اور بعض اوقات بیوی بھی حاصل کر لیتا۔ کوئی وقت تھا جب نائیجریا میں چھ یا آٹھ سال کے لڑکے اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر اپنا جھونپڑا بناتے اور شکار اور ماہی گیری کے ذریعے زندگی گزارتے۔ انسان کے پاس استعمال کرنے کے لیے ذخائر فطرت تھے اور ویسے بھی فطری انسان کا ماحول زیادہ دیرپا تھا اس کے لیے ذہنی چستی کی نہیں بلکہ ہمت اور کردار کی ضرورت تھی۔ جس طرح جدید تعلیم عقل پر بھروسہ کرتی ہے اسی طرح غیر متمدن باپ کردار پر بھروسہ کرتا تھا۔ وہ عالم فاضل نہیں بلکہ انسان بنانے کے چکر میں تھا۔ چنانچہ ضابطہ شرکت کی رسوم، جو نوجوان کی بلوغت تک پہنچنے اور قبیلے کی رکنیت حاصل کرنے کی نشاندہی کرتی تھی کا مقصد حوصلے کا امتحان تھا علم کا امتحان نہیں۔ ان کا وظیفہ نوجوان نسل کو جنگ کی سختیوں اور شادی کی ذمہ داری کے لیے تیار کرنا تھا۔ اس قسم کی باضابطہ شرکت کے بعض امتحانات بہت زیادہ خوفناک اور باغیانہ ہوتے تھے۔

ایسے وقتوں میں جبکہ انسان کے لیے صرف اپنے آباء کا ہنر اور پیشہ سیکھنا ہی ضروری سمجھا جاتا تھا قلم اور تحریر کی اہمیت نہیں تھی۔۔ فطری لوگوں کو جو چیز بہت حیران کرتی تھی وہ اہل یورپ کا طویل فاصلے کے باوجود تحریری رابطہ تھا۔ بہت سے قبیلوں نے اپنے مذہب کا استحصال کرنے والوں کی نقل سے لکھنا سیکھ لیا تھا۔ لیکن بعض قبیلے مثلاً شمالی افریقن قوم پانچ ہزار سال تک پڑھی لکھی قوم کے ساتھ تعلق کے باوجود ناخواندہ رہی

۔ سادہ قبیلے جو مقابلتاً تنہائی کی زندگی گزارتے اور تاریخ نہ ہونے کی مسرتوں سے آشنا تھے۔ تحریر کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ ان کی یادداشتیں اتنی مضبوط تھیں کہ انہیں کچھ یاد رکھنے کے ذرائع درکار نہیں تھے۔ وہ جو کچھ جانتے اسے اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھتے جو تاریخی ریکارڈ اور تہذیبی ورثہ ضروری ہوتا اسے اپنے بچوں تک زبانی منتقل کر دیتے تھے۔ اس زبانی روایت اور لوک ورثہ کی بنا پر ادب وجود میں آیا۔ ادب کے وجود کے ساتھ ادب کی اصناف کے لیے بھی راہیں ہموار ہونے لگیں ، ان اصناف میں ناول ،افسانہ ، ڈرامہ ، داستان ، وغیرہ نے اپنے اپنے راستے الگ کر لیے۔

اردو ادب کے ناولوں کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے اس پر بہت بحث ہو چکی ہے مگر ان میں یہ بات اکثر زیر بحث آتی رہی ہے کہ کیا قصے کو کردار پر فوقیت حاصل ہے ؟ یا معاملہ اس سے برعکس ہے۔ ظاہر ہے کہ کردار کہانی سے متعلق انجام پاتا ہے۔ فطری طور پر انسان سماجی جانور کہلاتے ہیں اور شعور سے ایسے بہرہ ور کہ دنیا میں ایجادات اور انکشافات اور تعمیرات کو ممکن بنائے رہتے ہیں۔ ان معاملات میں اس قدر قربت ہے کہ حال ماضی کی تلاش میں رہتا ہے۔ اپنے آپ کو حیرت و استعجاب میں مبتلا کیے رکھتا ہے اور اس کی ادب اور فنون لطیفہ کے ذریعے تخلیق نو کرتا رہتا ہے نیز یہ کہ مستقبل کی نئی صورت گری میں بھی شامل رہتا ہے۔ زندگی دائمی حقیقت ہے اور قصہ اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون ہے۔ لیکن اس کی رگیں کردار ہیں۔ ناول کے یہ دونوں ستون ہیں جن پر اس کی عمارت ایستادہ ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے سے یہ عمارت دھڑام سے گر جائے گی اور اس کے اس عمل سے قاری کو وہ مسرت نہیں ملے گی جس کے لیے وہ مطالعہ کر رہا ہے۔ تاہم اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ کردار کی موجودگی کے باوجود ماحول، زبان ، تکنیک، منظر نگاری کا طلسم، اسلوب بیان اور ذہن کو متلاطم کرنے اور شعور و احساس کی بالیدگی کے لیے دل میں اتر جانے والے مکالمات ناول کو مطالعاتی کشش سے ہم کنار کرتے ہیں۔

افسانے اور ناول کے باب میں بڑے نام کے طور پر انتظار حسین، ہاجرہ مسرور، غلام عباس، خواجہ احمد عباس، قراۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب ، شوکت صدیقی ، اشفاق احمد، بانو قدسیہ سامنے آئے۔ انھوں نے حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ فکر و تخیل اور احساس کی گہرائیوں کو جذب کر کے فن کی خدمت کی اور کرداروں کو متحرک انداز میں پیش کیا۔ سید وقار عظیم کردار کی نفسی خوبیوں کے من جملہ پہلوؤں کی تفصیل دیتے ہوئے کردار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''کردار میں، خواہ وہ کردار اصلی زندگی کا ہو یا کہانی اور داستان کا، یہ شان اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کردار اپنی عظمت سے پوری طرح آگاہ ہو۔ اس عظمت میں عیب و ہنر اور حسن شامل ہوتے ہیں۔ اسے اپنی خوبیوں کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا پورا علم ہو اور وہ ان کوتاہیوں کو پوشیدہ رکھنے پر قدرت رکھتا ہو۔ شبہ یا بدگمانی کا باعث بن سکے تو اس میں اپنے قول و فعل کی ایسی تاویل و توجیہہ کا ملکہ ہو کہ زمانہ پہلے سے بھی زیادہ اس کا قائل ہو جائے۔''(۳۳)

مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کردار اپنے حصے کی خصوصیات کا ادراک بھی رکھتا ہو اور پیش کش میں بھی کامل ہو لیکن بعض مفکرین کا خیال ہے کہ بعض اوقات حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ کردار کی ذمہ داری کم نظر آتی ہے لیکن حالات کردار کے اعمال کا نتیجہ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ حالات تین طرح کے ہو سکتے ہیں:

'' ایک ذہن کے غیر معیاری حالت ہے جیسے پاگل پن، بے خوابی اور وہم وغیرہ، او فیلیا دیوانہ وار مختلف گیت گاتی ہے اور ڈوبتے ہوئے ترنم کو نہیں چھوڑتی۔ دوسرا، عنصر ذوق الفطرت عناصر کا دکھایا گیا ہے جن کا کردار کے ذہن کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کردار کے اعمال بھی ان کا سبب نہیں ہوتے۔ ایسے حالات واقعات کا رخ بدل دیتے ہیں۔''(۳۴)

اردو فکشن میں جن بھوت، دیو، بادشاہ، شہزادے، شہزادیاں، غلام، سپہ سالار، بہادروں کے کارنامے، جادوگروں کے کھیل، دل ہلا دینے والے واقعات کا زمانہ لایا گیا تو ناول نگار اپنے ارد گرد کے خانگی منظر ماحول اخلاقی، تہذیبی، سماجی، سیاسی پہلوؤں کا اسیر ہوا۔ ان موضوعات میں مذہبی نظریات بھی غالب آتے رہے۔ اصلاحی انداز ڈپٹی نذیر احمد سے ہوتا ہوا مرزا ہادی رسوا تک آن پہنچا۔ ایک مظلوم لڑکی کو طوائف بنا کر لکھنوی معاشرت کی تہذیبی عکاسی کی گئی۔ رومانی ناول نگاروں میں نیاز فتح پوری کے ناول ''ایک کا انجام'' اور شہاب کی سرگزشت پرانے اور نئے عہد کا سنگم گنتے ہیں۔ عزیز احمد نے نیچرل ازم کے ذریعے اپنی شناخت بنائی۔ ان کے کردار بھی جاندار اور زوردار کردار کے طور پر یاد رکھے جائیں گے اس عہد میں ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناول'' شام اودھ ''کے بوڑھے ہیرو نواب ذوالفقار عیل اودھ کے کلچر کی انحطاط زدہ تصاویر اتارنے میں یاد گار بن گئے۔ اسی طرح قراۃ العین حیدر کے کردار گوتم، چمپا، کال بھی زور دار کردار

کے بعد ازاں تحریک آزادی کے موضوع پر بہترین ناول سامنے آئے۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس موضوع اور اس عہد کے ناول کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عبداللہ حسین کے ''اداس نسلیں'' کا نعیم اسی کی یادگار ہے جو دیہاتی کلچر کا نمائندہ ہوتے ہوئے روشن آغا صاحب کی لڑکی عذرا سے شادی کر کے آزادی کی تحریک کے دوران کہانی میں رنگ بھر دیتا ہے اس کے مکالمے ناول کی جان ہیں۔۔۔۔۔۔
> ''(۳۵)

درج بالا اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر ایک عام سے کردار کی تخلیق جس میں پہلوداری نہ ہو یا دلچسپی کے عناصر نہ ہوں یا وہ معاشرے کی اصلاح نہ کرتا ہو اور جو ہمیں تحریک میں مبتلا نہ کرتا ہو، خواہ اپنے عمل سے مکالموں سے دوسرے کرداروں سے اپنے ارتباط سے یا ناول پر اپنے مکمل وجود کے غلبے اور انجام سے تب وہ فکشن سے باہر کی چیز ہے۔ اسے ہر صورت میں ناول نگار کے تخیل اوراپنے عہد کے وصف کا حامل ہونا چاہیے۔ بعض اوقات ناول میں کردار بذات خود علامت بن جاتا ہے جیسے گوتم، کمال، چمپا، قاضی عبدالستار کا کردار وغیرہ،یوں تو عام تاریخی کردار بھی علامتی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی عکاسی ناول نگار کے لیے کانٹوں پر چلنے کے مترادف ہے کہ ناول نگار کے تعصبات اور اندھی عقیدت اپنا راستہ ضرور بناتے ہیں لہٰذا کوئی دو تاریخی کردار جو مختلف روپ اور اپنے مخصوص نقطہ نگاہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی تاریخی کردار کو دنیا کے سب ناول نگار ایک ہی زاویے سے پیش کریں۔ اسی لیے عرب،ہندوستان،ایران وغیرہ کے مسلم کرداروں پر ان کی زندگی اور اس کی جہالت پر سو فی صد اتفاق ممکن نہیں ہے۔ ہر کردار کسی نا کسی طرح معاشرے کی اصلاح وترقی میں معلّم کی طرح ممد و معاون ہوتا ہے۔ڈاکٹر ممتازاحمد خان اس ضمن میں کرداروں کی اصلاحات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ناول کے کرداروں کے ضمن میں دو اصطلاحات عمومی طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ ایک سپاٹ Flat دوسری پہلودار / مکمل Round۔ سپاٹ کرداروں کی خصوصیات طے شدہ ہیں وہ ابتدا سے اختتام تک تبدیل نہیں ہوتے خواہ علامتی حیثیت کے حامل ہوں۔ پہلودار نامکمل کردار مختلف النوع خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں بڑی کشش ہوتی ہے وہ عہد بہ عہد تبدیل ہوتے ہیں۔ ان کی رنگارنگی ناول میں جان ڈال دیتی ہے۔''(۳۶)

دل چسپی کے اعتبار سے سپاٹ کردار بھی دل چسپ ہوتے ہیں اگر انھیں ایسی صورت حال میں ملوث کر کے پیش کیا جائے کہ ان میں ان کا سپاٹ پن حصے کو متاثر نہ کرے۔ یہ خصوصیت نہ صرف مرکزی کردار بلکہ ضمنی کرداروں پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ قصے کے تناظر اور تقاضوں کے تحت انھیں کچھ آزاد بھی رکھا جائے یعنی محض کٹھ پتلیاں ہی نہ لگیں۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

''ناول نگار اپنے نقطہ نظر کو کرداروں اور سچوایشنز کے ذریعے اجاگر کر دیتا ہے یعنی وہ کہتا ہے کہ ناول زندگی کے حوالے سے مصنف کے نقطہ نظر کا استعارہ ہے۔''(۳۷)

اسی طرح ٹالسٹائے اپنے کرداروں سے زندگی کو نمایاں کرتا ہے۔اس لحاظ سے ناول ایک بڑی صنف ادب بن جاتا ہے کہ ایک عہد، ایک سے زیادہ عہد اور ان کی پیچیدہ زندگی کے مظاہر سورج کی کرنوں کی طرح سب طرف پھیل جاتے ہیں۔اس ضمن میں ہندوستان کا ناول بے تحاشہ مظاہر کی عکاسی کرتا ہے۔ مثلاً مذہب تفرقے بازی، ہندو مسلم تنازعات، دفاتر میں کرپشن کا اٹھتا طوفان، رشوت خوری، پولیس کی زیادتیاں، سیاست دانوں کی چالیں، ہر محکمے اور ہر شعبے میں خطرناک قسم کے دلال جو ہمارے مجبور انسانوں کو کچل کر رکھتے ہیں ان کا خون چوستے ہیں ان کی آزادیوں کو محدود اور خوشیوں کو مسمار کرتے ہیں۔

عورت کو جنسی کھلونا بنا کر رکھ دینے کے بے تحاشا واقعات، ہستیِ زندگی کا عذاب دولت کمانے کی دھن میں اخلاق واقدار کی فروخت اور منافقانہ طرز عمل، خوف، عدم تحفظ، رشوت ستانی، تخریب کاریوں اور مفلسوں کی بے چارگی، بڑھتی ہوئی آبادی کی کوکھ سے برآمد ہوتے خوفناک سماجی، معاشرتی اور معاشی مسائل جو عبدالصمد (مہاتما) حسین الحق (لولوسب چپ رہو) غضنفر (کنچیلی) نورالحسن (آہنکار) کے یہاں موجود ہے۔ جن کے یہاں یہ منظر نامے ابھرتے ہیں اور یادگار کرداروں کے مقابلے میں وجودی مسائل سے بھرپور زندگی زیادہ غالب آتی ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ بغیر کردار کے ناول نویسی ایک ایسی دکان کی مانند ہے جس میں مال نہ ہو یہ بڑے فن کا کمال ہے کہ وہ ایسا کردار ابھار دیتا ہے جو قاری کا دوست بن کر ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ کردار ناول کی عمارت کو ستون کی طرح سہارا دیے رکھتا ہے۔

ناول کے اجزائے ترکیبی میں کردار تکنیکی اعتبار سے کسی طور پر بھی پلاٹ سے کم حیثیت نہیں رکھتا ہر چند صدیوں سے پلاٹ کو زیادہ اہمیت دی جاتی رہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کردار کی حیثیت اپنی جگہ پہ مسلم ہے۔ناول نگاری میں کردار کے ذریعے واقعیت کے ساتھ ساتھ میٹھے جھوٹ کا بھی سہارا لیا جاتا ہے۔ناولوں

کے سارے کردار گوشت پوست کے انسان معلوم ہوتے ہیں اور اپنے افکار و اعمال کے سبب سے ہمارے ذہنوں پر نقش ہو جاتے ہیں۔ڈاکٹر محمد یٰسین کے مطابق موضوعی اعتبار سے یہ سماج کے عکاس ہوتے ہیں لیکن:

''اکثر اوقات پڑھنے والے دھوکا کھا جاتے ہیں کہ ان کے کردار واقعی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں یا وہ محض مصنف کے ذہن و تخیل کی پیداوار ہیں۔ عموماً ہر ناول نگار اپنے کرداروں کے خدوخال اپنے مشاہدہ سے نمایاں کرتا ہے۔''(۳۸)

کردار عہد بہ عہد نظریاتی تبدیلیوں سے بھی متاثر ہوتے ہیں اور ہر عہد کے مطابق ڈھلتے جاتے ہیں۔ سادے انداز سے معاشرے کی عکاسی کرنے کے زمانے اور تھے، فی زمانہ فن کاروں کے نظریہ حیات، معاشرہ اور ماحول کروٹیں لیتا نظر آرہا ہے اس ضمن میں کردار ابہام، پیچیدگی، بے راہ روی، بے سمتی، شعور کی رو جیسے موضوعات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کرداروں کے داخلی محرکات کو بھی بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ڈاکٹر محمد یٰسین لکھتے ہیں:

''کرداروں کے داخلی محرکات، احساسات، تاثرات اور جذبات کا تعلق ان کے باطن سے ہوتا ہے۔لیکن پس منظر ایک ''فریم'' ہوتا ہے جس میں رہ کر ہر مصنف واقعات کو حقیقت کا روپ دینے میں کامیاب ہوتا ہے۔''(۳۹)

ایک اچھا ناول نگار اپنے کرداروں کو قاری سے مانوسیت کے لیے انسانی اعمال اور کرداروں کی زندگی کے مناظر نہایت واضح پس منظر میں پیش کرتا ہے۔ کرداروں کی جس قدر بھی سائنسی توجیہہ کرلی جائے ان پر داخلی و خارجی عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ جیسے محبت ایک بے کراں اور لامتناہی جذبہ ہے۔ ہر کردار کی باطنی زندگی میں حاوی ہوتا ہے۔ ہر کردار کہیں نا کہیں معاشرے کی اصلاح کرتا ہوا نظر آتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ ہر کردار بطور معلّم معاشرے کی فلاح و بہبود میں اپنا حصہ ڈال رہا ہے۔ یہ ناول نگار پر منحصر ہے کہ وہ ایک کردار کے ذریعے حقیقت سے کس قدر قریب ہوتا ہے عموماًیہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کردار کماحقہ مصنف کی ذہنی عکاسی نہیں کرپاتا لیکن اکثر اوقات اپنے ذہنی حالت کے مطابق کردار کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ محبت کے عنصر کے غالب ہونے کی یہ دووجوہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ای۔ ایم فارسٹر لکھتے ہیں:

''ناول نگار کرداروں کی خاکہ سازی سے فارغ ہو کر ان کی تخلیق کی ابتدا کرتا ہے تو محبت اپنے کسی ایک یا تمام پہلوؤں کے ساتھ اس کے ذہن پر چھا جاتی ہے اور وہ غیر

شعوری طور پر سہی، مگر کرداروں کو محبت کے غیر معمولی احساسات کا اسیر بنا دیتا ہے۔"(۴۰)

اہم ناول نگار ایسا کردار بناتا ہے جسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ عام طور پر ایسا ناول جس کا عنوان فرد کے نام پر ہو وہ کرداری ناول کی پہچان رکھتا ہے اور اسے اہمیت دیتا ہے۔ لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں ہے دلچسپ عنوان کے تحت بھی یادگار کردار جنم لیتے ہیں اور ہر کردار کسی نا کسی طرح معلّم کا کردار بھی نبھا رہا ہوتا ہے۔ معلّم کا کردار ہر ناول کا خاصہ ہے۔ مثلاً آگ کا دریا، گئودان، اداس نسلیں، نگری نگری پھرا مسافر، خون جگر ہونے تک، سنگم، آخر شب کے ہم سفر، گردش رنگ چمن، خدا کی بستی، چاکیواڑہ میں وصال، نادید، خواب رفو، باگھ، دیوار کے پیچھے، ایک چادر میلی سی، راجہ گدھ، غلام باغ، دائرہ، کئی چاند تھے سر آسماں وغیرہ۔ ان تمام ناولوں میں معلّم کا کردار پوشیدہ ہے وہ کسی نہ کسی طرح معاشرے کی اصلاح کر رہے ہیں۔

الغرض کردار کے ضمن میں مذکورہ محبت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہے کہ ناول کا کردار زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کا عکاس بھی ہوتا ہے اور معلّم بھی ہوتا ہے جو اپنی پیش کش کے ذریعے دیکھنے والوں یا سننے والوں یا پڑھنے والوں کو متاثر کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کردار کا ایجاد کرنا سائنسی ایجاد سے کم نہیں ہے۔ ہر مصنف اپنے نظام فکر کے شمس و قمر کو کرداری روپ میں ڈھال کر بطور معلّم پیش کرتا ہے۔ اور مسئلے کے مکمل ذائقے سے روشناس کراتا ہے۔ بحر حال نئے کردار کا واضح کرنا مشکل ترین مرحلہ ضروری ہے لیکن ناممکن ہرگز نہیں۔ ہر مصنف کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسا کردار وضع کر سکے جو حیرت و تفکر میں مبتلا کر دے یا کم از کم سوچنے پر مجبور کرے۔ کسی بھی ادیب کو سماج کی من جملہ صورتوں کا مکمل ادراک نہیں ہوتا لیکن جن پہلوؤں کا ادراک ہوتا ہے ان کی تفتیش و تہذیب کے لیے کردار کو وضع کرتا ہے جو کہانی کی اکائی بن کر سامنے آتا ہے۔ آج کا قاری بلاشبہ کردار کی نسبت کہانی اور مسائل میں زیادہ دل چسپی لیتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کردار کی تہہ داری اور پہلوداری کے ذریعے ہی وہ کہانی کو سبق آموز یا ممکنات میں سفر کرنے سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اس ضمن ہمارے ہاں لکھے جانے والے ناولوں میں بڑے موضوع کے طور پر اخلاقیات، آزادی، ہجرت، کرپشن، بدعنوانیاں، نفسیاتی و فکری الجھنیں جن میں طبقاتی اونچ نیچ برتے گئے ہیں اور کردار کے ذریعے افراد سماج کو ادراک کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور رغبت دلانے والے کردار کا بنیادی رول دراصل معلّم کا رول رہا ہے اس لیے یہ کہنا بعید از قیاس نہیں کہ فکشن کا ہر کردار فی نفسہٖ اپنے موضوع کا ے اعتبار سے پہلا اور آخری پہلو معلّم ہی ہوتا ہے۔ کرداروں کا زندہ رہ جانے کا اصل پس منظر بھی یہی ہوتا ہے کہ جس طرح

ایک طالب علم اپنے مثالی اساتذہ کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے اسی طرح فکشن کا قاری بھی جہاں سے مسائل کے حل کا ادراک کرتا ہے اُس متن کے کردار کو معلّم کے روپ میں ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔

ہ: منتخب ناولوں اور ناول نگاروں کا تعارف

i۔ "راجہ گدھ" از بانو قدسیہ

بانو قدسیہ کا شمار اردو ادب کے بڑے ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ بانو قدسیہ ۲۸ نومبر ۱۹۲۸ کو فیروز پور، ہندوستان کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ آپکے والد کا نام چوہدری بدرالزمان چٹھہ تھا، آپکی والدہ اور والد تعلیم یافتہ افراد تھے۔ بانو قدسیہ نے ابتدائی تعلیم بھارت میں اور پھر تقسیم کے بعد لاہور میں حاصل کی۔ انہوں نے کینئیرڈ کالج لاہور سے گرایجوایشن کی، اور پھر ۱۹۵۱ میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔

بانو قدسیہ کی شہرت ایک ناول نگار، ڈراما نگار اور ایک بڑے دانشور کی ہے۔ بانو قدسیہ کا تعلق چونکہ ایک علمی اور ادبی خاندان سے تھا اس لئے آپ کو تصوف سے گہری دلچسپی تھی۔ جس کا اظہار آپ کی تحریروں میں بجا طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ نے اردو اور پنجابی میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے بھی بہت سے ڈرامے لکھے ہیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کو بہت سے انعامات اور امتیازات سے نوازا ہے۔ بانو قدسیہ نے ۴ فروری ۲۰۱۷ کو، ۸۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کو ماڈل ٹاؤن قبرستان، لاہور میں دفن کیا گیا۔ آپ نے بے شمار کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، جن میں ان کا ناول "راجہ گدھ" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

"راجہ گدھ" کا شمار اردو ادب کے نمایاں اور بہترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ یہ ناول پہلی بار ۱۹۸۱ میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور سے چھپا۔ اور اب تک اس کے سیکڑوں ایڈیشنز چھپ چکے ہیں جو اس کی عوامی اور ادبی مقبولیت کا ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب میں بانو قدسیہ کو یوں متعارف کروایا ہے:

> " ۸۱۔۱۹۸۰ کو خواتین کے ناولوں کا سال قرار دیا جا سکتا ہے اور اس روایت کو بانو قدسیہ نے "راجہ گدھ" کی صورت میں آگے بڑھایا ہے۔ "(۴۱)

"راجہ گدھ" میں اچھائی اور برائی کے تصور کو حلال و حرام رزق سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے اور بہت خوبصورتی سے مغربی کلچر کی خامیوں کو بھی زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہانی کو روانی اور آسانی سے آگے بڑھایا گیا ہے اور قاری کی دلچسپی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار پروفیسر سہیل

ہے۔ مصنفہ نے اس کردار کے ذریعے سے معاشرے میں بہت سے منفی رویوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ قیوم، آفتاب اور سیمی کے لازوال کردار آج بھی فکشن کی دنیا کے جاندار اور زندہ کردار ہیں اور ناقدین ادب بانو قدسیہ اور "راجہ گدھ" کی فلسفیانہ بحثوں سے ابھی تک باہر نہیں نکل سکے۔ اور آج بھی ہر ناقد بانو قدسیہ اور "راجہ گدھ" کا معترف ہے۔ غفور احمد کی رائے کچھ اس طرح سے ہے:

> ''بانو قدسیہ کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، انہوں نے "راجہ گدھ" جیسے شاہکار ناول سے ادبی شہرت پائی۔ افسانہ، ڈراما، خاکہ، سوانح اور ناول نگاری میں ایک طویل تخلیقی فہرست ہے جو ان سے منسوب ہے۔''(۴۲)

عصر حاضر کے نمائندہ ناولوں پر بحث کرتے ہوئے روبینہ سلطان اس انداز سے بانو قدسیہ اور ناول پر بحث کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

> ''اس ناول کی قرآت سے اندازہ ہوتا ہے کہ بانو قدسیہ نے مادیت کی بجائے روحانی علاج تجویز کیا ہے۔ ان کا سارا ناول اسی تھیوری کے گرد گھومتا ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے اس ناول میں نیا پَن ہے، رزق حلال سے انسانی جینز (Genes) کی شکست و ریخت سے شخصیت کے ریزہ ریزہ ہو جانے والا ویژن ابھی تک ہمارے نقادوں کو ہضم نہیں ہوا۔ اور اس تھیوری پر ہنوز بحثیں جاری ہیں۔''(۴۳)

بانو قدسیہ نے "راجہ گدھ" کی بنیاد ایک سادہ سی اور رواں کہانی پہ رکھی ہے جہاں حلال و حرام کی تمیز کرتے ہوئے معاشرے میں الجھاؤ اور کرداروں کے رویوں میں تضاد کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح سے یہ تبدیلی معاشرے کی تبدیلی پر منتج ہوتی ہے۔ "راجہ گدھ" کے فلسفے کو سمجھاتے ہوئے مصنفہ نے اپنے کرداروں اور ان کے مکالموں کے ذریعے معاشرے کے تمام ذہنوں اور نظریات کو چھیڑ کر ان کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ مصنفہ نے بلاشبہ ایک بڑے موضوع کو اپنے فلسفیانہ انداز سے اس ناول میں سمویا ہے۔ اور یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اعلیٰ کرداروں سے ہی اعلیٰ معاشرے اور اعلیٰ نظریات پروان چڑھتے ہیں۔ اگر اس کی نفی کی جائے تو معاشرے بھی بگاڑ باعث بن جاتے ہیں۔ بلاشبہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ناول اپنے دور کا عکاس ہے اور معاشرے کی اور معاشرے کے تمام افراد کی اصلاح کا مواد اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

ii۔ "دیوار کے پیچھے" از انیس ناگی

ڈاکٹر انیس ناگی ۱۰ ستمبر ۱۹۳۹ کو شیخوپورہ میں پیدا ہوئے، آپ کے والدین نے آپ کا نام یعقوب علی ناگی رکھا، جو بعد میں ادبی نام "انیس ناگی" میں تبدیل ہو گیا۔ آپ کے والد کا نام ابراہیم ناگی تھا۔ انیس ناگی نے میٹرک کا امتحان گورنمنٹ مسلم ہائی سکول نمبر ۲ لاہور سے پاس کیا۔ پھر گورنمنٹ لاہور میں داخل ہو گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبی میگزین "راوی" کے مدیر بھی رہے۔ یہاں سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔ اے اردو کیا اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے ہی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز محکمہ تعلیم سے کیا بعد میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے سیکرٹریٹ میں ملازم ہو گئے۔

انیس ناگی نے شاعری، ناول، افسانہ، تنقید اور تراجم میں بے شمار کام کیا اور ہر صنف میں نام پیدا کیا۔ انیس ناگی نے جہاں جدید شاعری کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا ہے وہیں انہوں نے ناول کو بھی نئی روایت اور نئے سانچوں سے روشناس کرایا ہے۔ ان کے مشہور ناول "دیوار کے پیچھے" میں ایک انسان کے وجودی کرب کا تخلیقی انداز میں اظہار کیا گیا ہے۔ انیس ناگی کا یہ ناول ۱۹۸۰ میں پہلی بار شائع ہوا جس کے ناشر فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ لاہور ہیں۔ اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں:

> ''انیس ناگی کا "دیوار کے پیچھے" تنہائی کے زخم خوردہ اور ذہنی واہموں کے بھنور میں گھرے ایسے انسان کی کہانی ہے، جو دوسرے انسانوں سے سہارے کا طالب بھی ہے اور ان سے گریزاں بھی۔''(۴۴)

انیس ناگی کی بے شمار کتابیں شاعری اور تنقید پر موجود ہیں لیکن اردو ادب کے ناولوں میں ان کا ناول "دیوار کے پیچھے" یادگار ناول ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے اس پر تنقید کرتے ہوئے بجا لکھا ہے کہ:

> ''ناگی، وجودی فکر کے حامی رہے ہیں، اور پورا ناول اس طرز فکر کی بازگشت ہے۔ اور معاشرے کے باطن و خارج کا ایسا بیان ہے جو آج بھی باشعور اور سنجیدہ قاری کا پیچھا کرتا ہے۔''(۴۵)

انیس ناگی نے اس ناول میں ایک جدید ناول نگار کے طور پر اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ "دیوار کے پیچھے" میں نئے اسلوب سے کام لیا گیا ہے، جس میں اسٹیبلشمنٹ سے جڑے فتنے کی خوفناک کاروائیوں کو سامنے رکھا گیا ہے اور معاشرے میں موجود مختلف قسم کے جبر اور ناانصافی کو اس ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔ انیس ناگی نے اس ناول میں مرکزی کردار ایک پروفیسر کا لیا ہے جس کی شعوری سطح تو بہت بلند ہے لیکن وہ معاشرے میں موجود چال ڈھال

اور طور طریقوں کو بالکل بھی نہیں سمجھ پاتا اور بہت جلد بے بس اور مجبور ہو کر اپنے آپ کو اس ظالم معاشرے کے حوالے کر دیتا ہے جو نوچ نوچ کر پروفیسر کی جسم و جان اور روح کو بھی تڑپا دیتا ہے۔ پروفیسر ایسا کردار ہے جو اپنی تمام تر تعلیمی اور شعوری سطح کے باوجود معاشرے کے ہاتھوں یوں زلیل و خوار ہوتا ہے کہ اس کی تمام سطحیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ صبر، قناعت اور دوسری اخلاقی قدریں اس کے لئے بے معنی ہو جاتی ہیں اور وہ بہت سی مشکلات کو سہنے کے باوجود موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے لیکن یہاں پر ستم ظریفی یہ دیکھئے کہ موت بھی اس کا سہارا نہیں بنتی۔

انیس ناگی نے پاکستان کے معاشرے کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اپنی ذات، اپنے خاندان اور عزیز و اقارب کے ساتھ ساتھ اپنے مخلص دوستوں کو بھی اپنے سامنے بے بس اور لاچار پایا ہے جو سوائے مادیت پرستی کے کسی صفت سے مزین نہیں ہیں۔ انیس ناگی کے ناول میں تمام تر کردار اسی زندگی کے زندہ کردار ہیں جو اخلاق و اطوار اور مصروفیات زندگی میں ہماری ہی زندگی گزار رہے ہیں لیکن سچائی اور خودداری نام کی کوئی چیز ان کے ہاں نظر نہیں آتی جس کے باعث ناول کا مرکزی کردار پروفیسر صرف خود ہی ناکام نہیں ہوتا بلکہ اپنے گردو پیش تمام کردار بھی اسے زلیل و خوار ہوتے نظر آتے ہیں۔ آخر کار پروفیسر بھی انہی کی طرح ہونے میں عافیت سمجھتا ہے۔

مجموعی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ انیس ناگی نے اپنے ناول میں جس نئے اسلوب اور فکر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ ایک نیا انداز ہے لیکن یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کی ادبی پذیرائی اس انداز سے نہیں ہوئی کہ جس کا یہ ناول حق دار ہے۔ انیس ناگی کے ناول کو پڑھنے کے بعد فوری طور پر خیال انگریزی ناولوں کی طرف جاتا ہے، جن میں یہ نئی ہئیت اور نیا اسلوب اپنایا گیا ہے، خود کلامی کا سہارا لے کر ناول نگار نے اپنی ساری کہانی احمد کے ذریعے سے بیان کر دی ہے جو کہ جدید انگریزی ناول کا خاص اسلوب ہے۔ لیکن ہم اس نئے اسلوب اور ہئیت کے باوجود انیس ناگی کے ناول کو اول درجے کا ناول گردانتے ہیں۔ جس نے اردو ناول کی دنیا میں بہر حال اپنا خاص مقام پایا ہے۔

iii۔ "جنم کنڈلی" از فہیم اعظمی

فہیم اعظمی کا اصل نام سید باقر رضوی تھا، آپ ۱۹۳۵ میں اعظم گڑھ، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ، الہٰ آباد، لاہور اور کراچی میں حاصل کی۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان ائیر فورس میں ملازم ہو گئے، اور اس ملازمت کے سلسلے میں زیادہ قیام سعودی عرب میں کیا۔ فہیم اعظمی اردو ادب کے بڑے ناول نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے ناول کے روایتی فکری سانچے کو یکسر تبدیل کر دیا، اور ناول کو نئے دور کے نئے فکری مباحث سے روشناس کرایا۔ آپ نے ادبی رسالے "صریر" کو اپنی ان ادبی سرگرمیوں کے لئے وقف کئے رکھا، جس کی بدولت رسالہ "صریر" بھی نئے ادبی نظریات و مباحث کا علمبردا ٹھہرا۔ فہیم اعظمی مدت تک کراچی سے ادبی جریدے "صریر" کے مدیر رہے اور انہوں نے ۱۴ جولائی

۲۰۰۴ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ فہیم اعظمی کا شمار ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے شاعری اور ناول نگاری کو نئی حیثیت سے متعارف کرایا۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان، فہیم اعظمی کے طرزِ تحریر پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "۱۹۸۴ میں فہیم اعظمی جو زیادہ تر ابلاغ کا مسئلہ پیدا کرنے والے افسانے لکھتے تھے، اچانک ناول نگار کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اس میں ہیئت بالکل ہی توڑ دی اور اس کو ایسے عجیب و غریب تجرباتی بیانیہ میں ملفوف کر کے پیش کیا کہ اسے کسی بھی صفحے سے پڑھ کر کسی بھی صفحے پر ختم کرنے سے ان کا نقطہ نظر قاری کے ذہن سے محو نہیں ہوتا۔"(۴۶)

کائنات میں رہتے ہوئے انسان کچھ نہ کچھ سیکھنے کی تگ و دَو میں لگا رہتا ہے، چونکہ انسانی سرِیشت میں لکھا ہے کہ اسے جستجو اور کوشش سے جوڑ دیا گیا ہے اور وہ اسی لئے کائنات میں کچھ نہ کچھ کرنے کا خواہاں نظر آتا ہے۔ اسی کوشش اور جستجو کے نتیجے میں اسے مختلف تہذیبوں اور مختلف معاشرتی تقاضوں سے واسطہ پڑتا ہے اور مختلف مسائل اور مشاہدات سے گزرتا ہے۔ جس میں احساسات و نظریات کی تپش بھی شامل ہو جاتی ہے جو اس کی زندگی اور کائنات کو متاثر کرتی ہے۔ اسی طرح کے احساسات و مشاہدات اس ناول کا بنیادی ڈھانچہ فراہم کرتے ہیں۔

"جنم کنڈلی" پہلی بار الباقر یہ پبلی کیشنز، حسرت موہانی روڈ، کراچی سے ۱۹۸۴ میں چھپ کر ادبی دنیا میں سامنے آیا۔ جس نے فکشن کے روائیتی سانچوں کو توڑ کر رکھ دیا اور جدید مغربی تنقیدی افکار کو اردو ادب میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ اس ناول میں زندگی، فرد اور معاشرے کو سمجھنے کے لئے متنوع زاویوں سے روشنی ڈالی گئی۔ فہیم اعظمی نے اردو ادب میں نئے تنقیدی نظریات کو متعارف کروا کے اس میں نئے نئے مباحث اور جدید تھیوریز کو جگہ دی ہے۔ انہوں نے جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، قاری اساس تنقید اور ان کے علاوہ اردو کی لسانی اور عمرانی تنقید کو نئے مباحث سے آشنا کر دیا۔ فہیم اعظمی کا ہاں فرد، معاشرہ، کائنات، وقت اور نظریات ایک ساتھ دائرے میں چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

فہیم اعظمی ایک اعلیٰ درجے کے ادیب ہیں۔ ان کا مطالعہ کائنات کے سب پہلوؤں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، انہوں نے جہاں ایک علمی اور ادبی ماحول میں پرورش پائی، وہاں اس ماحول سے پوری طرح آشنائی اور بصیرت حاصلی کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے انسانی تاریخ، انسانی فلسفہ اور انسانی علوم سے جی بھر کر عطر کشید کیا ہے۔ اور اس کشید گی کے عمل میں اپنے احساسات و خیالات کو وقت کے دائرے میں یوں تبدیل

کیا ہے کہ زمانے اور ادوار کی کہانی اور ان کے احساسات و نظریات کی کہانی ایک ساتھ قلب و روح کو پریشان کر دیتی ہے۔ مصنف نے مختلف ابواب میں، مختلف ادوار کو، مختلف رویوں میں یوں بیان کر دیا ہے کہ کہانی اول سے آخر اور آخر سے شروع تک ایسا روپ دھار جاتی ہے کہ جس کو جہاں سے جی چاہے دیکھ لیا جائے تو کہانی مکمل کی مکمل نظر آتی ہے۔

مصنف نے مرکزی کردار "ماسٹر جی" کے ذریعے زندگی کے تصور کو کائنات کے تصور کے ساتھ یوں جوڑ دیا ہے کہ ماسٹر جی اور مصنف کی خود کلامی کائنات کے سب دائروں کو آپس میں ملا دیتی ہے اور کائنات کے سب راز ایک ایک کر کے زندگی کے دائرے پر عیاں کر دیتی ہے۔ یہی خود کلامی سارے ناول کو اپنے حصار میں لئے ہوئے ہے اور اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ زندگی کے گزارنے کے لئے بہت سے معاملات سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک اچھے ناول نگار کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی فکری روایت کے ساتھ ان مسائل کے حل کا ادراک رکھتا ہو۔ جب ہم اس پیمانے پر اس ناول کو پرکھتے ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فہیم اعظمی کو اپنے گرد و پیش کے مسائل کا ادراک بھی ہے اور اپنی فکری روایت کو سامنے رکھتے ہوئے ان کو حل کرنے میں بھی کمال رکھتے ہیں، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا قاری بھی ان مسائل سے آشنا ہو۔ فہیم اعظمی کا قاری عام قاری نہیں بلکہ خاص ہے، جو اس کے ساتھ ساتھ حالات و واقعات کا ادراک رکھتا ہے۔ فہیم اعظمی نے زندگی کے سارے فلسفے کو، کائنات کی ساری رعنایوں کو اپنے خاص دائروں کے ذریعے قاری پر عیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے انتہائی کمال درجے کی مہارت سے اپنے فلسفیانہ مسائل کو اور اپنے تنقیدی نظریات کو فرد اور معاشرے سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اور انسانی زندگی کی کہانیوں کو فلسفیوں کی نظر سے بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

"جنم کنڈلی" بلاشبہ فہیم اعظمی کا ایک شاہکار ناول ہے، جس میں انسانی زندگی کے تمام تضادات اور زندگی کے تمام مسائل بیان بھی کر دیئے گئے ہیں اور ان کا حل بھی بتا دیا گیا ہے۔ اور یہی زندگی کا روپ اور فلسفہ بھی ہے۔ جس کی وجہ سے اردو ادب میں ایک نئی رِیت اور بحث نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔

iv۔ "آدھے ادھورے خواب" از شاہد صدیقی

ڈاکٹر شاہد صدیقی کا شمار عصر حاضر کے بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ شاہد صدیقی ۲۱ دسمبر ۱۹۵۷ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم راولپنڈی سے ہی حاصل کی۔ ایف۔ جی سرسید کالج مال روڈ سے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا اور بعد میں گارڈن کالج راولپنڈی سے انگریزی زبان و

ادب میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ دیر بطور استاد انگریزی کی تعلیم بھی دیتے رہے اور پھر ادبی اور صحافتی دنیا میں بڑا نام حاصل کرنے کے بعد مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیمی خدمات سر انجام دینے کے بعد آج کل بیرون ملک مقیم ہیں۔ اور ملک وملت کے لئے اپنے قلم اور دل ودماغ کو صَرف کر رکھا ہے۔ اور روشن مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجا رکھے ہیں۔

شاہد صدیقی کا ناول "آدھے ادھورے خواب" اکیسویں صدی کے خوابوں کا ترجمان ہے۔ اکیسویں صدی جو کہ سیاسی بیداری اور ادبی شعور کی بیداری کی صدی ہے، اس نے جدید سائنس اور جدید مغربی تاثرات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ یہ ناول بھی بنیادی طور پر اسی طرح کی سیاسی بیداری، ادبی شعور اور اقتصادی نظام کی تبدیلی کا ناول ہے۔ پاکستانی معاشرہ اپنی تمام ترجدت کے باوجود عدالتی بحران، سیاسی انتشار، معاشرتی لاقانونیت اور بنیادی حقوق کی پامالی جیسے اجزاء سے بھرا پڑا ہے اور جس میں بہتری کی کوئی کرن نظر نہیں آتی ایسے میں مصنف شاہد صدیقی ایسے خواب دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے جس میں خوبصورت نظریات، اعلیٰ ترین محبت، بہترین قربانی خواہ وہ مال کی ہو، جان کی ہو، مرتبہ کی ہو، اپنے معاشرے میں ان ضابطوں کو رائج ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، جو مصنف کی بدحواسی کو کم کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مصنف نے اجتماعی زندگی کو "آدھے ادھورے خواب" کی صورت میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اگر ہم بیسویں صدی کے ادب کا مطالعہ کریں تو اس میں بہت تباہ کاریاں، نوآبادیاتی تسلط، سامراجی خدوخال میں تبدیلی اور اجتماعی ادب اور زندگی کی بدلتی ہوئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ ایسے میں ایک زیرک اور دانا ادیب اپنے عہد کے لہجے میں تبدیلی کا خواہاں ہے اور چاہتا ہے کہ نئی صدی، نئے ارمانوں اور نئے خوابوں کی صدی ہو، لیکن جب وہ اپنی خواہشوں کو نامکمل ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو اپنے تمام ارمان، نظریات اور افکار کو اگلی نسل میں منتقل کرنا چاہتا ہے جس کے لئے اس نے ایک استاد کا روپ دھارا ہے اور پروفیسر سہارن رائے کی صورت میں ایک اعلیٰ معاشرے کی تصویر اور اس کی عملی صورت پیش کی ہے۔

پروفیسر سہارن رائے اس ناول کا مرکزی کردار ہے، جو استاد کی بہترین اور اعلیٰ خوبیوں سے مصلح ہے اور اس بات کو سمجھتا ہے کہ طالب علموں تک اپنے مافی الضمیر کو کیسے پہنچانا ہے۔ وہ کلاس میں بیٹھے ہوئے بند دماغوں کو بھی وا کرنے کا فن جانتا ہے اور بغیر کسی تکلیف کے مشکل خیالات وافکار کو طلبہ کے لئے آسان اور عام فہم بنا دیتا ہے۔ ایک استاد کے لئے ضروری ہے کہ اسے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کا فن آتا ہو، تب ہی اپنی بات طالب علموں کو سمجھا پائے گا۔ لیکن یہاں پر پروفیسر سہارن رائے صرف انہی خوبیوں

سے واقف نہیں ہے بلکہ وہ ایک اعلیٰ ترین استاد کے رتبے پر فائز ہے اور کلاس کے سب لوگ اس جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں جو نئی راہوں اور نئے نظریات کے حامل افراد شمار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی افراد ہیں جو ایک جامد معاشرے میں نئی قدروں کے آغاز کرنے والے ہوتے ہیں۔

استاد معاشرے کا اہم ترین فرد ہوتا ہے، اس لئے کہا جاتا ہے کہ قوم کی تقدیر بھی اساتذہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ پروفیسر سہارن رائے کو اس بات کا احساس ہے کہ کلاس کا ہر طالب علم اہم ہے اور ملت کے مقدر کا ستارہ ہے، اس لئے وہ کوئی موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جس میں طالب علموں کی اصلاح اور سوچ کو بیدار کرنے کا پہلو ہو۔ پروفیسر سہارن رائے نے ناول کا آغاز ایک کلاس روم سے کیا ہے اور اپنی بحث کا آغاز پھول کی پتیوں پر تجربہ کرنے سے کیا ہے اور ساتھ ہی پوری کلاس کو اپنا اپنا پھول اور پتیاں پیش کرنے کا ٹاسک بھی دیا ہے۔ چونکہ جو طالب علم اپنے خواب اور پھول سے واقف نہیں ہو گا وہ زندگی کے سماجی بندھنوں کو بھی نہیں سمجھ پائے گا، جس کے لئے مصنف نے ماحول دوست رویہ اپنانے کی کوشش کی ہے اور جب ہم یہ ماحول دوست رویہ کلاس اور کلاس سے باہر معاشرے میں وسیع ہوتا ہوا دیکھتے ہیں تو معاشرتی قدروں میں نکھار آجاتا ہے۔ جب یہ رویہ ماند پڑتا ہے تو انسانی معاشرہ بحرانوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان سخت رویوں کو مصنف نے نرم انداز میں پیش کر کے اپنی کلاس کو متحرک کر دیا ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر رشید امجد نے ان کی تعریف یوں کی ہے کہ:

> ”ان کے اسلوب میں فلسفیانہ اور علمی دبازت ہے، لیکن بوجھل نہیں بلکہ بہت ملائم اور شائستہ۔ سب سے بڑی خوبی یہ کہ کہانی خود کو پڑھواتی ہے جو کسی فن پارے کی بنیاد ہوتی ہے۔“(۴۷)

شاہد صدیقی نے انصاف اور آزادی کے خواب دیکھے ہیں، جس کے لئے ناول کی تکنیک اور ناول کے قارئین کو منتخب کیا ہے۔ ناول کے تین کردار اہم ہیں، جن میں پروفیسر سہارن رائے، امتثال آغا اور تصور، ہیں۔ مختصر کرداروں کے ساتھ بڑی کہانی بیان کرنا ایک مشکل فن ہے لیکن ڈاکٹر شاہد صدیقی نے ایک خوشگوار اور دلکش انداز میں خوابوں کی ساری کہانی بیان کر دی ہے۔ ایسے خواب جو ارفع و اعلیٰ بھی ہوں اور معاشرے میں تبدیلی کا باعث بھی بنیں اور جن کے لئے لوگ اپنی جانوں کا نظرانہ پیش کرنے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ یقینی طور پر بڑی فنکاری کا کام ہے، جس میں مصنف نے پوری طرح کامیابی دکھائی ہے۔ مصنف نے

اپنے معاشرے کی تمام تر خرابیوں اور تمام تر اچھائیوں کا ذکر کر کے معاشرے کے افراد کو ایک سیدھے راستے پر گامزن کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عشرت حسین بصری، تعلیم اور مغربی مفکر (طبع چہارم)، جناح بک سنٹر، ملتان، ۲۰۰۱ء، ص ۳۰

۲۔ ایضاً، ص ۵۳

۳۔ ایضاً، ص ۲۷

۴۔ محمد عثمان، پروفیسر، نئے تعلیمی تقاضے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۷۵ء، ص ۱۲۸

۵۔ سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ (جلد سوم)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۳۷۴

۶۔ محمد عبد اللہ خان، خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۵۹۷

۷۔ سید تصدق حسین رضوی، مولوی، لغات کشوری (فارسی اردو)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۳۹۳

۸۔ وارث سرہندی: ''علمی اردو لغت (جامع)''علمی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳، ص ۱۴۰۴

۹۔ لالہ رام نرائن لال، لغاتِ فارسی، لالہ رام نرائن لال بک سیلر و پبلیشر، الہٰ آباد، ۱۹۳۱ء، ص ۹۷۷

۱۰۔ راجیسور راؤ اصغر ،راجہ، ہندی اردو لغت (جلد دوم)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۱۸۶-۱۴۰

11. E.L Thorndike, Seott, Foresman Advanced ,Dictionary, Foresman and company, Glenview illionis, America, 1941, page 1044

۱۲۔ وارث سرہندی، قاموس مترادفات (طبع چہارم)، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۰۰۶

۱۳۔ سید تصدق حسین رضوی، مولوی، لغات کشوری (فارسی اردو)، ص ۳۹۳

۱۴۔ نورالحسن نیّر، مولوی، نوراللغات (جلد دوئم، طبع سوم)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۹۳

۱۵۔ قاضی جاوید، روسو، مشعل بکس، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۸۵

۱۶۔ عشرت حسین بصری، تعلیم اور مغربی مفکر (طبع چہارم)، ص ۱۰۹-۱۱۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۱۸۔ محمد عیسی خان، تعلیمی فلسفہ اور تاریخ، عملی کتاب خانہ، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۲۲۹

۱۹۔ عشرت بصری، تعلیم اور مغربی مفکر، ص۲۳۹

۲۰۔ ذاکر حسین، ڈاکٹر، تعلیمی خطبات، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۱ء، ص۱۵۶

۲۱۔ جے کرشن مورتی، تعلیم اور زندگی کی اہمیت، ادارۂ انیس اردو، الہ آباد، ۱۹۶۰ء، ص۲۰

۲۲۔ محمد اکرام قریشی، پروفیسر، فلسفہ و تاریخ تعلیم (طبع ششم)، مجید بک ڈپو، فیصل آباد، ۱۹۸۲ء، ص۶۳

۲۳۔ ایضاً، ص۶۴-۶۵-۶۶

۲۴۔ یوسف شیدائی، پروفیسر، مسلم فلسفہ، عزیز پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۱۴۰

۲۵۔ محمد اکرام قریشی، پروفیسر، فلسفہ و تاریخ تعلیم، ص۱۰۴-۱۰۵

۲۶۔ احمد شبلی، ڈاکٹر، تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص۱۶۵-۱۶۶

۲۷۔ مصطفیٰ علی خاں، معاشرہ، سکول اور اُستاد، مجید بک ڈپو، فیصل آباد، ۱۹۸۳ء، ص۳۱۳

۲۸۔ عابد علی عابد، سیّد، انتقاد ادبیات، سنگ سیل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص۲۱۰-۲۱۱

۲۹۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، ص۳۸۸

۳۰۔ عابد علی عابد، سیّد، اصول انتقاد ادبیات، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص۵۹۰-۵۹۱

۳۱۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۳۹۱

۳۲۔ عابد علی عابد، سیّد، انتقاد ادبیات، سنگ سیل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص۲۰۸-۲۰۹

۳۳۔ سیّد وقار عظیم، سیّد، داستان سے افسانے تک، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص۱۳۶-۱۳۷

۳۴۔ ولیم شیکسپیئر، ہیملٹ، مترجم، فراق گورکھپوری، ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء، ص۱۴

۳۵۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کرداروں کا حیرت کدہ، فضلی سنز، کراچی، ۲۰۱۵ء، ص۱۵

۳۶۔ ایضاً، ص۲۵

۳۷۔ ایضاً، ص۲۸

۳۸۔ محمد یسین، ڈاکٹر، ناول کا فن اور نظریہ، خدا بخش پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۲ء، ص۱۴

۳۹۔ ایضاً، ص۱۷

۴۰۔ ای۔ ایم فارسٹر، ناول کا فن، مترجم ابوالکلام قاسمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء، ص۳۶-
۳۷

۴۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص۶۹۰

۴۲۔ غفور احمد، نئ صدی۔نئے ناول، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، دارالنوادر، کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۲۴۹

۴۳۔ روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، دستاویز، ۱۵۹۔ سی۔ چناب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۴۳

۴۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص۶۸۷

۴۵۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۱۵۷

۴۶۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۱۶۷

۴۷۔ شاہد صدیقی، "آدھے ادھورے خواب"، جہانگیر بکس، فیصل آباد، ۲۰۰۹ء، فلیپ

باب دوم

منتخب ناولوں میں معلّم بطور فلسفی کی پیشکش کا مطالعہ

فلسفہ علم و آگہی کا علم ہے، یہ ایک ہمہ گیر علم ہے جو وجود کے اغراض و مقاصد دریافت کرنے کی سعی کرتا ہے۔ فلسفہ کو ان معنوں میں ''ام العلوم'' کہہ سکتے ہیں کہ یہ موجودہ دور کے تقریباً تمام علوم کا منبع و ماخذ ہے۔ اب اگر وہ دین ہو تو فلسفہ دین، اگر تاریخ ہو تو فلسفہ تاریخ، اگر اخلاق ہو تو فلسفہ اخلاق، اگر محبت ہو تو فلسفہ محبت، نفرت ہو تو فلسفہ نفرت، عشق ہو تو فلسفہ عشق، اگر وجود ہو تو فلسفہ وجود کہا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ریاضی، علم طبیعیات، علم کیمیا، علم منطق، علم نفسیات، معاشرتی علوم سب اسی فلسفے کے عطا کردہ ہیں۔ اس کو مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے:

i. مابعد الطبیعیات (Metaphysics)

ii. علمیات (Epistemology)

iii. جمالیات (Aesthetics)

iv. اخلاقیات (Ethics)

v. منطقیات(Logic)

لغوی طور پر زندگی کے ان مشکل ترین سوالات جن سے انسان کا ہمیشہ واسطہ رہا ہے، محتاط اور پر مشقت تجزیہ کا نام ہے۔ سوالات کرنا فلسفے کا اہم طریقہ کار ہے فلسفہ صرف اس لئے سوالات نہیں کرتا کہ وہ جوابات تلاش کرے بلکہ اس لئے اس مخصوص طرز عمل کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ مزید سوالات کرتا جائے اور مسائل کی تہہ تک پہنچے، فلسفہ کے نزدیک سوالات کرنے کا رجحان اور صلاحیت پیدا کرنے کے دو فائدے ہیں اوّل یہ کہ ان مسائل کے بارے میں ہمارے نظریات میں وسعت پیدا ہو اور دوسرا قیاس آرائی وہ مستقبل بینی کے خلاف ذہن کو پراگندہ کرتی ہے کم ہو جائے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ فلسفہ علم کا وہ شعبہ ہے جو حقیقت متعلقہ اور اشیاء کی عمومی وجوہات اور ان کے قوانین سے بحث کرتا ہے اور تہہ تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

قدیم دور میں افلاطون کو عظیم فلسفی کی حیثیت حاصل ہے اور انہوں نے علم کے بارے میں جو خیالات پیش کیے وہ بھی تحسین کے لائق ہیں۔ ان کے دیے گئے نظریات اور مفروضات کی بنا پر اس کے معاشرے کو مثالی معاشرے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ افلاطون کو ایک فلسفی کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ افلاطون کے متعلق بہت سے دانش وروں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔شاہد مختار اپنے مضمون ”افلاطون کے نظریات“ میں فلسفی اور علم کے متعلق یوں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

”سچا علم وہی ہے جو حکمت کے تصورات پر مبنی ہو اور سچا فلسفی وہی ہے جو اپنے افکار سے کردارِ انسانی کے لیے بصیرت مہیا کرے۔اس عظیم فلسفی کا نام افلاطون ہے جس نے منطقی بازی گری کا گُر سقراط سے سیکھا تھا۔“(۱)

کسی بھی معلّم کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ وہ اپنے علم کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے زیر بحث تدریسی مواد کو فلسفیانہ سطح پر پرکھنے کا ہنر اپنے طلبہ کو سکھائے۔ یہاں پر معلّم کو بطور فلسفی جاننے سے پہلے انتہائی اہم امر یہ ہے کہ فلسفہ کے معنی و مفہوم کو سمجھ لینا چاہیے۔ ہم مختلف حوالوں سے فلسفہ کا معنی و مفہوم واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان پاکستان کے زیر اہتمام شائع ہونے والی محمد عبد اللہ خان خویشگی کی انتہائی مستند لغت ”فرہنگ عامرہ“ کے مطابق فلسفہ کا مفہوم ہے کہ:

”حکمت و دانش مندی، علم اشیائے موجودات مع علت و اسباب“(۲)

اردو زبان و ادب کی انتہائی مقبول لغت ”فرہنگ آصفیہ“ کے مطابق فلسفے کا معنی حسب ذیل ہے:

”حکمت، دانائی، دانش مندی، علم، حکمت، ات جوگ، علم موجودات، حکیم یا دانش مند ہونا (جعلی مصدر لفظ ’فیلا سوفا‘ سے بنا لیا گیا ہے) لفظ اول بمعنی محب و ثانی بمعنی حکمت یعنی حکمت دوست“(۳)

مقتدرہ قومی زبان پاکستان کی شائع کردہ ”فرہنگ تلفظ“ میں شان الحق حقی فلسفہ کے معنی یوں بیان کرتے ہیں:

”حقائق ادبی کو علم کی روشنی میں عقل و استدلال کے ذریعے دریافت کرنے کی کوشش، غور و فکر، کسی علم کے بنیادی اصول و حقائق“(۴)

الحاج مولوی فیروز الدین کی مرتب کردہ لغت فیروز سنز لاہور سے شائع کی گئی اس لغت میں فلسفہ کا معنی یوں بیان کیا گیا ہے:

"علم و حکمت۔ علم موجودات، حکمت، دانائی۔"(۵)

مندرجہ بالا مفاہیم کی روشنی میں فلسفہ کی جامع تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ "فلسفہ دراصل شعور ہی کا دوسرا نام ہے۔" اردو کی مذکورہ لغات کے حوالہ سے فلسفہ کے تقریباً تمام تر مفاہیم درحقیقت شعور پر مجتمع ہوتے ہیں۔ واضح ہوا کہ فلسفہ ایسے علم کو کہتے ہیں جس میں اشیاء کے وجودات خارجی و حقیقی کے متعلق انسانی قوت کے مطابق بحث کی جاتی ہے۔ دنیا میں موجود تمام چیزوں کی حقیقت تک پہنچنے کا علم فلسفہ ہے۔

فلسفہ کسی بھی شے کے متعلق اٹھنے والے بنیادی سوالات کا جواب فراہم کرتا ہے۔ پشتو کے اک شعر کا مفہوم ہے کہ ہر چیز کی حقیقت دیکھو بس یہی فلسفہ ہے، اور قدیم دور میں افلاطون کے نظریات کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ افلاطون کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلیمی فلسفہ شروع سے لے کر آخر تک سیکولر تھا۔ اس نے تعلیم کے لیے "باقاعدہ تعلیمی فلسفہ" پیش کیا۔ اس بارے میں اقبال خان اپنی تالیف "جدید تعلیمی فلسفے" میں یوں رقم طراز ہیں:

> "باقاعدہ تعلیمی فلسفہ" سب سے پہلے ہمیں افلاطون کے یہاں ملتا ہے، وہ پہلا فلسفی ہے جو انسانی فطرت اور معاشرے کے متعلق ایک واضح اور مربوط تھیوری پیش کرتا ہے او پھر اس تھیوری سے تعلیم کے لیے نتائج اخذ کرتا ہے مزید یہ کہ تعلیم کے متعلق اس کا نظریہ عمومی نوعیت کا نہیں، بلکہ اس میں نصاب، تدریسی طریقوں اور تعلیم کے ایڈمنسٹریشن کے متعلق الگ الگ سفارشات ہیں۔"(۶)

تاریخ فلسفہ شاہد ہے کہ جب کبھی لوگوں نے فلسفیانہ بحث کی تکنیک کی اہمیت سے الگ ہو کر مسائل کے عمیق مطالعہ کی خواہش کی تو انھوں نے ہمیشہ تعلیم کے طرف رخ کیا درحقیقت تعلیم اس مقصد کے لیے نہایت موزوں مقام رکھتی ہے جان ڈیوی کے نزدیک فلسفہ کا تمام تر عمل تعلیم ہی سے تکمیل پاتا ہے۔ ڈیوی کا فلسفہ تعلیم اس امر پر شاہد ہیں کہ وہ تعلیم کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتا تھا۔ اس بارے میں وردہ بلوچ اپنے مضمون "فلسفی اور ماہر تعلیم جان ڈیوی" میں یوں قلم فرسائی کرتی ہیں:

> "تعلیم کے شعبے میں ڈیوی کی عملی سرگرمیوں میں سے ایک یہ تھی کہ اس نے شعبہ تعلیم قائم کیا اور ایک تجرباتی سکول بنایا جس میں تعلیم سے متعلق فلسفیانہ اور نفسیاتی اصولوں کو جانچا جاسکتا تھا۔ یہ سکول ۱۸۹۶ء میں قائم ہوا تھا۔ اس نے دور دور شہرت حاصل کرلی تھی اور ترقی پسند نقطہ نظر کا اہم مرکز بن گیا تھا۔"(۷)

ڈیوی کی کتابیں ''سکول اینڈ سوسائٹی'' اور دوسری کتاب ''چائلڈ اینڈ ایجوکیشنل سلیبس'' کو ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔اس نے بچے کی دل چسپی کو اپنانے کی بات کی ہے کہ بچوں کو وہ تعلیم دی جائے جس طرف ان کے دماغ پہلے سے چلنے کی کوشش کر رہا ہو یا جن چیزوں کو وہ جلدی سمجھ لیتا ہو۔ وردو بلوچ اپنے مضمون میں ان کی کتابوں اور نظریات کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''تعلیم کے متعلق ڈیوی کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔'' سکول اینڈ سوسائٹی'' اور دوسری ''چائلڈ اینڈ ایجوکیشنل سلیبس'' جس میں اس نے تعلیم پر اپنے فلسفے سے بحث کی ہے ان میں یہی بتایا ہے کہ تعلیم کے شروعات بچے کی دل چسپی سے ہونی چاہیے اور اس پر آئندہ تعلیم کی بنیاد رکھنی چاہیے، اُستاد کو ساتھی اور راہنما ہونا چاہیے، سخت گیر اُستاد نہیں ہونا چاہیے اور جو بس سبق پڑھاتا اور رٹاتا ہے، پانچویں تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم ہر سمت اور پہلو میں ترقی کرے۔''[۸]

روس میں اشتراکی نظریات کو پھیلانے کے لیے بچوں اور جوانوں کو کارل مارکس کے اصولوں کی تعلیم دی گئی جب کبھی حکما حصول مقاصد کے لئے کوئی تعلیمی پروگرام پیش کرنے میں ناکام رہے تو ان کے بعد آنے والوں نے دیکھ لیا اور سمجھ لیا کہ فلسفہ اور تعلیم میں ربط و مطابقت کی اشد ضرورت ہے، یونانی نفس مضمون کے علاوہ طریقہ تعلیم دین کی سچائی اور حسن کو شامل کرنے کے حق میں تھے اور نصاب میں ان کے شامل کرنے کی مکمل حمایت کرتے تھے خود ہمارے ہاں پاکستانی فلسفہ حیات اور نظریہ تعلیم میں ایک گہرا ربط موجود ہے چنانچہ پانچ سالہ منصوبوں کے پیش لفظ میں یہ سوچ موجود ہے کہ پاکستان کے تمام تر سیاسی اور سماجی جدوجہد کا مقصد مساوات کے ایسے نظام کا قیام ہے جو ہماری ثقافتی و مذہبی اقدار سے متصادم نہ ہو اور اس مقصد کے حصول میں سب سے اہم کردار ہمارا نظام تعلیم ادا کرے گا۔

فلسفہ اپنے دائرہ کار پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ علم کی دیگر شاخوں کے بنیادی فرضیات کو بھی زیر غور لاتا ہے جب فلسفے اپنی توجہ سائنس کی طرف کرتا ہے تو ہم سائنس کے فلسفہ پر غور کرتے ہیں جب یہ قانون کے بنیادی تصورات کا جائزہ لیتا ہے تو یہ قانون کا فلسفہ ہوتا ہے اور جب یہ تعلیم سے تعلق پیدا کرتا ہے تو یہ تعلیمی فلسفہ یونانی فلسفہ تعلیم کہلاتا ہے جیسے عمومی فلسفہ بالکل عام اور ترتیب وار طریقے سے وضاحت کر کے حقیقت کو بحیثیت کل سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح تعلیمی فلسفہ تعلیم کو مکمل طور پر اور تشریحی انداز میں سمجھتے ہوئے مختلف تصورات کو سمجھتا ہے جو کہ ہماری تعلیمی پالیسی اور مقاصد کے انتخاب میں راہنمائی

فراہم کرتا ہے اس طرح عمومی سائنس کے نتائج کو مربوط کرتا ہے تعلیمی فلسفہ ایسے نتائج کی تشریح کرتا ہے جو تعلیم پر اثر انداز ہوتے ہیں سائنسی نظریات براہ راست تعلیمی مقاصد کو نہیں لیتے ان کو تعلیمی مشق یا تدریسی عمل کے دوران استعمال نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ ان کا فلسفیانہ طور پر جائزہ نہ لیا جائے تعلیمی فلسفہ کا انحصار عمومی فلسفے پر اس حد تک ہے کہ تعلیم کے مسائل عام طور پر فلسفیانہ نوعیت کے ہیں ایسے عام فلسفیانہ مسائل پر غور کیے بغیر ہم تعلیم کی پالیسی پر تنقید نہیں کر سکتے یا نئی پالیسی تجویز نہیں کر سکتے:

ا۔ بہتر زندگی کی نوعیت جس کی جانب سے تعلیم ہماری رہنمائی کرے۔

ب۔ انسان کی اپنی فطرت کیوں کہ یہ انسان ہی ہے جس کو ہم تعلیم دے رہے ہیں۔

ج۔ معاشرے کی نوعیت کی تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے۔

د۔ تعلیمی فلسفے میں دیگر چیزوں کے علاوہ عام فلسفے کو بھی تعلیم کے میدان میں استعمال کرتا ہے یعنی تعلیمی فلسفہ بھی تعلیم کے تجربات سے اخذ کیا جاتا ہے۔

عام فلسفے کی طرح تعلیمی فلسفہ بھی سیاسی تجزیاتی اور ہدایاتی ہے یہ قیاسی ہے جب یہ انسانی فطرت اور معاشرے سے متعلق نظریات قائم کرتا ہے جس سے انسانی رویے سے متعلق سائنس اور تعلیمی تحقیق کے مطابق اعداد و شمار کو ترتیب میں لانا اور ان کی تشریح کرنا شامل ہوتا ہے اور یہ ہدایاتی ہے جو ایسے مقاصد کا تعین کرتا ہے جن کو تعلیم کے ذریعے حاصل کرنا ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے کام آنے والی عمومی ذرائع مہیا کرتا ہے تجزیہ کرنے والا ہمارے تعلیمی تصورات کی معقولیت کو جانتا ہے دیگر تصورات سے ان کے تواتر کو دیکھتا ہے اور ان طریقوں پر غور کرتا ہے جو ناقص سوچ کے باعث مسخ ہو جاتے ہیں وہ ہمارے تصورات کے منطق کو جانتا ہے اور یہ جائزہ بھی لیتا ہے کہ یہ تصورات حقائق کی تشریح کے لیے کس حد تک موزوں ہیں۔ ان سب کے علاوہ وہ مختلف کثیر الاستعمال تعلیمی اصلاحات کے مختلف معانی کی تشریح کرتا ہے مثلاً تجربہ، ضروریات، علم، افزائش، مطابقت وغیرہ وغیرہ۔ تعلیمی فلسفوں میں ایک فلسفہ تعلیم پاؤلو فریرے کا بھی ہے جس میں تاریخ اور انسان کا ایک ہی تصور بتایا گیا ہے۔ اقبال خان فریرے کے تعلیمی نظریات کو یوں قلم بند کرتے ہیں:

> "فریرے کے تعلیمی فلسفے کے پیچھے انسان کا اور تاریخ کا ایک تصور ہے فریرے کی نظر میں انسان وہ ہستی ہے جو مستقل اپنے انوائرنمنٹ (اردگرد کی دنیا) پر عمل کر

کے اس کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اور یہ صلاحیت ہر انسان میں ہی ہوتی ہے۔

چنانچہ تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ انسانوں کی ان اہلیتوں کو مہمیز لگائے جن کے ذریعہ وہ دنیا کو (یا تاریخ کو) بدلے اور مروجہ معاشرے کی جگہ ایک بہتر انسانیت پرور معاشرہ کی بنیاد ڈال سکے۔ تعلیم کے اس مقصد کو حاصل کرنے کو فریرے نے ''تنقیدی شعور سازی'' کا نام دیا ہے۔'' (۹)

تعلیمی فلسفے کی اہمیت وافادیت کی بنیادیں تو دراصل وہی ہیں جو عمومی فلسفے کے انسانی زندگی سے متعلق بیان کی گئی ہیں تاہم وہ اہم مقاصد جو فلسفہ تعلیمی عمل میں باہم پہنچاتا ہے درج ذیل ہیں اور انہیں وظائف کی وجہ سے تعلیمی فلسفہ کی نظریاتی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے۔

۱۔ ہر عملی پہلو کے پس پردہ کوئی نہ کوئی نظریاتی صورت ضرور ہوتی ہے تعلیم ایک بامقصد عمل ہے اور تکمیل شخصیت فرد کی ذات اور معاشرے کے بہبود کا منتہائے مقصود ہے اسی لئے تعلیم کی بنیادیں ایسے نظریات پر استوار کرنا ضروری ہوتی ہیں جو فرد اور معاشرے کے حق میں مقاصد کے حصول میں مدومعاون اور رہنمائی کا باعث ہوں۔ نیز یہ کہ تعلیم کا نظریاتی پہلو فلسفے کا محتاج ہے۔

۲۔ ایک نقطہ نظر کے مطابق تعلیم بذات خود مقصد نہیں، یہ چیز بلند تر مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے چونکہ فلسفہ وہ سرچشمہ ہے جو انسان کو تعلیم اور زندگی کے مقاصد کے تعین کرنے، ان میں ربط تلاش کرنے اور ان کے حصول کے طریقوں سے روشناس کرانے میں معاون ہے اس لئے تعلیم میں اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔

۳۔ اخلاقی اقدار کی تعلیمی اہمیت مسلمہ ہے فلسفہ جملہ اقدار سے بحث بھی کرتا ہے اور تعلیمی عمل میں ان کی تربیت کے انداز بھی تجویز کرتا ہے۔

۴۔ تفکر وتدبر کی تربیت کی روایتی طور پر تعلیم میں بڑی اہمیت رہی ہے اور اب بھی ماہرین تعلیم اسے تعلیم کا ایک عظیم مقصد گردانتے ہیں فلسفہ بھی فکر وتدبر کو زندگی کے بنیادی مقاصد میں شمار کرتا ہے اس کے نزدیک ذی عقل اور دانشور وہ ہے جو تفکر وتدبر کو بروئے کار لا کر

زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہوتا ہے نہ کہ اندھی تقلید کرنے میں بہترین خیال کرتا ہے۔

۵۔ فلسفہ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح تعلیم کے میدان میں بھی صرف سوالات اٹھانے اور ان کے جوابات دینے کا قائل نہیں ہے اس کے نزدیک سوالات کرنے کی بڑی اہمیت ہے فلسفے کے مطالعے سے سوالات کرنے کا رجحان صلاحیت اور ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔

۶۔ اس رجحان سے دعوی، ردِعوی، دعوی پر قدرت پالینے سے بے لاگ تنقید و تجزیہ اور چیزوں کے باہمی ربط تلاش کرنے کا ملکہ اور میلان نشوونما پاتا ہے اور ایسا طالب علم تعلیمی اصولوں اور تجربات میں جزئیات کو کل کے رشتے میں دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

۷۔ جدید تعلیم کے نظریات کی بنیادی نفسیات جو سائنس پر استعمال کی جارہی ہیں اور نفسیات دراصل فلسفے کی ایک شاخ ہے جو ایک الگ سائنس کی حیثیت پالینے کے بعد بھی فلسفے سے بالکل علیحدہ نہیں کی جاسکتی اس کی جڑیں فلسفہ کے اندر موجود ہیں۔

۸۔ اس کے مصنوعی ذرائع اور اقسام نے دراصل فلسفی سے ہی جنم لیا ہے طریقہ ہائے تدریس ،معلّم اور متعلم کی فطرت اور باہمی تعلق اور معلّم کی ذمہ داریاں وغیرہ پر فلسفہ سیر حاصل بحث کرتا ہے نصاب کی تدوین، مسائل، تعلیم کے مذہبی اور اختلافی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

درج بالا بحث سے فلسفے کی تعلیمی اہمیت کے چند اہم پہلو سامنے آتے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱ فلسفہ سوچ بچار کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔

۲ تعلیمی سرگرمیوں اور زندگی کے دیگر پہلوؤں میں ربط کی نشاندہی کرتا ہے۔

۳ نظریات و عملیات میں تضاد اور کشمکش کو دور کرتا ہے اور تصوراتی و حقیقی بُعد کو کم کرتا ہے۔

۴ سوالات کرنے کا رجحان صلاحیت اور ذوق پیدا کرتا ہے۔

۵ جدت پسندی اور تشکیلِ نو کے رجحان کی نشوونما کرتا ہے۔

۶ انسان کی داخلی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے اور تخیل میں وسعت کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

۷ فلسفہ انسان سے حاصل ہونے والے علم کو حتمی نہیں سمجھتا اور اس طرح سے حاصل کردہ علم کو اعتراض کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ فلسفہ اور تعلیم کا باہمی رشتہ کیا ہے تو اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکثر فلاسفر اور مفکرین کا یہ خیال ہے کہ فلسفہ اور تعلیم ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں دونوں انسانی زندگی کی مناسب نشو و نما اور اسے مثالی بنانے کے لیے موجودات کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں، اس لیے دونوں ہی فرد کی تمدنی زندگی کی تکمیل کی لیے لازمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سماجی زندگی میں بچے کی تربیت کو اس انداز سے کرنا چاہیے کہ تعلیمی موضوع کے ذریعے شعور کی منازل طے کرتا ہوا وہ معاشرے کے لیے ایک ایسا فرد بن جائے جو تعلیم کے اصل مقاصد کو سمجھ جائے اس کے برعکس اگر ہم تمام مضامین پر بچے کی گرفت مضبوط کروانے کی کوشش کریں تو یہ اس کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ تعلیم کے موضوع کے متعلق ''جدید تعلیمی فلسفے'' میں یوں بتایا گیا ہے:

> ''ہم بچے کی سماجی زندگی سے غیر متعلق مضامین، جیسے لکھائی پڑھائی اور جغرافیہ وغیرہ یک لخت شروع کر کے اس کی فطرت کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں اور اس طرح ہم اچھے نتائج حاصل نہیں کرتے۔
>
> سکول کے ساتھ بچے کے رابطہ کا اصل مرکز سائنس، ادب، تاریخ اور جغرافیہ نہیں ہیں بلکہ اپنی سماجی سرگرمیاں ہیں۔[۱۰]

فلسفہ کسی بھی قوم کے لیے نظریہ حیات، عقائد اور اقدار کا تعین کرتا ہے تو تعلیم ان کی وضاحت کرتی ہے غرض یہ کہ فلسفہ اور تعلیم ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ فلسفے کا عملی پہلو تعلیم ہے تو تعلیم کا نظریاتی پہلو فلسفہ۔ تعلیم کو فلسفے کی رہنمائی کی ضرورت ہے، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم ایسا عمل ہے جو انسان کی شخصیت کی بہتر نشو ونما کے لیے مناسب ماحول فراہم کرتا ہے لیکن اس کے لئے اسے فلسفے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بنیادی طور پر نظام تعلیم کے تمام تر اجزاء میں معلّم کا کردار بنیادی ہوتا ہے۔ نظام تعلیم میں مختلف مقاصد کے حصول میں معلّم کی شخصیت مسلمہ ہے ایک معلّم کو تدریسی عمل میں بیک وقت بہت ساری باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے مثلاً تعلیم کے ذریعے کس قسم کے افراد پیدا کرنے والے ہیں نیز کس قسم کے مقاصد کا حصول پیش نظر رکھنا چاہیے کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور نظم وضبط کو کن اصولوں کے تحت برقرار رکھا جا سکتا ہے اس قسم کے دیگر سوالات فلسفہ تعلیم کے مطالعے کے بغیر ایک معلّم فلسفہ تعلیم کے مطالعے سے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ فلسفہ تعلیم کے مطالعے کے بغیر ایک معلّم کی حیثیت اس ہوا باز کی سی ہے جو نہ تو جہاز کو چلانا جانتا ہو اور نہ ہی اس کو اپنی منزل کا پتہ ہو کہ مجھے مع مسافروں کے کہاں جانا ہے۔

مختصر یہ کہ فلسفہ تعلیم کے مطالعے سے ایک معلّم کو تعلیمی عمل کے جملہ اغراض و مقاصد سے آگاہی حاصل ہوتی ہے نہ صرف یہ بلکہ تمام تعلیمی سرگرمیوں کے خدوخال کا اندازہ ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف تعلیمی مسائل کا ادراک بھی حاصل ہوتا ہے۔ جو بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں پہلوؤں سے تعلیمی عمل کو متاثر کرتے ہیں ایک معلّم فلسفہ تعلیم کے ذریعے سے ہی ان مسائل کا مناسب حل تلاش کرتا ہے۔ کیونکہ فلسفہ منطقی دلائل سے حقائق کی صحیح نشاندہی کرتا ہے۔ اس لیے تعلیم کے مطالعے سے ایک معلّم تعلیمی مشکلات کا منطقی نقطہ نظر سے تجزیہ کر کے صحیح نتائج اخذ کر سکتا ہے۔

افلاطون اور ارسطو کے ساتھ ساتھ جن دوسروں مفکرین نے فلسفہ تعلیم پیش کیا ہے وہ تمام کے تمام اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں لیکن اسلام نے جو نظریہ پیش کیا اس میں اسلام نے جسم کے ساتھ ساتھ روح کی تربیت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے ۔اس بارے میں سیّد روح الامین نے اپنے خیالات کا اظہار اپنے مضمون ”اسلام کا فلسفہ تعلیم“ میں یوں کیا ہے:

> ”اسلامی فلسفہ تعلیم، دین و دنیا، فرد اور اور اجتماع دونوں کی اصلاح و بہبود کو مدِ نظر رکھتا ہے، سقراط نے صرف حقیقت کی تلاش کو تعلیم کہا، افلاطون نے معاشرے کی متوازن تنظیم کو تعلیم سے تعبیر کیا، ارسطو نے تعلیم کو جسمانی اور عقلی تربیت کا وسیلہ بنایا۔ لیکن اسلام جسم اور روح دونوں کی تربیت کو مقاصدِ تعلیم قرار دیتا ہے تاکہ ذات اور معاشرے کو پاکیزہ سے پاکیزہ بنایا جاسکے، اسلام میں تعلیم ایک بامقصد عمل ہے اس سے فرد اور معاشرے کی اصلاح کا کام لیا جاسکتا ہے۔“[11]

اسلامی فلسفہ تعلیم قرآن، احادیث اور دوسری کتابوں کے ذریعے ہمیں آگہی دیتا ہے، چودھویں صدی عیسوی میں شمالی افریقہ کے مسلم فلسفی امام غزالی اور ابن خلدون نے عقلی علوم مثلاً ریاضی اور طبیعاتی سائنس کی تعلیم پر بہت زور دیا۔ برطانوی نظریہ تعلیم میں عیسائیت کا پرچار کیا جاتا ہے اور اسلامی تعلیمی تصور میں اسلام کے عقائد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اسلامی تعلیم کے تصور کے بارے میں اقبال خان اپنی کتاب ”جدید تعلیمی فلسفہ“ میں یوں رقم طراز ہیں:

> ”قابلِ قدر علم کا اسلامی تصور برطانیہ کے نیشنلزم والے تصور سے مختلف نہیں ہے۔ قابلِ قدر علم کا افلاطونی تصور بھی تعلیم کے اخلاقی مقصد پر زور دیتا ہے اور اس کا سر چشمہ بعض کتابوں میں عقلی اور امپیریکل طریقہ تعلیم کے بجائے وجدان کو قرار دیتا

ہے۔ اسلامی نظریہ تعلیم اور برطانوی تصور تعلیم کے درمیان تنازعہ اصول فلسفہ علم میں اختلافات کی بنا پر کم اور برطانوی تعلیم میں عیسائیت پر مبنی عقائد کی بنا پر زیادہ تھا۔"(۱۲)

مسلمان فلسفی علّامہ اقبال نے بھی تصور تعلیم یا فلسفہ تعلیم کے متعلق کتب و مقالات کی شکل میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں تعلیم کے اصطلاحی مفہوم سے کہیں زیادہ تعلیم کے عام مفہوم کو سامنے رکھا گیا ہے۔ یعنی جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں درس و تدریس، تعلیم یا طلبہ و مدارس کے توسط سے پیدا ہونے والے مسائل سے بحث کرنے کی بجائے عام طور پر وہی باتیں کہی گئی ہیں۔ جو اقبال کے فکر و فن یا فلسفہ خودی و بے خودی یا تصور فرد و جماعت کے حوالے سے، ان کو ایک بزرگ مفکر یا عظیم شاعر ثابت کرنے کے لیے کہی جاتی ہیں، حالانکہ ان باتوں کا تعلق تعلیم کے اصطلاحی مفہوم سے نہیں بلکہ تعلیم کے اس عام مفہوم سے ہے جس کے دائرے میں ہر بزرگ اور صاحبِ نظر فلسفی یا شاعر کا پیغام درس حیات آجاتا ہے۔

اقبال کے تصورِ تعلیم کے ضمن میں ایسا کرنا بعض وجوہ سے ناگزیر ہے اور اقبال کے مقاصدِ تعلیم کے تعین کے سلسلے میں ان کے فلسفہ خودی و بے خودی یا فلسفہ حیات کو بہر حال سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن اقبال کے عام فلسفہ حیات کو اصطلاحی معنوں میں تعلیم یا فلسفہ تعلیم سے تعبیر کرنا یا محض ان دلائل کی بنیاد پر انہیں ایک عظیم مفکر کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اقبال نہ تو فنِ تعلیم کے ماہر تھے نہ انہوں نے اس فن کی تحصیل کی تھی، نہ اس موضوع پر انہوں نے کوئی کتاب لکھی بجز اس کے کہ کچھ مدت تک بحیثیت پروفیسر کالج میں درس دیتے رہے کوئی مستقل تعلیمی فلسفہ انہوں نے نہیں پیش کیا۔ با ایں ہمہ اقبال کے تعلیمی افکار سے کلیتاً صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے تعلیم کی فنی اور عملی صورتوں پر غور کیا ہے، مسائل تعلیم کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے، اپنے فلسفہ حیات میں مناسب جگہ دی ہے، تعلیم کے عام معنی و اثرات پر روشنی ڈالی ہے، اس کے ڈھانچے اغراض اور معیار کو موضوع گفتگو بنایا ہے اور اپنے عہد کے نظامِ تعلیم پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ مدرسہ، طلبہ، اساتذہ اور نصاب، سب پر اظہار خیال کیا ہے صرف مشرق نہیں، مغرب کے فلسفہ تعلیم اور نظامِ کار کو بھی سامنے رکھا ہے۔ دونوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا ہے ان کے درمیان حدِ فاصل کھینچی ہے۔ خرابیوں اور خوبیوں کا جائزہ لیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ زندگی کو کامیاب طریقے سے برتنے اور اس کی مزاحمتوں پر قابو پالینے کے لیے کس قسم کی تعلیم اور نظام تعلیم کی ضرورت ہے۔

افراد اور اقوام کی زندگی میں تعلیم و تربیت کو وہ بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ افراد کی ساری زندگی کی عمارت اسی بنیاد پر تعمیر ہوتی ہے اور اقوام اپنے تعلیمی فلسفہ کے ذریعہ ہی اپنے نصب العین، مقاصدِ حیات، تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاشرت کا اظہار کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے قومی زندگی کے اسی اہم پہلو پر گہرا غور و خوص کیا ہے۔ اور اپنے افکار کے ذریعہ ایسی راہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک زندہ اور جاندار قوم کی تخلیق کا باعث بن سکے۔ ابتداء میں تو اقبال نے قوم کے تعلیمی پہلو پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ خاص طور پر اپنی شاعری کے پہلے اور دوسرے دور میں اس موضوع پر انہوں نے کچھ نہیں لکھا البتہ آخر میں انہوں نے اس قومی پہلو کو بھرپور اہمیت دی۔ اور " ضرب کلیم' میں تو "تعلیم و تربیت "کا ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے۔ ڈاکٹر علّامہ محمد اقبال اپنی تصنیف ضرب کلیم میں "ایک فلسفہ زدہ سیّدزادے کے نام" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے
اس کے رگ رگ سے بے خبر ہے (۱۳)

عمومی تعلیمی نظام پر اطلاق کسی بھی نظام تعلیم کو فلسفہ تعلیم کے بغیر تشکیل نہیں دیا جاسکتا کیونکہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی نظام تعلیم کی بنیاد کسی نہ کسی فلسفے پر رکھی جاتی ہے۔ ہر ملک کے نظام تعلیم کے تمام اجزاء کی بنیاد فلسفہ تعلیم پر ہوتی ہے بالفاظ دیگر فلسفہ تعلیم نظام تعلیم کے پورے ڈھانچے کو متاثر کرتا ہے۔ مثلاً نظام تعلیم کے مختلف اجزاء جیسے مقاصد، تعلیم نصاب، تعلیم انصرام، تعلیم طریقہ ہائے تدریس تمام کے تمام فلسفہ تعلیم کے تحت ہی تشکیل پاتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی کسی بھی قوم کا نظام تعلیم وضع بالا اجزاء کا مرکب سے تشکیل پاتا ہے۔ جو اس قوم کے نظریہ حیات اس کی معاشرتی ضروریات اور قومی امنگوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اقبال نظام تعلیم سے نالاں نظر آتے ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب '[اقبال سب کے لیے" میں یوں خیال ظاہر کرتے ہیں:

"اقبال کے نزدیک تعلیم اور تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ماحول، ان عناصر سے پاک ہو جو طالبِ علم میں محکومانہ یا غلامانہ ذہنیت پیدا

کر سکتے ہوں خواہ یہ غلامی و محکومی سیاسی و سماجی ہو یا نفسیاتی و معاشی۔ چنانچہ وہ مشرق کے نظامِ تعلیم کو اسی لیے غیر مؤثر اور بے روح خیال کرتے ہیں کہ وہ حاکم قوموں کا زیادہ مرتبہ ہے اور طالب علموں میں حریت و آزادی کی روح پھونکنے کے بجائے انھیں بے عملی یاسیّت، محرومی اور غلامانہ ذہنیت کا شکار بناتا ہے۔"(۱۴)

فلسفہ تعلیم کی رہنمائی کے بغیر تعلیم کے اصل مقاصد کو حاصل نہیں کیا جا سکتا جو معاشرتی ترقی اور فلسفہ حیات کی تکمیل کا باعث ہو سکتے ہیں، مختصر یہ کہ فلسفہ تعلیم کسی بھی نظام تعلیم کا مرکز و محور ہوتا ہے جو مختلف تعلیمی سرگرمیوں اور مختلف اجزاء کے فرائض اور جملہ عناصر کا تعین کر کے بحیثیت کل اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر فلسفہ تعلیم ہی نظام تعلیم کو بنیادی مواد فراہم کرتا ہے جو مملکتی مقاصد اور قومی فلسفہ حیات کے تحت اس کے عملی اقدامات کا صحیح رخ متعین کرتے ہوئے ان کے حصول کے لیے رہنما اصول فراہم کرتا ہے۔ اقبال نے علم کے تین ذرائع کا ذکر کیا ہے اس بارے میں ڈاکٹر طالب سیال لکھتے ہیں:

"علامہ اقبال کے نزدیک علم کے تین ذرائع ہیں۔ فطرت، تاریخ اور مذہب۔ فطرت کے علم کا تعلق محسوسات کی دنیا سے ہے یہ حسّی تصورات سے حاصل ہوتا ہے، اس علم کی تفہیم و تدریجی نوعیت کی ہے، فطرت کے مظاہر پر غوروخوض کر کے معلومات اکٹھی کرنا، ان کو مرتب کرنا ار ان کے تجربے و تجزیے کے صبر آزما مراحل سے گزر کر نتائج اخذ کرنا اس علم کا خاصہ ہے۔"(۱۵)

ایک دور تھا کہ جب فلسفہ اپنے ضمن میں کوئی قطعی (Full stop) شے نہ تھی، یا کہہ لیں کہ کج بیانی یا ادبی مبالغے کسی لہجے، کسی وجود، کسی عدم غائب، کسی حاضر پہ اپنی ایسی مناطق کو پیش کرنا تھا کہ سوچنے والے کی تشنگی گھٹنے کے بجائے اور بڑھ جائے، طالب سلجھنے کے شوق میں مزید الجھ بیٹھے۔ زمین، دولت، حسن، علم، یہ انسانی سوچ کی علتیں ہیں، اس کی حرص کہ جب اسے کچھ سمجھ آنے لگے تو وہ بہت کچھ سمجھنے سمیٹنے کی تگ و دو میں پڑ جاتا ہے۔ فلسفہ بظاہر ٹھہراؤ ہے جس میں مزید ابتلاء ہے، مگر اس کے پڑاؤ کا مقام انسان کی ذہنی سارنگی کی ذراسی تال میل سے کسی نئے زاویے کو نکل پڑتا ہے، فلسفے کی علت کبھی اپنے انجام کو نہیں پہنچ سکتی۔ یہ وہ ایندھن ہے جو آگ الاؤ کو مزید بھڑکا دیتا ہے۔

فلسفہ اپنے رویے کے اندر کینسر سیل کا سا غیر ضروری پوٹینشل رکھتا ہے جو تقسیم در تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی افادیت اس لیے تسلیم کرنے پہ قانع نہیں کہ اگر اس نے انسانی نفسیات کو ٹھہراؤ اور سکون جیسی

نعمت عطا کی ہوتی تو اس سے زیادہ غذائیت زود ہضم کوئی شے اس موافق نہ تھی، مگر معاملہ کچھ اور الگ ہو پڑتا ہے۔ فلسفہ کی سطحی بحث کو سمجھنا مقصود ہے، گو کہ میں اسے سمجھنے پر کھنے کی غرض وغایت زیادہ تو نہیں رکھتا مگر جتنا ہو سکتا ہے اک سرسری سا جائزہ رکھتا ہوں، تاریخِ فلسفہ علت و معلول سے عبارت ہے۔

علت و معلول وہ چیز جو کسی دوسری چیز کے ہونے کا سبب ہو، باعث ہو، علت کہلاتی ہے، اسے آپ اشتہا، کیڑا، یا اس کے انگریزی معنی Disease sickness fault سے بھی تعبیر کیا گیا ہے یا مزید سبب، وجہ، سقم سے بھی مفہوم لیا گیا ہے، مثلاً، "جانوروں کا پالنا علت سمجھا جاتا ہے"، فلسفہ کا پلنا بھی علت سے نکتہ آغاز وترتیب پاتا ہے، یعنی کسی بھی وجود کا سبب و مرہون منت علت کہلاتا ہے۔ سب کا مسبب، یعنی جیسے ہم کہتے رب مسبب الاسباب ہے، یعنی علت کا معلول ہے، انسان علت ہے تو رب معلول مسبب سبب کرنے والا۔

فلسفہ کی تاریخ پہ نظر دوڑائی جائی تو سقراط، افلاطون اور ارسطو سے بھی بہت قبل اک یونانی نام ابھرتا ہے، اس کا نام "پارامینڈس" ہے، جو وجود اور عدم وجود کے مابعد الطبیات فلسفے کا باپ گردانا جاتا ہے، اسے "ہیرا اقلاطیس" سے بھی بہت قبل کا فلسفی تسلیم کیا گیا، اور بالترتیب سبھی دنیا میں جتنے بھی بڑے بڑے فلسفی گزرے، پلوٹو، ارسطو، سکریٹ، ہیرا اقلاطیس، مارک، لینن، ہیگل، کانٹ، ڈیکارٹ، سب کے ہاں اسی فلسفیِ اعظم کے فلسفہ وجود عدم وجود کے بنیادی اجزا پائے جاتے ہیں۔ چونکہ نفسیات کی programing بھی میرے رب کی جانب سے ہے تو اس کی ایک خوبی میرے نزدیک یہ ہے کہ اس ڈومین نے خدا، بندے اور کائنات کو نفسیات کا سب سے بڑا موضوع بحث بنا دیا، اس نے انسان کو اپنی، خدا اور کائنات کی ذات پر نظر ثانی اور رائے دینے کی حرارت پیدا کی، مگر بات وہی اک فلسفی جب پانی کی ذات پہ دلیل قائم کرتے ہوئے پوچھتا ہے کہ پانی کیوں ہے، کیا ہے اور کیسے ہے؟ ٹھوس، مائع، گیس کی حالتوں میں کیوں ڈھلتا ہے جب اس کو ان سوالات کے جواب مناطقہ فراہم کرتے ہیں تو وہ خود سے یہ پوچھنے لگ جاتا ہے کہ پانی بھاپ ہی میں کیوں بدلتا ہے؟ اس کا یہ سروپ کس نے اور کیوں طے کیا ہے، ٹھیک پر آخر یہی سروپ ہی کیوں؟ ذہنی علت تو اس ڈگر پہ بھی چڑھ دوڑتی کہ کیا واقعی پانی کا بخاراتی سروپ دراصل کچھ سروپ ہے بھی یا محض ہماری اکھیوں کا وجدان ہے؟ بصارت کی دیوانگی ہے؟ اب یہ لمحہ قطعی نہیں، اب یہاں سے منیر نیازی کے مصداق:

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو

میں اک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا [۱۶]

فلسفے کی شروعات پر پیچیدہ بحثوں کی بجائے یہ کہنا کافی ہو گا جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ فلسفے کی ابتدا بہر حال طبقاتی سماجوں میں ہوئی تھی، اس کو دیکھتے ہوئے اور فلسفوں پر نظر ڈالتے ہوئے ہم خاصے وثوق سے اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ فلسفے ابتدا ہی سے دو طرح کے رہے ہیں (یا یہ کہ فلسفے کا استعمال دو طرح سے رہا ہے) ایک وہ جو حکمران طبقے کے مفاد میں جاتا ہے اور دوسرا وہ جو کہ محکوموں کے مفاد میں جاتا ہے۔ اب ہم ان کی واضح تقسیم کر سکنے کے قابل ہیں، کہ ایک انسان دوست فلسفہ ہے اور دوسرا انسان دشمن فلسفہ۔ ہمیں آج تک یہی تقسیم نظر آتی ہے۔

اپنے گرد موجود دنیا کو ماننا، اور اس کو جاننے کی کوشش کرنا اور اس کے متعلق ایک نقطہ نظر رکھنا ایک قسم کا فلسفہ ہے۔ اور اپنے گرد دنیا کو اپنے خیالات کی تخلیق قرار دینا، اس کو واہمہ اور سراب قرار دینا، اس کو جاننے کی کوششوں کو بے معنی قرار دینا، دنیا ہی کو بے معنی قرار دینا، اس دنیا کی بجائے اپنے خیالات میں موجود دنیا کے متعلق نقطہ نظر کو باہر موجود دنیا پر ثبت کرنے کی کوششیں کرنا دوسری قسم کا فلسفہ ہے۔

اگر ہم ارد گرد کی دنیا کو مانیں گے، اس کو جاننے کی کوشش کریں گے، تو ہمیں نظر آ جائے گا کہ اس میں بہت کچھ ایسا ہے جو کہ منطق اور فلسفے کے خلاف ہے، مثلاً یہ کہ جو انسان فطرت پر کام کر کے اس کی شکل کو تبدیل کرتے ہوئے نوعِ انسان کے لیے کارآمد بناتا ہے، اس کا اپنے کیے گئے کام میں حصہ اس سے کم ہے، جتنا کہ اس کا حصہ ہے، جس نے فطرت پر کوئی کام نہیں کیا، یعنی کہ کام کرنے والے انسان کا استحصال ہوتا ہے۔ اس طرح فلسفیانہ غور و فکر کرنے والا ہر شخص جلد یا بدیر اپنی فہم کے مطابق استحصال تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ اس چیز کو حکمران طبقات بہت دیر پہلے پہچان گئے تھے۔ اس کے بہت سے حل ایک ہی ساتھ نکالنے کی کوششیں کی گئیں۔ جو کہ ساتھ ساتھ چلتی گئیں۔ مثلاً یہ کہ بہت سے فلسفیانہ رجحانات گھڑے گئے، جن کو بطور فلسفے کے عوام میں اتار دیا گیا۔

سچائی کی بات کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا کہ اس کو مشکل بنا دیا گیا۔ سچ سادہ ہوتا ہے اور ایک ہوتا ہے۔ جھوٹ بولنے کے ان گنت راستے ہو سکتے ہیں۔ یہی فلسفے کے ساتھ بھی ہوا۔ عام معمولی اور سیدھی نظر آنے والی باتوں کو منطق دانوں اور فلسفے دانوں نے گھمانا شروع کیا۔ اور سچائی پر سوال کھڑے کرنے شروع کر

دیئے۔ ان سوالوں کی تفصیل میں نہیں جاتے، بس یوں سمجھ لیجئے کہ بات یہاں سے شروع ہوتی ہے، کہ "دنیا کی کوئی چیز تبدیل نہیں ہو رہی" کو بڑے ہی شان والے طریقے سے "ثابت کر دیا گیا"۔ اس کے بعد یہ "ثابت کر دیا گیا" کہ "حرکت کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے"۔ یہاں تک کہ چلا ہوا تیر جو ہوا میں ہے، ساکن ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ "ہمارے ارد گرد کی دنیا ہے ہی نہیں"، "ہے تو جانی نہیں جا سکتی"، "جان لی جائے تو آگے اس کو بتانا ممکن نہیں ہے" یہ سب کچھ اور بہت کچھ ہزاروں سال پہلے بڑی محنت سے اور واقعی شان والے طریقے سے ثابت کیا گیا۔ اس کے علاوہ یہ بات کہ "مادے کا وجود نہیں ہے"، خیال ہی خیال میں اس کو توڑتے چلے جاؤ۔ بالآخر ایک ایسا وقت آئے گا، کہ "کچھ بھی نہیں رہے گا"۔ یہ "کچھ بھی نہیں رہے گا" والی بات بھی۔ جو آج لوگ اس طرح کرتے ہیں کہ جیسے کوئی نئی دریافت ہے، ہزاروں سال پرانی ہے۔

ایسے لوگوں کے متعلق کچھ بات ہو چکی ہے۔ لیکن ان کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی ہر دور میں موجود رہے ہیں، جو کہ ان کے جواب دینے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ، فلسفے کا آغاز سچائی سے اور سچائی کو جاننے کی کوشش سے ہی ہوا تھا۔ لیکن جب سچائی کو چھپانے کے لیے بھی فلسفے کا استعمال شروع ہو گیا، تو فلسفہ نہ صرف یہ کہ سچائی کو جاننے کی کوشش بنا بلکہ ان سوالات کا جواب دینا بھی فلسفے ہی کا کام ٹھہرا جو کہ اس پر فلسفے ہی کا استعمال کرنے والے وقتاً فوقتاً اٹھاتے رہے۔ اس طرح فلسفے کے طریق کار کو کئی محاذوں پر بیک وقت لڑائی لڑنی پڑی۔ ایک تو اس کے سامنے ساری دنیا پڑی تھی، جس کی اس نے ابھی تشریح کرنی تھی کہ یہ سب چیزیں، مظاہر اور عوامل کیا ہیں، دوسرے اس کو مسلسل پیچیدہ ہوتے جا رہے سماج کا مطالعہ بھی کرنا تھا، تیسرے مختلف تشریحات کو دیکھنا تھا، اس پر تنقید اور تفسیر کی ذمہ داری بھی تھی، اور اس کے علاوہ ایسے سوالات کے جوابات بھی دینے تھے، جو کہ صرف سچائی کو چھپانے اور بسا اوقات محض دھول اڑانے کے لیے اٹھائے جا رہے تھے کہ دوسروں کو بھی کچھ نظر نہ آئے۔ اور ایسا ہی ہوا۔

انتہائی ابتدا میں فلسفیوں نے سچائی کو تلاش کرنے کی کوشش، اور اس کو چھپانے کی کوشش۔ سچائی جو کہ ہر جگہ تھی، اس کو ہر جگہ سے تلاش کیا جانا تھا، لیکن بہت سی جگہیں ایسی تھیں، جہاں سے سچائی اگر سامنے آتی تو اس سے مقتدر طبقات کا وجود ناجائز قرار پاجاتا تھا۔ یقیناً آج کی مانند یہ سب کچھ دو اور دو چار جیسا سیدھے سبھاؤ نہیں ہو گا، پھر بھی ابتدائی فلسفوں میں ہمیں مقتدر حلقوں کے خلاف بغاوت کے آثار ملتے ہیں۔ جن میں سب سے پہلی مثالیں ہم خود اپنے خطے یعنی ہندوستان میں سے دیکھ سکتے ہیں۔

ہمیں یہ یاد رکھنا ہے، کہ مادیت پسندی کا سیدھا مطلب اپنے گرد موجود دنیا کو حقیقی طور پر موجود ماننا ہے، کہ ہم اس کے متعلق سوچیں یا نہ سوچیں یہ موجود ہے۔ لیکن حکمران طبقے نے مادی دنیا کے وسائل پر قبضہ تو کیا سو کیا، انہوں نے غریبوں سے درست سوچ کا حق بھی چھین لیا۔ اپنے گرد کی دنیا کو مایہ جال، چھل، فریب، دھوکا، واہمہ، سراب، عارضی، فانی اور فضول قرار دیتے ہوئے غریب محنت کش عوام کو اسے ترک کر دینے کو اعلیٰ فضیلت بتایا جس کو ہم عینیت پرستی کے نام سے جانتے ہیں۔

اگر کوئی اپنی اجرت میں اضافے کا بھی کہتا تو اس کو بھی "مادہ پرست"، "دنیادار" اور "لالچی" باور کیا جاتا۔ دوسری جانب ساری دنیا، دولت، سونا، چاندی، مال، مویشی، زمین اور جائیداد پر یہ طبقہ اس کو حقیر قرار دیتے دیتے قابض ہو گیا۔

مذہبی پنڈت، پروہت، پادری وغیرہ کا وہ طبقہ جو حکمران طبقے کو خدا کی جانب سے اِس "عارضی اور فانی" مایہ جال سے بھری دنیا کو ہڑپ کرنے کا آدرش دیتا، اس کو اس کی اوقات کے مطابق حصہ ہر دور میں ملتا رہا۔ اپنے اسی حصے کو برقرار رکھنے کے لیے وہ حکمران طبقے کے مقبوضات کو خدا کی طرف سے ودیعت کردہ بتا کر اس کو مقدس "حق" میں ڈھالتے چلے گئے۔ تو اس طرح سے دنیا کو دیکھنے کے دو نظریات فلسفے کے آغاز کے ساتھ ہی پیدا ہو گئے، مادیت اور عینیت۔

جو فلسفے اس بات پر قائم ہیں کہ اشیا کی حقیقت کو جانا جا سکتا ہے، ان کو تعقلی یا Rational فلسفے کہتے ہیں، اور جو فلسفے اس بات پر مصر ہیں، کہ اشیا کی ماہیت کو انسان نہیں جان سکتا، ان کو عدم تعقلی یا Irrational فلسفے کہتے ہیں۔ ان تمام فلسفوں کو جو کہ مادی دنیا کا انکار کرتے ہیں، یا پھر یہ کہتے ہیں کہ مادی دنیا (کی حقیقت) کو جانا نہیں جا سکتا، عدم تعقلی کہتے ہیں، اور عمومی طور پر اس رویے کو "لاادریت" 2 (Agnosticism) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہم نے آخری تجزیوں میں ہمیشہ یہی پایا ہے کہ وہ تمام فلسفے جو کہ لاادریت کی ترویج یا توثیق کرتے ہیں، یہ نہیں مانتے کہ ہمارے گرد کی دنیا کا ہماری سوچ سے باہر آزاد حالت میں وجود ممکن ہے، یا یہ کہ ہمارے گرد موجود دنیا موجود تو ہے، لیکن اس کو، یا اس کی حقیقت کو جاننا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے، یا یہ کہ ہم اس دنیا کو جو ہمارے ارد گرد موجود ہے، اپنے ذہن میں موجود تعقلی اصولوں یا مقولوں کی وجہ سے جانتے ہیں، یا یہ کہ ہم اپنے گرد موجود دنیا کا صرف مشاہدہ کر سکتے ہیں، اور اس کی خود کی حرکت کے صرف نتیجوں کو نوٹ کر سکتے ہیں، جو کہ اگلی مرتبہ مختلف ہوں گے، تمام کے تمام سماج میں جاری عوامل اور مظاہر کی حقیقت کی جانکاری کے انکار اور استحصال اور جبر کی جڑوں کی کھوج کو لاحاصل قرار دینے پر نہ صرف عقل دشمن ہیں، بلکہ

انسان دشمن بھی ہیں۔ ہمارے نزدیک انسان سے مراد بہر حال انسانوں کی وہ کثیر تعداد ہے، جو کہ طبقاتی نظاموں کے حامل سماجوں میں جبر واستبداد کی چکی میں پستی رہی ہے، اور آج یہ جبر اور استبداد اپنی نوعیت میں مختلف تو ہے، لیکن پہلے سے کئی گنا حد تک ہولناک اور وحشت ناک ہے، کہ پہلے نظاموں مثلاً غلام داری میں غلام کو خوراک، پوشاک، جائے پناہ اور شادی وبال بچے کی فکر تو نہیں تھی، جبکہ سرمایہ داری میں محنت کش طبقے سے وہ آسائشیں بھی چھین لی گئی ہیں۔

دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ہمارے یہاں مغربی فلاسفرز کو ہی فلسفیانہ مباحث کے ارباب تسلیم کیا جاتا ہے۔ یورپ کے فلاسفرز کو خدایان فلسفہ تسلیم کرتے ہوئے ہم ان کے حوالے جابجا پیش کرتے جاتے ہیں اور یہ کسی قدر بھول جاتے ہیں کہ ارسطو، سقراط اور افلاطون جیسے فلسفیوں کی گفتگو میں لگی گرہیں مسلمانوں کے ہاتھوں کھلی ہیں۔ جس وقت یورپ فلسفے سے پوری طرح آشنا بھی نہیں تھا اس وقت ابن خلدون نے فلسفیانہ مضامین کو زیر بحث لاتے ہوئے اس وقت کی اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ''مقدمہ'' پیش کر دی تھی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اقبال آفاقی اپنی تصنیف ''مابعد جدیدیت فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں'' کی تحریر کے ذریعے ابن خلدون کا یوں حوالہ بناتے ہیں:

> ''یورپ ابھی تاریخ کی علمیاتی، اخلاقی اور قدری تشریح سے ناواقف تھا جب ابن خلدون نے فلسفہ تاریخ پر پوری دنیا میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف 'مقدمہ' کے نام سے پیش کی۔ الغزالی نے پہلے پہل 'مقاصد فلسفہ' پیش کی۔'' (۱۷)

دنیا کے کسی آرٹ، سائنس اور فلسفے کا بنیادی ترین مقصد بہر حال انسان کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ تمام علوم اور فنون کا بنیادی مقصد انسان اور انسانی معاشرے کی بھلائی اور ترقی ہوتا ہے خواہ اس کی کیفیت جو بھی ہو۔ تمام فنون، علوم اور فلسفے صرف اور صرف انسان کے لیے ہیں، اور انسان ہی سے متعلق ہیں۔ فلسفے کا مقصد سچائی کو جاننا یا سچائی کی تلاش ہے، یہاں تک کہ جن فلسفوں نے عام طور پر سچائی پر پردہ ڈالنے کا اور اس کو چھپانے کا کام بھی کیا انہوں نے بھی ایسا اس کو سچائی کی یا حقیقت ہی کی تلاش بتاتے ہوئے کیا، اور ان فلسفیوں نے بھی خود کو حقیقت کے متلاشی ہی کے روپ میں پیش کیا۔

لمبی تفاصیل اور بحثوں سے کتراتے ہوئے ہم یہاں ایک بیان پر اکتفا کرتے ہیں، کہ دنیا کے کسی آرٹ، سائنس اور فلسفے کا بنیادی ترین مقصد بہر حال انسان کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ تمام فنون، علوم اور فلسفے صرف اور صرف انسان کے لیے ہیں، اور انسان ہی سے متعلق ہیں، اور ان کا مقصد انسان ہی کی خواہشوں کی

تکمیل کرنا ہے، یہ خواہشیں جسمانی ہوں یا روحانی، اس سے قطع نظر۔ لیکن حکمران طبقہ تمام آرٹس، سائنسوں اور فلسفوں کو اپنے ایک ہی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا رہا ہے، کہ اس کے مقبوضات پر اس کی ملکیت قائم رہے، اس ملکیت کو قائم رکھنے کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرتا رہا ہے۔ حکمران طبقے کے افراد اپنی ساری زندگیاں مال و دولت کے حصول کی تگ و دو میں گزار دیتے ہیں، خواہ اس کے لیے ساری زندگی ان کو خاک چھاننی پڑے، تخت پر بیٹھنا پڑے یا تختے پر چڑھنا پڑے، لیکن مقصد وہی ہے، نجی ملکیت اور اپنے اقتدار کا تحفظ۔ اس نجی ملکیت کے اور اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے ہزارہا سال سے اس چھوٹی سی اقلیت نے بنی نوعِ انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ فلسفے میں سوچنے والے جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں، کہ جب ہم سب ایک جیسے پیدا ہوتے ہیں، تو ہمارے حقوق ایک جیسے کیوں نہیں۔ اس طرح گہرائی میں سوچنا استحصال کی نشاندہی تک پہنچا دیتا تھا۔ دنیا کے تمام بڑے ادیب اور فلسفی اس نتیجے پر پہنچے اور انہوں نے عدل کے حق میں اور ظلم، جبر اور استحصال کے خلاف لکھا۔ ہزاروں سال پرانے ادیبوں کی چیزیں پڑھ کر اس مظہر کو دیکھا جا سکتا ہے۔

دنیا بھر کے فلسفے اور علم کا مطالعہ کیا جائے تو اس کا سب سے بڑا موضوع انسانوں کی بھلائی اور بہتری ہے اور ہر طرح کی ناکامی اور نامرادی سے نجات دلانا ہے۔ گویا آج ہی کسی نے آج ہی کے محنت کشوں کی حالتِ زار پر لکھا ہے۔ یوں عمومی طور پر، تمام فلسفے اور ادب انسان ہی کی فلاح کے لیے کام کرتے رہے، ماسوائے ان چند کے جن کو حکمرانوں نے اپنے لیے بطورِ خاص گھڑوایا۔ لیکن وہاں بھی یہ چیز ضرور تھی، کہ حکمران طبقہ صرف خود کو انسان ہونے کا درجہ دیتا تھا، اور لکھنے والا ادیب یا فلسفی بھی خود کو ہی انسان باور کرتے ہوئے اپنی فلاح کر رہا ہوتا تھا۔

مارکس نے اپنے فیوئرباخ پر سب سے مشہور گیارھویں تھیسس میں لکھا ہے کہ "اب تک فلسفیوں نے مختلف طرز سے دنیا کی تشریح کر دی ہے، اصل کام اس کو تبدیل کرنا ہے۔" ہزاروں سال تک یہ کش مکش جاری رہی۔ سچ اور جھوٹ کا یہ یُدھ کسی دور میں، اور کسی جگہ پر نہیں رُکا۔ ہمیں دنیا کے ہر خطے میں فلسفے، حکائتیں، داستانیں، شاعری اور کہاوتیں ملتی ہیں۔ بعض جگہوں پر فلسفے نے بڑی شاندار ترقی کی جیسے یونانی فلسفے کو دیکھا جا سکتا ہے، اور نشاۃ ثانیہ کے دور کے بعد انگلستان، فرانس، اٹلی، ہالینڈ اور سب سے بڑھ کر جرمنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس میں قابل غور بات یہ ہے، کہ فلسفے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں موجود بہت سی شاخیں علیحدہ ہوتی گئیں۔ بہت سے علوم نے خود مختاری سے اپنا کام شروع کر دیا۔ دنیا پر غور کرنے کا کام دنیا کے مشاہدے

اور تجربے کے نزدیک ہوتا چلا گیا۔ جس قدر ان علوم کا دامن نئی معلومات سے لبریز ہوتا گیا اتنا ہی فلسفہ بھی آگے بڑھتا گیا۔ اس تاریخ میں دھیرے دھیرے ایسا مقام آیا جہاں فلسفے کے اٹھائے ہوئے سب سے بڑے سوالوں کے جواب دے دیے گئے۔

اس تھیسس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ان تمام مارکس دشمن عینیت پرستوں کی ان کوششوں پر پانی پھیر دیتا ہے جو اس سے پہلے کے تھیسس لے کر ان کی عینیت پرستانہ تشریح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں صاف اور واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ 'فلسفے کے ذریعے جتنا ممکن تھا' دنیا کی تشریح ہو چکی ہے اب 'فلسفے کے ذریعے بھی' اصل کام دنیا کو تبدیل کرنا ہے۔ اور مارکس کی دیگر زندگی کو اور اس کے کیے گئے تمام کام کو نظر میں رکھتے ہوئے اس کی اس بات کے علاوہ کوئی تشریح ممکن نہیں کہ دنیا کو تبدیل کرنے کا مطلب استحصال اور استحصالی نظام کا خاتمہ ہے۔

اس بات کا ہم جتنا بھی جائزہ لیں اس کے سوا کوئی مطلب نہیں نکلتا کہ دنیا کی تشریح کرنا اب فلسفے کا کام نہیں رہا۔ جب مارکس اینگلز کہتے ہیں کہ "دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ!" تو اس کا مفہوم یہی بنتا ہے کہ عالمی نظامِ استعمار کا مقابلہ متحد ہو کر محنت کشوں کو کرنا ہو گا۔ یہی فلسفہ ہے اور یہی اس کا اخیر ہے۔ البتہ خاتمے (End) کا معنی فلسفے میں تکمیل (Completion) کے بطور آتا ہے، بطور نابود ہو جانے (Termination) کے نہیں۔ یعنی کسی چیز کا اپنے مقصد کی تکمیل کر لینا یا وہ مقصد حاصل کر لینا۔ جیسا کہ ہمیں ارسطو کے فلسفے (میٹافزکس، ایتھکس، پولٹکس وغیرہ) میں (End) کا مفہوم ملتا ہے۔

اینگلز نے بعد میں بھی متعدد مرتبہ یہ بات لکھی ہے کہ فلسفے کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن بطور ایک ایسے منطقہ کے جو دنیا کی یعنی فطرت کی اور تاریخ کی تشریح کیا کرتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس خاتمے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آئندہ کی دنیا فلسفہ نہیں پڑھے گی، یا اس کو فلسفہ پڑھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس نے لکھا ہے کہ اب دنیا کی تشریح بہت سی سائنسیں کریں گی۔ مثال کے طور پر وہ دنیا جو کہ ہمارے خیالات سے باہر موجود ہے، جس کو جانا جا سکتا ہے، اس میں رُونما ہونے والے واقعات 'تاریخ' ہیں۔ اور تاریخ کی سائنس کسی کی پسند ناپسند یا داخلی خیالات پر مرتب نہیں ہو گی، بلکہ تاریخ جاننے کے لیے ان واقعات ہی کو دیکھنا ہو گا جو ہمارے ارد گرد رُونما ہو رہے ہیں۔ اسی طرح مادی دنیا کو یا فطرت کو جاننے کے لیے بھی اسی مادی دنیا ہی کو دیکھنا ہو گا، نہ کہ کوئی ایسا نظریہ یا ایسا فلسفہ ہو جو ایک سمت مہیا کرے کہ فطرت کو ایسے دیکھا جائے۔ اس طرح دنیا کا یا فطرت کا مطالعہ بہت سی مختلف سائنسیں کھوج کر کے، معلومات اکٹھی کر کے کریں گی۔

موجود فلسفہ یعنی جدلیاتی مادیت دنیا کی تفہیم اور تشریح کے معاملے میں اپنی ضرورت کے مطابق، سوچ اور اس کے قوانین پر بات، ان تمام اصولوں کی روشنی میں کرے گا جو دیگر متعلقہ سائنسیں تجربے سے، مشاہدے سے اور یقیناً سوچ سے تشکیل دیں گی۔ اس طرح "صوری منطق اور جدلیات ابھی تک بقا پذیر ہیں"۔ فلسفے کے خاتمے کا دوسرا مطلب ہمیں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ درست ہے بندہ سوچ کے قوانین پر سوچے اور مطالعہ کرے۔ لیکن جو مسائل ہمیں پیچیدگی میں سوچنے کی تربیت اور عادت کی وجہ سے اس دنیا میں نظر آئیں ان کے حل کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔

مسائل کے حل کے لیے ضروری ہے کہ دنیا کو یا سماج کو درست انداز میں دیکھا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کو درست انداز میں دیکھنے کا طریقہ وہی ہے، جس انداز سے دنیا اور سماج چلتے ہیں، یعنی جدلیاتی۔ جدلیاتی انداز میں دنیا کو دیکھنا ہمیں تاریخ کی تفہیم کی جانب لے جاتا ہے، جس کو ہم "تاریخی مادیت" کے نام سے جانتے ہیں۔

ضروری ہے کہ تاریخ لفظ سے ہمارا تعارف ہو اور ہم اس کو انہی معنوں میں سمجھیں جن میں کہ ہیگل، مارکس اور اینگلز وغیرہ استعمال کرتے رہے ہیں۔ دیگر ماہرین تاریخ سے مراد کوئی ایسا علم لیتے ہیں، جو گزرے ہوئے واقعات کو مشہور لوگوں کی پیدائش کے حوالے سے یا ان کے کارہائے نمایاں کے حوالے سے جانتا ہے۔ لیکن اوپر جہاں ہم نے اینگلز کی اس بات کا مفہوم بیان کیا ہے جو اس نے اینٹی ڈوہرنگ اور لڈوگ فیوئرباخ والی کتاب میں کی ہے، وہاں تاریخ سے وہ والی تاریخ قطعاً مراد نہیں ہے، کہ اب سماج کو فلسفیانہ انداز میں سمجھنے کی بجائے تاریخ کی ولگر کتابوں میں سے پڑھنا ہوگا۔ یہاں تاریخ کو جاننے کے لیے جدلیاتی مادیت کے مفہوم کو جاننا ہوگا۔ جس میں چیزوں کو ویسے ہی دیکھا جاتا ہے جیسی کہ وہ ہیں (مادیت) اور ان کو دوسری چیزوں سے تنہا کرکے، کاٹ کے نہیں دیکھا جاتا، اور ان کو اسی طرح وقت کے دھارے سے کاٹ کے محض "اب" کی صورت میں نہیں دیکھا جاتا۔

کسی بھی چیز کو دنیا سے اور دوسری ہر چیز سے تعلق میں ماضی، حال اور مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جاتا ہے (جدلیات)۔ یہی اصول تاریخی مادیت میں کسی بھی واقعے کے متعلق ہوگا کہ کوئی بھی واقعہ خود اسی کی اپنی حرکت میں اور باقی دنیا، سماج اور واقعات کے تعلق میں متحرک عمل کے طور پر دیکھا جائے گا۔ اس طرح، انسان سے تعلق رکھنے والی ہر چیز، ہر مظہر اور تمام عوامل تاریخی ہیں، خواہ وہ ماضی کے ہوں یا حال کے، اور یہ آنے والے وقت سے کٹے ہوئے نہیں ہیں بلکہ منسلک ہیں۔ آنے والا دور انہی واقعات میں سے جنم لیتا

ہے، جو گزر چکے ہیں، اور جو وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ اس طرح سے تاریخی مادیت سماج سے کٹی ہوئی لیبارٹری میں یا سروے رپورٹس میں بند سائنس نہیں ہے، بلکہ دنیا میں ہونے والے واقعات کے فلسفیانہ اور "سائنسی تجزیے" کا نام ہے۔ جو صرف تجزیے پر بات ختم نہیں کرتا بلکہ اس سے آگے جا کر دنیا کو تبدیل کرنے کی جانب پیش قدمی کی تحریک دیتا ہے۔

مارکس نے اپنے پڑھے ہوئے فلسفے کا اطلاق اپنے سامنے موجود سماج پر کیا ہے۔ اس نے محض نعرہ نہیں دیا، کہ ساری دنیا کے محنت کش اکٹھے ہو جائیں بلکہ اس نے ان کو اکٹھا کرنے کی کاوشیں بھی کیں۔ "مارکس نے فلسفے میں کیا اضافہ کیا ہے۔" ان کے علم میں یہ نہیں کہ اس نے فلسفے کو استعمال کرنا پہلی بار بتایا ہے، کہ دنیا کو تبدیل کرنے کے لیے موجود کو فلاسفائز کیا جائے اور اس کو سوادِ اعظم کے لیے پُر آسائش بنانے کے لیے ان لوگوں کو اکٹھا کر کے جدوجہد کی جائے جن کے لیے موجودہ سماج تکلیف دہ ہے۔ اس نے بے شک فلسفے کی موشگافیوں پر بہت کچھ نہیں لکھا، لیکن اس نے اپنے سیکھے ہوئے فلسفے کو پہلی مرتبہ انسانیت کو دکھ اور تکلیف سے نجات دلانے کے لیے استعمال کیا۔ اس نے موجود استحصالی نظام کا نہ صرف جائزہ فلسفے کے ذریعے لیا، بلکہ آئندہ کے لیے جائزہ لینے کا ایک شان والا طریق کار بھی وضع کر دیا (معیشتی اور فلسفیانہ مسودات، سیاسی معیشت پر تنقید اور سرمایہ وغیرہ)۔

مارکس نے موجود سماج کو دیکھتے ہوئے مستقبل کی پیشین گوئی کرنے کا سائنسی کلیہ انسان کو دیا جس کو آج ہم مارکسی تناظر کے نام سے جانتے ہیں۔ یقیناً متحرک اور اپنے ہی اندر کی چیزوں (مظاہر اور عوامل) کے تعلقات میں بری طرح سے بندھی ہوئی دنیا کی سو فیصد پیش گوئی ممکن نہیں ہے، لیکن جدلیاتی اور تاریخی مادیت کا طریق کار جو کہ دنیا کو یا سماج کو دیکھتا ہی اس کی اپنی حرکت میں، اور اس کے اجزا کو مد نظر رکھتے ہوئے بطور کُل مشاہدہ کرتا ہے، اور کسی بھی چیز، مظہر یا عمل کو دنیا یا سماج کی باقی اشیا (مظاہر اور عوامل) سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھتا، اس لیے یہ ٹھیک ٹھیک پیش گوئی کرنے کی ایسی سائنس بن جاتا ہے، جو کہ سماجی سائنسوں (یونیورسٹیوں میں پڑھائے جانے والے دیگر سطحی علوم) کے مقابلے میں اعلیٰ درجے کی سچائی مہیا کرتا ہے۔

اسی طرح ہمیں لینن کا سماج کو سمجھنے اور اس کو تبدیل کرنے کے لیے کیا گیا فلسفے کا اطلاق دیگر کاموں کے علاوہ خاص طور پر "سامراج، سرمایہ داری کی آخری منزل" اور "ریاست اور انقلاب" میں نظر آتا ہے،

اور لینن اور اس کے ساتھیوں نے اپنے دور میں جس سائنس اور فلسفے کو اپنے سامنے رکھا اس کی کامیابی اور ناکامی کو پوری دنیا جانتی ہے۔

فلسفیانہ مباحث میں سائنس کو جو عمل دخل حاصل ہے وہ شاید فلسفہ کے لیے ریڑھ کی ہڈی گردانا جا سکتا ہے۔ بسا اوقات تاریخ اپنے آپ کو ہی جھٹلاتی چلی جاتی ہے بعینہٖ فلسفہ بھی۔ فلسفہ بھی سائنس کی طرح مسلسل تحقیق کے عمل سے گزر رہا ہے اور اس کو مکمل نہیں گردانا جا سکتا۔ مادیت کے مباحث بھی نظرِ ثانی کے عمل سے دوچار ہیں کیوں کہ آج دنیا مادیت کے مباحث میں ایٹم کے نظریے کی رو سے ڈیماکریٹس کے نظریے سے بہت آگے آچکی ہے۔

ڈیماکریٹس جس چیز کو بطور ایٹم پیش کرتا تھا، وہ آج کے نظریے کے مطابق جرثومے کے مقابلے ہاتھی کو لانے سے بھی مختلف ہوں گے۔ لیکن اس کی سوچ کو غلط قرار دینا ابھی ممکن نہیں ہوا۔ اس نے سب سے چھوٹے ذرے کو ایٹم کہا تھا، نہ کہ اُس ایٹم کو ایٹم کہا تھا، جس کو ہم بطور ایٹم جانتے ہیں، کیوں کہ اس کے بیان کیے گئے ایٹم کا مطلب ہی "ناقابلِ تقسیم" تھا، جس کو توڑنا ممکن نہیں تھا، اگر ہم نے ایک ذرے کا نام ایٹم رکھا اور بعد میں اس کو توڑ دیا تو یہ ڈیماکریٹس کے مادی نظریے کی شکست نہیں ہوئی، بلکہ ہم بھوسے کے آدمی (Straw Man Fallacy) والے منطقی مغالطے کا شکار ہو گئے ہیں، جس میں خود ہی گھاس پھونس کا ایک پتلا بنا دیا جاتا ہے، اور پھر اس کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے ذرات جو تقسیم در تقسیم ہوتے چلے جاتے ہیں ان میں سب سے چھوٹے ذرے کو ہی ایٹم کہا جائے گا۔

اس مثال میں دیکھا جا سکتا ہے کہ سوائے اس کے کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ ڈیماکریٹس کی سائنس کی شکست ہو چکی ہے، سائنس اس کے نظریے کو خود میں سمو کر بہت آگے جا چکی ہے، خود میں سمونے کا ثبوت سائنس کے مانے ہوئے "ایٹم" کو "ایٹم" کے نام سے موسوم کرنا ہے۔ لیکن ڈیماکریٹس کے فلسفے کی شکست ابھی تک ممکن نہیں ہو سکی، کیوں کہ جس چیز کو اس نے ناقابل تقسیم قرار دیا تھا، وہ ہر بار اس معلوم ذرے سے چھوٹا ذرہ قرار پائے گی، جس کو ہم بطور "ناقابلِ تقسیم" کے مان لیتے ہیں۔ بہر حال، یہ مثال دینے سے ہمارا مقصد ڈیماکریٹس کے کسی فلسفے کا دفاع وغیرہ ہرگز نہیں تھا، بلکہ بہت سی ایسی باتوں کی جانب اشارہ تھا جو کہ اسی طرز سے کی جا رہی ہیں۔

آج کا انسان شاید دنیا بھر کے علوم کو مختصر کرتے ہوئے سمیٹنا چاہتا ہے مگر انسانی دماغ کے لیے ناممکن ہے کہ وہ کائنات میں ہونے والے تمام تر عوامل کی تصویر بنا سکے۔ آج کے دور کی جدید سائنس بھی عاجز ہے۔

سائنس کی محاذ آرائی ایک طرف اور انسانی شعور کی طاقت ایک طرف لیکن یہ ممکن نہیں ہو سکا کہ کائنات کے علوم کو شعوری احاطہ میں لایا جا سکے۔ فلسفہ و سائنس اپنی اپنی جگہ پہ کوشاں بھی ہیں اور عاجز بھی۔ پروفیسر سید محمد سلیم اپنی کتاب ''مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ'' میں شعور کی حدود کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''انسانی ذہن کائنات کی کل تصویر جاننا چاہتا ہے۔ جزئی معلومات کی گٹھڑی پر قناعت نہیں کر سکتا۔ مواد کافی ہو یا ناکافی، آغاز سے انسان نے کائنات کے متعلق ایک جامع اور مربوط تصویر بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش کہیں دیومالا کے قصے ہیں اور کہیں فلسفیوں کے نظام فکر ہیں۔ سائنس دان بھی اسی ذہنی افتاد طبع سے مجبور ہیں کہ کائنات کے متعلق جو جزئی معلومات کا ذخیرہ ان کے پاس جمع ہو گیا ہے، وہ ان سب کو سامنے رکھ کر اصل حقیقت تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کوشش میں تخیل آرائی اور ذہنی پرواز سے کام لیے بغیر چارا نہیں۔''(۱۸)

دوسری مثال ہم مادے کی لے لیتے ہیں۔ مادے کی بحث بھی ڈیما کریٹس کے دور سے پہلے کی چلتی آ رہی ہے۔ ہم تک پہنچتے پہنچتے یہ بے شمار شکلیں تبدیل کر چکی ہے۔ جہاں ساری دنیا کے نہ صرف عام انسان بشمول موضوعی عینیت پرست فلسفیوں کے، اپنے روزمرہ کے تمام کام اس حقیقت کو مان کر کرتے پائے جاتے ہیں کہ ہمارے اردگرد موجود مادی دنیا کا ہماری سوچ سے باہر وجود ہے، بلکہ تمام طبعی اور فطرتی سائنسیں بھی یہی مان کر اپنی تحقیقات کے دائرے کو وسیع تر کرتی چلی جا رہی ہیں کہ ہمارے گرد دنیا حقیقت ہے، اس پر کام ہو سکتا ہے، اس کو مسلسل جانا جا رہا ہے، اور اس پر کام کرتے ہوئے اس کو اپنے کام میں استعمال کیا جا سکتا ہے جس سے انسان کی سہولیات کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے، وہیں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو کہ مسلسل یاد کیا ہوا ایک ہی پہاڑا سنانے میں مصروف ہیں کہ ہمارے گرد موجود دنیا کی حقیقت ''غیر مادی' ' ہے۔

یاد رہے کہ یہ باتیں کوئی جاہل یا سنکی انسان نہیں کر رہے بلکہ یونی ورسٹیوں کے ''پروفیسر''، ''فلسفی''، ''دانش ور''، ''شاعر'' اور ''ادیب'' لوگ کرتے پائے جا رہے ہیں۔ شاید عام عوام سے مخالفت میں اپنی سوچ دکھا کر کسی طور ان کی انا کی تسکین ہوتی ہو کہ ''دیکھا ہم ان سے الگ سوچ کے مالک ہیں، ہم ان میں سے نہیں ہیں، ہم کوئی خاص صلاحیتوں کے حامل چنے ہوئے لوگ ہیں'' وغیرہ۔ یعنی ایسی چیزیں ہمیں آئے دن پڑھنے کو، اور ایسی بحثیں سننے کو ملتی ہیں۔

الف) اُستاد بطور فلسفی کی مثالی خصوصیات

فلسفہ کسی بھی قوم کے لیے نظریہ حیات، اقدار اور عقائد کا تعین کرتا ہے تو تعلیم اس کی وضاحت کرتی ہے۔ فلسفہ اور تعلیم ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں اور معلّم اس کو پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ علم اپنی جگہ پر فلسفے کی تعریف کرنے اور اس کی حدود بنانے میں سرگرم عمل ہے اور فلسفہ کی کوشش ہے کہ وہ علم کی حدود کا تعین کر سکے۔ دراصل علم ایک ایسے وسیع و عریض میدان کا نام ہے جس کے گرد ہم جس چیز کی مثال کو بھی دیواریں بنا کر کھڑی کریں گے وہی چیز اس علم کا حصہ بنتی چلی جائے گی۔ امام فخر الدین رازی اپنی تصنیف ''فلسفہ مشرق (مباحث مشرقیہ)'' کے ذریعے علم کی تعریف کے ضمن میں اس نظریہ کا پرچار یوں کرتے ہیں کہ:

> '' یہ شبہہ ہوتا ہے کہ اس (یعنی علم) کی تعریف حد (ذات کی معرفت ذاتیات سے) اور رسم (معرفت بالخاصہ) سے ممتنع ہے۔ کیوں کہ یہی (یعنی علم ہی) ہر چیز کو اس کے ماسوا سے امتیاز کا حکم دینے والا ہے۔ پھر وہ اپنے آپ کو دوسرے سے کیوں کر ممیز کرے گا۔ اور اس لیے بھی کہ جس چیز کے ذریعے سے علم کی تعریف کی جائے گی علم اس سے بھی زیادہ واضح ہے کیوں کہ علم ایک ایسی نفسانی حالت ہے جس کو ایک ذی حیات اپنے نفس کی طرف سے بغیر کسی شک وشبہ کے ہمیشہ پاتا ہے اور جس کی یہ شان ہو اس کی تعریف نہیں ہو سکتی''(۱۹)

تعلیم کے بارے میں مذاہب، اقوام اور مختلف مکاتب ہائے فکر نے اپنی اپنی رائے پیش کیں ہے۔ عمل تعلیم کی انتہا ادراک تک ہی محیط نہیں ہے بلکہ حقیقی عرفان تو دماغوں کی تابانی پر منحصر ہے۔ اساتذہ پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ طلبہ کے لیے ابلاغ کو آسان سے آسان تر بنائیں تاکہ شعور کے پہلو کھلتے رہیں۔ طلبہ جس خبر تک رسائی نہ رکھتے ہوں ان تک رسائی کا ذریعہ ہی دراصل علم و عرفان کی حقیقی منزل ہے۔ کامران اعظم سوہدروی اپنی نظم ''فلسفہ اور اسلام'' میں رقم کرتے ہیں کہ:

علم و عرفاں باعث تاب دماغ
علم و عرفاں زندگانی کا چراغ
جو خبر میری نظر سے دور تر
حکمت و دانائی میں اس کا سراغ (۲۰)

فلسفہ مذہب کا ہو یا اخلاقیات کا، بہر حال لائق تعظیم ہے۔ اسلامی تاریخ میں متعدد ایسے فلسفی گزرے ہیں جنھوں نے اپنے فلسفیانہ نظریات کے بل بوتے پر زندگی کے لیے بے شمار آسان راستوں کا تعین کیا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کی نقاب کشائی کرنے میں مسلم مفکرین نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ نے اپنی سوچ کے زاویے عشق و سرمستی کی جانب موڑتے ہوئے انسان کی ہستی کو ہوس، لالچ اور دیگر بہت سی برائیوں کی جڑ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد نواز کنول اپنی تصنیف ”مولانا جلال الدین رومیؒ ایک مطالعہ“ میں اس عنوان کے تحت مولانا جلال الدین رومی کے افکار کو یوں زیر بحث لاتے ہیں:

> ”آپ نے سرمستی و بے خویشی کا جو فلسفہ دیا ہے اس کی آج بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی ان کے معاصر معاشرے میں تھی۔ اگر غور کیا جائے تو تمام روحانی بیماریاں۔ مثلاً خود پرستی، ہوس، لالچ، غرور، حسد، انتقام جوئی، رقابت، طلب دنیا، شہرت رانی کی جڑ یہی ”ہست“ کا احساس ہے، اس کا علاج سرمستی و محویت، فداکاری، محبت، بے نیازی اور خدا پرستی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔“[۲۱]

فلسفے کا عملی پہلو تعلیم ہے اور تعلیم کا نظریاتی پہلو فلسفہ، گویا یہ ایک دوسرے کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں جس طرح کہ انسانی زندگی کے لیے ہوا، پانی اور خوراک۔ اگر فلسفے کی حیثیت مقصد کی ہے تو تعلیم کی حیثیت طریقہ کار کی ہے۔ فلسفے کو عملی اطلاق کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے تو تعلیم کو فلسفے کی راہنمائی کی ضرورت ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم ایسا عمل ہے جو انسان کی شخصیت کو بہتر نشوونما کے لیے مناسب ماحول فراہم کرتا ہے لیکن اس کے لیے اسے فلسفے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ب) منتخب ناولوں کے کرداروں کا تجزیہ

i۔ پروفیسر سہیل بطور فلسفی (راجہ گدھ)

یہ بانو قدسیہ ہی جانتی ہیں کہ انھوں نے پروفیسر سہیل سے اتنا خوبصورت کردار کیسے ادا کروایا، پروفیسر سہیل یوں تو عمرانیات کے پروفیسر ہیں لیکن شاید اپنے مضمون کے علاوہ باقی بہت سے شعبوں کے بھی ماہر ہیں ”راجہ گدھ“ کے پروفیسر سہیل یوں تو اپنے طلبہ سے چند سال ہی بڑے ہیں لیکن وہ بخوبی جانتے ہیں کہ طلباء کی سوچ پر کس زاویہ سے اور کس وقت حملہ آور ہونا سب سے زیادہ مناسب ہے وہ نصاب پر توجہ دیں یا نہ دیں اپنے طالب علموں کے ذہنوں کے ساتھ جوڑ توڑ کرنا، ان کے نظریات کی آزمائش کرنا، حتیٰ کہ ذہنوں میں

موجود درستی اور بگاڑ کے تمام تر رویوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا ان کا پسندیدہ ترین مشغلہ ہے۔ یہی ہنر پروفیسر سہیل کے پاس تھا جو شیروں کو سدھانے والے استعمال کرتے ہیں۔

بانو قدسیہ کے قلم سے وارد ہونے والا یہ ناول ''راجہ گدھ'' یوں تو تین طلباء اور ایک پروفیسر یعنی پروفیسر سہیل کے گرد ہی گھومتا ہے مگر توجہ طلب امر یہ ہے کہ ''راجہ گدھ'' کے مرکزی کردار ایسی مثلث کا نقشہ پیش کرتے ہیں جس کا مرکز بالآخر پروفیسر سہیل ہی ہیں۔ پروفیسر سہیل اپنی شخصیت میں کئی بار مکمل فلسفی کا روپ دھار لیتا ہے اور کبھی کبھار کسی ناقد کی طرح تنقید کا سہارا لیتا ہے، دوستانہ رویہ اختیار کرے تو انتہائی مشفق دوست کی شکل میں دکھائی دیتا ہے اور جب ان میں ایک مکمل اُستاد جاگتا ہے تو اس میں روایتی اُستاد کا حلیہ بھی دکھائی دیتا ہے۔

''راجہ گدھ'' کے مرکزی کردار پروفیسر سہیل کے فلسفیانہ نظریات ان کے طلباء کے لئے دلچسپی کا باعث بن جاتے ہیں جن سے سیر حاصل مباحث جنم لیتے ہیں۔ پروفیسر سہیل کے نزدیک دنیا میں رونما ہونے والے تمام تر مناظر کا ایک پسِ منظر بھی ہے اچھائی کے راستے پر چلتا ہوا ایک انسان اپنی کوشش سے نہیں چلتا اس کے پیچھے اس کے آباؤاجداد کی عادات کارفرما ہوتی ہیں اسی طرح برائی کا راستہ بھی ہے سوچ کے پیچھے چلنے والی اور عمل کے پیچھے چلنے والی سوچ براہ راست ایک چین ہے، ایک ایسی زنجیر جس میں نہ جانے کتنی کڑیاں موجود ہیں۔

پروفیسر سہیل کا کردار ایک ایسے دوستانہ رویہ کے مالک سربراہ جیسا ہے جو اپنی زندگی میں متعلقین کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے کا ہنر جانتا ہے لیکن اپنے فلسفہ اور نظریہ کے مدمقابل کسی دوسرے کی مناسب و نامناسب یا درست گفتگو کو بھی برداشت کرنے کے ہنر سے ناواقف ہے جیسا کہ پروفیسر سہیل پہلے دن ہی اپنی کلاس میں وارننگ جاری کرتے ہیں:

> ''کلاس میں کبھی کبھی آپ لوگ کچھ ایسے سوال بھی کریں گے جن کا جواب مجھے نہیں آتا ہو گا۔ اور میں بدقسمتی سے اتنا متکبر ہوں کہ سب کچھ برداشت کرتا ہوں، کسی اور کی علمی برتری برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے I warn you جب تک آپ میری کلاس میں رہیں۔ ہمیشہ مجھے گرو سمجھیں۔ میرے علم کو زیادہ مانیں۔ کبھی کبھی یہ بالکل shallow ہو گا۔ آپ خود بات کی تہہ کو بہتر سمجھتے ہوں گے۔ لیکن مجھے اس

بات کا احساس دلا کر آپ کو نقصان ہو گا۔ میری چھاتی چھوٹی ہو جائے گی۔ مَیں اپنی whiskers منوا دوں گا۔ "(۲۲)

بانو قدسیہ معاشرے کی اونچ نیچ سے بخوبی واقف تھی وہ کسی معاشرے کی نفسیاتی سطحوں کو پرکھنا جانتی تھیں جس کا عکس ان کی تحریروں میں واضح طور پر موجود ہے زیر بحث ناول ''راجہ گدھ'' میں بھی ان کا ہاتھ معاشرے کے نبض پر محسوس کیا جاسکتا ہے انھوں نے تلخیوں کی کوکھ سے جنم لیتی ہوئی انتہاؤں کا تذکرہ پروفیسر سہیل کی زبان سے بخوبی کروایا۔

یہاں پر ہمیں پروفیسر سہیل ایک مکمل فلسفی اور ماہر عمرانیات تب دکھائی دیتا ہے جب وہ اپنے طلبہ و طالبات کے درمیان معاشرے کے بھیانک روپ کی تصویر کشی کرتے ہوئے کسی ایک انتہا پر پہنچ کر بحث کے لیے راستے استعمال کرتا ہے اور پھر اس بحث کو کسی اپنے ہی فلسفیانہ نقطہ نظر سمیٹنے کی سعی کرتا ہے انھوں نے جماعت میں خودکشی کا عنوان چھوڑا اور پھر اس کو یوں سمیٹا۔

> ''دراصل خودکشی ایک Symptom ہے۔ کسی معاشرے کے اندر اگر کوئی بیرومیٹر فٹ کیا جائے تو خودکشی اس کا آخری درجہ حرارت ہو گا افسوس مس شاہ ابھی کوئی آدرشی سوسائٹی ایسی نہیں بن سکی اس لئے ہم تجربہ نہیں کر سکتے لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ سوسائٹی کا پریشر پاگل پن کو جنم دیتا ہے اور پاگل پن ہی خودکشی کا باعث ہے۔ "(۲۳)

ایک اُستاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاشرے میں پھیلنے والے عمومی منفی اور مثبت رجحانات کا گہرا مطالعہ رکھتا ہو جبکہ ایک عمرانیات کا اُستاد سماج میں پھیلنے والی خوبیوں اور خامیوں کے پس منظر اور وجوہات کو بھی جانتا ہو تاکہ وہ کلاس میں اپنے علم کے ذریعے بہترین تعلیمی ماحول پیدا کرنے پر دسترس حاصل کر سکے۔

بانو قدسیہ نے بھی اپنے ناول ''راجہ گدھ'' میں موجود پروفیسر سہیل کے کردار کو کچھ انہی بنیادوں پر تحریر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اس کردار میں مصنفہ کے اپنے ذہنی شعور کی سطح اور معیار کا بھی ادراک ہوتا ہے کیونکہ ان کے ناول کا کردار پروفیسر سہیل نہ صرف روایتی اساتذہ کی طرح اپنے طلبہ کے ساتھ رویہ روا رکھتا ہے بلکہ بعض دفعہ کسی جدید اور انتہائی تخلیقی انداز کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے شاگردوں کی تحقیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ان کو نکھارنے کے لیے کوشاں ہے۔

ناول میں پروفیسر سہیل کے کردار کو کچھ اس انداز سے تخلیق کیا گیا ہے کہ اس کی شخصیت میں ڈرامائی تبدیلیاں ماحول کے ساتھ ساتھ رونما ہوتی دکھائی دیتی ہیں لیکن ہر چہرے میں ہی پروفیسر سہیل مکمل فٹ نظر آتے ہیں اور کسی بھی زاویے سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان کا یہ حلیہ بناوٹی ہے دراصل ہر منظر نامے کے ساتھ مصنفہ کی طرف سے ایسے جزئیات مربوط کر دیے گئے ہیں کہ وہاں پر کردار کو اسی انداز میں موجود ہونا ہی مناسب ہے کہ جس میں وہ ہے۔

پروفیسر سہیل طلباء کے ذہنی مشاہدہ کی جانچ کرنے کے لئے ان کو یاد کرنے کی ڈگر سے ہٹوا کر تحقیق اور کھوج پر عمل پیرا ہونے کی تلقین حکماً کرنے کی بجائے یہ صلاحیت ان میں اندر سے ابھارتا ہے تاکہ وہ ذہنی طور پر بھی آمادہ ہو سکیں اور ان کی تحقیق میں خاص قسم کا جوش و خروش بھی موجود ہو وہ اپنے فلسفہ کو اپنے شاگردوں کے ذہن میں غیر محسوس انداز سے ڈالتے ہوئے ان کی زبانوں سے عمل میں لانے کی سمت میں کوشاں ہیں وہ کسی بھی موضوع پر مواد اکٹھا کرنے کے بعد اپنی مرضی سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "that's a point پروفیسر سہیل کی آنکھیں چمکنے لگیں۔
>
> "یعنی ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاگل پن دو قسم کا ہے ______ ایک مثبت ایک منفی۔۔۔۔۔ ویری گڈ ______ اب اس مہینے آپ سب کی یہ assignment ہو گی کہ آپ مجھے ایک نہ ایک وجہ ایسی بتائیں جس سے فرد میں پاگل پن پیدا ہوتا ہے ______ یہ وجہ جبلی نہیں ہونی چاہیے environmental نہیں ہونی چاہیے ______ کوئی بالکل انوکھی وجہ ______ خواہ بالکل۔۔۔۔۔۔ میں سب سے سر پھرے جواب پر سب سے زیادہ نمبر دونگا۔"(۲۴)

بانو قدسیہ نے اپنی زیادہ تر زندگی مشاہدہ میں وقف کی اور باقی زندگی میں انھوں نے اپنا مشاہدہ تحریر کیا تاکہ عام زندگی کی زیادہ تر پیچیدگیوں پر سے پردہ ہٹایا جا سکے انھوں نے جو کچھ اپنے آس پاس محسوس کیا اپنی تحریروں میں جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعے زندہ حالت میں پیش کر دیا اگر بات "راجہ گدھ" کے ضمن میں کی جائے اس کے تمام کردار کہیں نہ کہیں بار بار گنجلک دکھائی دیتے ہیں۔

چاروں مرکزی کرداروں کی حالت یہ ہے کہ کہیں پر انتہائی زیرک فلسفی بن جاتے ہیں اور کہیں کسی مخبوط الحواس کی طرح اپنی زندگی کی چکا چوند میں بھٹکتے دکھائی دیتے ہیں خاص طور پر پروفیسر سہیل کے کردار سے بانو قدسیہ نے زندگی کی بہت سی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی ہے مگر یہ امر بھی قابل بحث ہے کہ پروفیسر

سہیل کے کردار کے بارے پیچیدگی بنا دی گئی ہے کہ رائے قائم کرنا مشکل ہو گیا ہے کہیں پر اسے مکمل اُستاد دکھایا گیا ہے کہیں پر وہ شعبہ تعلیم سے منسلک دیگر اساتذہ کی شخصیت کو مشکوک بناتا دکھائی دیتا ہے۔ پروفیسر سہیل کی شخصیت میں عیاری اور مکاری کا پہلو دکھا کر تدریس کے شعبے سے منسلک کالی بھیڑوں کے کرداروں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے یا یوں کہہ لیں کہ آنے والے کئی ادوار میں والدین کے لئے اپنی اولاد کے بارے میں فکر اور توجہ بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے جو کہ شعوری ہے۔

پروفیسر سہیل اپنی تمام تر منفی سرگرمیوں کے باوجود ایک مکمل فلسفی کے طرز عمل سے کنارہ نہیں کرتا اور یہی بات اسے دیگر کرداروں میں ممتاز بناتی ہے۔ پروفیسر سہیل کے کردار میں ایک دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ وہ خود کو ماڈل بنا کر پیش کرنے یا پھر اپنے فلسفے پر قائل کرنے کے لئے دور دراز کے تھیوریاں پیش کرنے کی بجائے اپنے کارنامے بیان کرنے پر یقین رکھتا ہے اس کی گفتگو میں در حقیقت ایک خاص قسم کی قوت پوشیدہ ہے جو سامعین پر گہرا اثر ڈالتی ہے اور تاثر متعدد بار اس حد تک جا پہنچتا ہے کہ سننے والا قائل تو الگ ہوتا ہے اس کی شخصیت کی طرف مائل بھی ہو جاتا ہے۔ پروفیسر سہیل اپنی بات کو دوسروں کے دل میں اتارنے کا ماہر ہے وہ اپنی گفتگو میں ماضی، حال، مستقبل کو ساتھ چلانا بھی جانتا ہے ماضی، حال، مستقبل بلکہ روشن مستقبل کا فلسفہ اپنی گفتگو کا حصہ بناتا ہے۔ وہ زندگی کے ماضی و حال و مستقبل کا زائچہ وقت کے دائرے میں الفاظ کے ذریعہ بناتا ہے پیش آمدہ مسائل کی وجوہ جاننے کی کوشش کرتا ہے بلکہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے پروفیسر سہیل کے مطابق بیماری کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ یہ ہماری خود کی پیداوار ہے یہی فلسفہ ذیل میں پیش ہے۔

> ”قیوم! جب میں سات سال کا تھا گولیور کے سفر نامے ختم کر لیے تھے، نو سال کی عمر تک میں عمر خیام کی رباعیوں سے پار ہو چکا تھا، دسویں میں ایچ جی ویلز اور ایڈ گر ایلن پو میرے پسندیدہ ادیب تھے۔ حد تک سبھی میرے جیسے ہو۔ موجودہ عہد کی پڑھی لکھی گم گشتہ روحیں ہو۔ ارے یار میں نے ایک لڑکی کا نام لیا ہے تمہیں ۴۴۰ وولٹ تو نہیں لگا دیئے۔“(۲۵)

راجہ گدھ میں جو فلسفہ پیش کیا گیا ہے وہ عامیانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خاص بھی ہے۔ پروفیسر سہیل کی زبانی اس بات کو مزید آگے یوں بڑھایا گیا ہے:

> ”پڑھائی نے میری زندگی کو آسان نہیں بنایا۔ ہاں مجھ میں ایک وجدان پیدا کر دیا ہے۔ اب میں جانتا ہوں کے السر hypertension, anxiety/اعصابی بیماری

دراصل بیماریاں نہیں ہیں، یہ ماڈرن تعلیم یافتہ حساس انسان کا مقدر۔ کبھی ملیریا کبھی
طاعون چیچک کی وبائی شکل۔ یہ السر آج کے انسان کی ایجاد ہے اور مائی ڈیئر فرینڈ اینڈ
اسٹوڈنٹ اس کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں کیوں کہ ڈاکٹر صرف دوا دے سکتا ہے
relax نہیں کرو اسکتا بچے۔"(۲۶)

پروفیسر سہیل "راجہ گدھ" کا ایک ایسا کردار ہے جس کو پورے ناول کا محور و مرکز کہا جا سکتا ہے وہ اپنے فلسفیانہ نقطہ نظر کی بنا پر کہانی کے اتار چڑھاؤ اور دیگر کرداروں کی کہانی کے ساتھ منسلک رہنے کے لئے راہیں ہموار کرتا ہے۔ بانو قدسیہ "راجہ گدھ" میں اپنے کرداروں کو جس طرح سے استعمال کرتی ہے اور ان کی شخصیت سازی کے لیے ایک ہی بنیادی کردار سے رہنمائی کرواتی ہیں یہ ان کا ملکہ ہے۔ پروفیسر سہیل کی مکمل فلسفیانہ گفتگو اس بات کی عکاس ہے کہ بانو قدسیہ اپنے قارئین کی سوچ کے دائرے اور محور کی حدود کو جانتی ہیں اس وجہ سے وہ گو کہ اپنے طلبہ کے ساتھ ہیں پروفیسر سہیل کی فلاسفی اس طرح سے بانٹتی ہیں کہ عام سادہ لوح قاری بھی ہر بحث و تکرار سے پوری طرح لطف اٹھا سکے حتیٰ کہ وہ خود کو اس منظر نامے کا حصہ محسوس کر سکے۔

بانو قدسیہ پوری طرح جانتی ہیں کہ موجودہ تعلیمی نظام انسان کو فقط جان کاری دیتا ہے شعور نہیں اور اس نظریہ کو پروفیسر سہیل کے فلسفیانہ لب ولہجے سے قیوم کے سامنے اس طرح سے اگلواتی ہیں کہ ہر قاری تعلیم کی حقیقی ہیئت اور اصلی شکل و شباہت سے شناسائی حاصل کر لے۔ پروفیسر سہیل اپنے شاگرد سے اس بات کا نظریہ پیش کرتا ہے کہ تعلیم کا موجودہ نظام انسان کو کسی کنارے تک نہیں پہنچاتا بلکہ مزید سوالات اور تجسس میں الجھا دیتا ہے۔ انسان مزید سے مزید تر سیکھنے کی بجائے مزید سے مزید تر جاننے کی تگ و دو میں مصروف عمل ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"تعلیم میں ایک برائی ہے قیوم ______ اس کی وجہ سے قوموں میں مجموعی طور پر
اور فرد میں علیحدہ علیحدہ بہت تجسس پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تجسس اسے گھسیٹے پھرتا ہے
ایسے سوالات دل میں ابھرتے ہیں جن کا جواب تعلیم نہیں دے سکتی ______ خدا
کی قسم میں بہت پڑھنے لکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ ان سوالات کی وجہ سے
______ ان ادھورے جوابوں کی وجہ سے ماڈرن آدمی میں ایک بے نام جستجو پیدا
ہو جاتی ہے جیسے کوئی کتا اپنی دم کے تعاقب میں چکر لگاتا ہے ______ بھائی میرے

کوئی کب تک بے نام جستجو میں مبتلا رہ کر السر سے بچ سکتا ہے دیوانگی کے سامنے بند باندھا سکتا ہے۔ ''(۲۷)

فلسفہ علوم کی وہ منزل ہے جہاں پر انسانی ذہن مختلف گتھیاں سلجھانے کے بعد نتائج تک پہنچ جاتا ہے یا یوں کہ شعور کے تمام راستوں کی انتہا فلسفے پر ہوتی ہے جس طرح روشنی کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا بالکل اسی طرح فلسفے کی حدود پر بند باندھنا حماقت ہے۔ ہاں مگر یہ تسلیم کرنا امر لازم ہے کہ ہر کوئی اپنی شعوری سطح اور ادراک کی حدوں تک کسی معاملے کی فلاسفی کو جانچ پاتا ہے اور اس کے لئے اس معاملے کے فلسفہ کی حد آخر یا حد انتہا وہی نقطہ ہے جو کہ اس کے اپنے ادراک کا ہے۔

''راجہ گدھ'' کی مصنفہ زندگی میں عروج و زوال کی حدود کے فلسفے کو بھی جانتی ہیں اور وہ جستجو اور امید کے باہمی ربط کا فلسفہ بھی سمجھتی ہیں۔ وہ اپنی فلاسفی بیان کرنے کے لیے اپنے کرداروں میں سے پروفیسر سہیل کا انتخاب اس لیے کرتی ہیں کہ یہ کردار اس ناول میں سب سے زیادہ جاندار ہے ویسے بھی پروفیسر سہیل کی اہمیت اس ناول میں ایک اُستاد ہونے کے ناطے زیادہ ہے کیونکہ اس کی گفتگو دیگر کرداروں میں زیادہ اہمیت کی حامل تسلیم کی جاتی ہے پروفیسر سہیل کی زبانی بانو قدسیہ کی فلسفہ نگاری کا یہ مظہر انتہائی قابل ذکر ہے جب پروفیسر سہیل یوگا کی اہمیت وافادیت بیان کرتے ہوئے انسان کے کسی مثبت نتیجہ پر پہنچنے کے لیے جستجو اور امید کا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ پروفیسر سہیل اپنی گفتگو کے دوران مکالمہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

''دراصل تمہیں اس وقت شکتی کی ضرورت ہے جو تم میں امید کو زندہ کرے______ جستجو میں اگر امید کا عنصر شامل نہ ہو تو انسان کسی مثبت نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ اور تنتر ایوگا سادھکا میں اس قدر امید پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کبھی کبھی موت پر بھی حاوی ہو جاتا ہے______ سادھکا کے مطلب جانتے ہو؟

جی۔۔۔۔۔۔۔۔یوگا کرنے والا''(۲۸)

وقت کا پہیہ اپنی روانی سے چلتا رہتا ہے۔ لوگ زندگی گزارتے بھی ہیں اور جیتے بھی ہیں، سوچیں ارد گرد گھومتی ہیں اور تجسس بھی پیدا کرتی ہیں مگر وقت نہیں رکتا۔ ہم اپنے آس پاس ہونے والے مختلف واقعات کو ذہن نشین بھی کرتے جاتے ہیں ہم اپنے گرد و پیش ہونے والے مختلف واقعات کو یاد بھی رکھتے ہیں اور بھلا بھی دیتے ہیں مگر وقت کی رفتار کم یا زیادہ نہیں ہو پاتی۔ ہمیشہ ہماری سوچ ارتقائی سفر پر گامزن رہتی ہے

اور ہم کچھ نہ کچھ نیا ذہن میں نقش کرتے اور مٹاتے ہوئے گزر جاتے ہیں یہ سب عوامل کچھ ایسے چلتے ہیں کہ ان میں ہمارے چاہنے اور نہ چاہنے کا عمل دخل بہت کم ہوتا ہے۔

بانو قدسیہ وقت کی اس ڈگر کو پہچانے کے حوالے سے کافی زیرک واقع ہوئی ہیں وہ اس اتار چڑھاؤ کے سنگم تک رسائی رکھتی ہیں یا شاید ان کی کھوج کا کینوس بہت وسیع ہے کہ انتہائی پیچیدہ اور گنجلک معاملات کو چھوٹے چھوٹے اور آسان فقرات میں پرو کر اپنے قارئین کو سب کچھ سکھانے یا سمجھانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں جو ان کا ہدف ہے۔

بانو قدسیہ نے بہت سے دیگر نظریات کی طرح تعلیمی نظام پر بھی کڑی نظر جماتے ہوئے مختلف نظریات قائم کیے ہیں جو کہ حقیقت اور سچائی سے قریب تر ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیق ''راجہ گدھ'' کے کرداروں کو اس طرح تخلیق کیا ہے کہ ان کے چال چلن میں رونما ہونے والی تبدیلیوں بلکہ بہت بڑی بڑی تبدیلیوں کے باوجود بھی تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا وہ جانتی ہیں کے ہمارا تعلیمی نظام رٹہ ازم پر چل رہا ہے۔ طلبہ میں جدت و ندرت کے نمایاں پہلو، خیالات کی صورت میں نہیں ہیں۔ نمبر حاصل کرنے کی جستجو میں کتابیں یاد کرنا اور مختلف کتابوں کے حوالے دینا ہی آج کے دور کا علم ہے وہ اس سوچ کو پروفیسر سہیل کے فلسفیانہ نقاط میں شامل کرتی ہیں پروفیسر سہیل ''راجہ گدھ'' میں اپنے دیگر نظریات کے ساتھ ساتھ نظام تعلیم کا موجودہ فلسفہ بحسن وخوبی یوں بیان کرتے ہیں:

> ''آج میرے دل پر بہت بوجھ تھا______ میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا مل جائے جس کے ساتھ میں اپنی تھیوری share کر سکوں۔ You Know قیوم______ اب طالب علم بہت مکینیکل ہو گئے ہیں وہ متجسس نہیں رہے۔ وہ علم دوست نہیں رہے وہ______ اچھا ہوا مجھے تم مل گئے میرے دل پر بہت بوجھ تھا آج۔''(۲۹)

پروفیسر سہیل کی یہ بات سن کر قیوم کو حیرت ہوئی کہ کیا وہ واقعی اس قابل ہے کہ ایک پروفیسر اس کے ساتھ اپنی تھیوری شئیر کرنا چاہتا ہے وہ حیران ہو کر پروفیسر کو غور سے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید پروفیسر کے فلسفے کا رخ آج سیمی کی طرف ہو گا۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کچھ یوں آگے بڑھتی ہے:

> ''میرا دل دھک دھک کرنے لگا______ خیال تھا کہ وہ سیمی کے متعلق کچھ بتائے گا۔

"تم کو یاد ہے کہ ایک بار میں نے تمہیں ایک Assignment لکھنے کو دی تھی______ دیوانگی کی وجہ۔۔۔۔

"میں کئی سال لڑکوں کو یہی assignment دیتا رہا ہوں لیکن آج تک کسی سٹوڈنٹس نے کوئی نئی بات نہیں کی______ اب میں نے یہ سوال پوچھنا چھوڑ دیا ہے سب کتابوں سے چرا کر لکھ لاتے ہیں۔"(۳۰)

سوچ کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں ہمارے یہاں پر اس طرح کی سوچ زیادہ پروان چڑھتی ہے اول یہ کہ لوگوں کے پاس اپنے نظریات بہت زیادہ ہیں وہ بے شک کارآمد ہو یا فضول، دوم یہ کہ کچھ اہل مغرب نے عطا کر دیا۔ پھر چاہے دیگر تمام مفکرین انتہائی مضبوط فلسفیانہ نقطہ نظر پر یکجا ہی کیوں نہ ہو جائیں مگر یہ دوسرا طبقہ مغربی افکار کے ساتھ مباحثہ گرم کرتا دکھائی دیتا ہے۔

بانو قدسیہ کے نزدیک دوسرا طبقہ لائقِ تنقید ہے کیوں کہ یہ دوسری سوچ درحقیقت ایک غلام سوچ ہے جس کے پیچھے بھی خاص منطق سمجھ نہیں آتی سوائے اس کے کہ یہ مغرب زدہ سوچ دراصل اہل مغرب کی ترقی اور دکھاوے کی چکا چوند سے مرعوب ہونے کا دوسرا نام ہے وہ اپنے ناول "راجہ گدھ" کے ذریعے لوگوں کو اس سوچ سے نکالنے کی سعی کرتے ہوئے پروفیسر سہیل کے الفاظ میں مغرب زدہ سوچ پر تنقید کرواتی ہیں۔ پروفیسر سہیل کسی عظیم فلسفی کی طرح اہل مغرب کے نظریات کو تنقید کا نشانہ بنانے کی بجائے اپنے لوگوں کو تنقید کے نشتروں پر لینے کے لئے اس طرح گویا ہوتے ہیں:

"سہیل نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولا" bastard کہتے تم سچ ہو لیکن جب میری ساری بات سنو کے تو شاید اپنی رائے بدل لو گے جیسے میں اپنے متعلق اپنی رائے بدل چکا ہوں، Radiation, Tranqulizers اور ایسی ہی زہریلی دوائیوں سے Genes میں خطرناک Mutation ہو جاتی ہے۔ آج کا مغربی سائنس دان اس حقیقت سے بہت خوفزدہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ان باتوں سے تغیر تو ہوتا ہے لیکن مکمل نہیں ہوتا۔ تغیر پذیر gens لولا لنگڑا ہو جاتا ہے اور آنے والی نسلوں پر بڑے خطرناک نتائج مرتب ہوتے ہیں۔"(۳۱)

پروفیسر اور قیوم کے درمیان گفتگو کرنے کے لیے بانو قدسیہ نے ایسی فضا قائم کی ہے جس سے ان کے درمیان کوئی ڈر یا خوف والی بات نہیں ہے دونوں ایک دوسرے سے بلا جھجک سوال و جواب کر لیتے ہیں۔

پروفیسر سہیل اپنے نظریے کا ذکر کرتا ہے اور قیوم کی حیرانی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جینز اور ان کے اثرات کے متعلق نظریے کو وہ مثالوں کے زریعے سمجھنا چاہتا ہے۔ یوں پروفیسر سہیل سے قیوم ان کے نظریے کو سمجھنے کے لیے سوالات کرتا ہے اور مثال کا طلب گار ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"کوئی مثال سر۔"

مثلاً دو سروں والا بچہ ______ چھ انگلیوں والی اولاد ______ ماتھے کے درمیان تیسری آنکھ والی مخلوق ______ ایسے Gene کے نتائج کچھ ہی ہو سکتے ہیں۔ بازو نہ ہوں سرے سے ______ لیکن میں نے ایک اور وجہ بھی دریافت کی ہے ______ ایک نئی اور انوکھی وجہ جس سے genes تغیر پذیر ہوتے ہیں اور دیوانگی ہوتی ہے ______ غور سے سنو ______ یہ مغرب والے جب یہی نتیجہ اخذ کریں گے تو تم جیسے چرکٹے اسے فوراً اپنا لیں گے۔ لیکن اپنے آدمی کا اعتبار نہیں کریں گے یہی سیاہ آدمی کی پسماندگی کی وجہ ہے۔"(۳۲)

دنیا کے کم و بیش تمام مذاہب کے پسِ منظر میں حلال اور حرام کے تصورات کی بنیاد موجود ہے۔ حلال و حرام کا فلسفہ بنیادی طور پر مذہب کا فلسفہ تصور کیا جاتا ہے حالانکہ اس میں ہمارے عوامل اور سوچ بہت حد تک کار فرما ہو سکتی ہے۔ حلال و حرام کا نظریہ کسی بھی معاشرے کو بہتر سے بہترین کی جانب گامزن کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس پر عمل پیرا ہوا جائے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ نظریہ ہمارے یہاں حلال اور حرام کا بہت تاکید سے زیر بحث آتا ہے اس پر بڑے بڑے مباحث عمل میں آتے ہیں برصغیر میں بالعموم مذہب ہی ایسا موضوع ہے جس پر بحث کرنے کے لیے تعلیم کو ضروری نہیں سمجھا جاتا بلکہ ہر شخص اس کے مباحث میں حصہ ڈالنا اپنا حق گردانتا ہے ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ حلال اور حرام کمائی انسان کی شخصیت کو متاثر ضرور کرتی ہے مگر لوگ حرام سے باز آنے کی کوشش نہیں کرتے۔

بانو قدسیہ کے ہاں حرام کا تصور عامیانہ ہے ان کا فلسفہ کسی دیومالائی کہانی کا حصہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک حرام کھانے کا اثر اگلی نسلوں کے عمل پر پڑتا ہے آپ کی حرام کاریاں نسل در نسل منتقل ہوتی ہیں۔ بانو قدسیہ نے اپنے ناول "راجہ گدھ" میں پروفیسر سہیل کو اس بحث کا مہرہ بناتے ہوئے اپنی اس سوچ کا پرچار کیا ہے۔ پروفیسر سہیل جو کہ ماہر عمرانیات ہیں لیکن ہر عنوان پر فلسفیانہ بحث کے عادی ہیں حلال و حرام جیسے فلسفہ پر بھی دلائل دیتے نظر آتے ہیں ان کے نزدیک حرام کھانا یا حرام پر عمل پیرا ہونا انسان کو فوری

طور پر بے شک نقصان نہ پہنچائے لیکن حرام کاری یا حرام نوشی اس کے Gene کا حصہ بن جاتی ہے جو کے اگلی نسلوں میں منتقل ہو کر اپنا رنگ دکھاتی ہے ”راجہ گدھ“ میں پروفیسر سہیل کی زبان سے بحث کروائی گئی ہے کہ:

> ”مغرب کے پاس حرام و حلال کا تصور نہیں ہے اور میری تھیوری ہے جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی genes کو متاثر کرتا ہے رزق حرام سے ایک خاص قسم کی Mutation ہوتی ہے جو خطرناک ادویات شراب اور radtiation سے بھی زیادہ مہلک ہے۔۔۔۔ ۔ حرام کھانے کا لپکا پڑجاتا ہے ،وہ من حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہے ــــــ کیوں اب بتاؤ یہ بات مغرب کے علم سے مستعار لی ہے کہ مشرق سے ؟“(۳۳)

قیوم پر پروفیسر کی باتوں کا اثر ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے کیوں کہ پروفیسر سہیل نے حلال اور حرام کے فلسفے کو ایک نئے رنگ سے پیش کیا تھا جو اس کا اپنا فلسفہ ہے قیوم سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈبکیاں کھانے لگتا ہے اور مسلمانوں کے حلال حرام کے تصور کو ذرا اپنے ذہن میں لاتا ہے۔ مسلمانوں میں حلال و حرام کا تصور نہ صرف موجود ہے بلکہ اس قدر راسخ ہے کہ ایک حرام جانور (خنزیر) کا نام زبان پر لاتے ہوئے بھی ایک عام مسلمان کو ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ وہ لاعلمی میں اس کا گوشت معدہ میں چلے جانے پر اس کی تلافی کے لیے کفارہ دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، اور کسی ایسے شخص سے جسے وہ عالم دین سمجھتا ہے رجوع کیے بغیر اسے اطمینان کی کیفیت حاصل نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حلال و حرام کے تصور سے آزاد ”فری سوسائٹی“ کا جو فلسفہ گزشتہ دو صدیوں سے مسلمانوں کو گھول کر پلانے کی مسلسل اور عالمگیر کوشش جاری ہے وہ مسلمان معاشرہ کے ایک عام فرد کو ہضم نہیں ہوا۔ اور اس کے دل و دماغ پر نقش حلال و حرام کا فرق ابھی تک کھرچا نہیں جاسکا۔

اس کے ساتھ ہی تصویر کا دوسرا رخ ذہن کو مسلسل کچوکے دے رہا ہے کہ حرام سے بچنے کے خواہشمند مسلمان کے سامنے حلال و حرام کا نقشہ پوری طرح واضح کیوں نہیں ہے؟ اور ایک حرام سے بچنے کی کوشش کرنے والا مسلمان دوسرے کئی حراموں کی دلدل میں کیوں پھنسا ہوا ہے جو حرام ہونے میں اس پہلے حرام سے کسی درجہ میں بھی کم نہیں ہیں۔ مثلاً قرآن کریم نے خنزیر کو حرام قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ سود، جوا، شراب اور زنا کو بھی حرام کہا ہے۔ حتیٰ کہ سود کے بارے میں کہا گیا کہ سود کھانے پر اصرار اللہ تعالیٰ اور

اس کے رسول ﷺ کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہے۔ جوئے اور شراب کے بارے میں تو قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ گندے اور شیطانی کام ہیں۔ جبکہ زنا کے بارے میں یہ حکم دیا گیا کہ اس کا ارتکاب تو کجا اس کے قریب بھی مت جاؤ، یعنی ان اسباب سے گریز کرو جو انسان کو اس برے عمل کے قریب لے جاتے ہیں۔

یہ سب حرام ہمارے معاشرے میں اس قدر سرایت کیے ہوئے ہیں کہ ان کی تباہ کاریوں اور حشر سامانیوں کو دیکھنے اور بھگتنے کے باوجود ان سے چھٹکارے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔ زنا نے ہماری معاشرتی زندگی کو، جبکہ سود اور جوئے نے معیشت کے ڈھانچے کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ بالخصوص سود اور جوئے کی وبا تو اس قدر عام ہو چکی ہے کہ شاید جاہلیت کے اس دور میں بھی ان کی آج جیسی مروجہ صورتیں اور شکلیں موجود نہ ہوں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خرابیوں سے انسانی معاشرے کو پاک کیا تھا۔ اور یوں لگتا ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ نے یہ پیشین گوئی فرمائی تھی کہ ایک روز آئے گا جب سود اس قدر عام ہو جائے گا کہ جو شخص سود نہیں کھانا چاہے گا اس کے سانس کے ساتھ سود اس کے جسم میں داخل ہو گا۔ یہ باتیں ایک مسلمان کے لیے انتہائی پریشان کُن ہیں اور یہی باتیں قیوم کے دماغ میں ہل چل مچا دیتی ہیں وہ پروفیسر کی باتوں کا اثر لیتا ہے اور حیران ہو کر پروفیسر کا منہ تکنے لگ جاتا ہے اور پروفیسر اپنے فلسفے کو بیان کرتے ہوئے اہلِ مغرب اور ان کے کارستانیوں کا ذکر کرتا ہے:

> ”یاد رکھو ابھی مغرب والے یہاں تک نہیں پہنچے ________ جب ہم سور کا گوشت نہیں کھاتے تو وہ حیران ہوتے ہیں۔ جب ہم بکرے پر تکبیر پڑھ کر اسے حلال کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ تو وہ سمجھ نہیں سکتے ________ بھائی میرے کیسے سمجھیں حلال و حرام کا تصور انسانی نہیں ہے اس لیے ________ اس میں بہت بھید ہے گہرا بھید gene mutation کا ________ حلال حرام کی حد سب سے پہلے بہشت میں لگائی تھی اللہ نے۔“(۳۴)

پروفیسر سہیل کے اس نظریہ کو ان کا شاگرد عجیب سمجھتا ہے اور سوال اٹھاتا ہے تو وہ اس کی مزید وضاحت پیش کرنے پر اتر آتے ہیں الغرض یہ کہنا بے جا نہیں ہو گا کہ بانو قدسیہ نے اس فلسفہ کا نچوڑ نکالنے کی کوشش کی ہے مزید بحث ملاحظہ ہو:

"لگے گی لگے گی لگتی رہے گی۔ کیوں کہ بات کرنے والا ایک معمولی مشرقی آدمی ہے تمہارے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نیو کیمپس پر چلنے والا______ کہیں جو یہ نظریہ کسی مغربی فلاسفر کے منھ سے سن پاتے۔۔۔۔۔۔۔ خود رزق حرام کھاتے ہیں اور آنے والی نسلوں کو پاگل پن کی وراثت genes میں پیک کر کے عطا کرتے ہیں۔ بیٹا، نہ سہی پوتا سہی۔ پوتا نہ سہی چند نسلیں آگے کوئی شریف النفس بچی سہی______ اس تقدیر سے کوئی بچ نہیں سکتا جو genes میں لکھی جاتی ہے۔"(۳۵)

بانو قدسیہ نے اپنے شعور کی حدود کو وسیع تر کرتے ہوئے سماج کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔ "راجہ گدھ" میں پیش کردہ حلال و حرام کا نظریہ اس بات پر دال ہے کہ بانو قدسیہ عمومی شعور پر بھی انتہا درجہ کی دسترس رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنے شعور کا ہر زاویہ آزماتے ہوئے قارئین کو معاشرتی زندگی کے اسباق مہیا کیے ہیں۔ "راجہ گدھ" کے کرداروں میں مختلف سماجی چہروں کی تصویر پیش کرتے ہوئے اچھائی اور برائی کا حقیقی تصور پیش کرنا ہی اس ناول کا اہم ترین عنصر ہے۔ اگر دوسرے لفظوں میں کہا جائے حلال و حرام کا فلسفہ پروفیسر سہیل کی زبانی بیان کیا گیا ہے اور یہی اس ناول کا مقصد ہے تو بے جا نہ ہو گا۔

ii۔ پروفیسر بطور فلسفی (دیوار کے پیچھے)

وقت کے دائرہ میں موجود تمام تر حقیقتیں اپنے وجود میں ناتمام ہیں اور اپنی تکمیل کی جانب گامزن ہیں۔ انسان اپنی مختصر سی زندگی میں وسیع و عریض سوچوں کو جگہ دے بیٹھتا ہے اور پھر ان تمام نامکمل سوچوں کو دماغ میں لیے اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتا ہے یہی تو اس زندگی کی حقیقت ہے ہم اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے دوسروں کی خوشیوں کا گلا گھونٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

کیا عجیب بات نہیں یہ کہ ہم اپنے آپ کی تکمیل کے لیے دوسروں کی تنقیص کی طرف کوشاں ہو جاتے ہیں یہی کھینچا تانی ہی ہمیں موت کی وادیوں کی جانب گھسیٹتی چلی جاتی ہے اور آخر کار ہم اپنی انتہا کو جا پہنچتے ہیں۔ کوئی زیر زمین چلے جاتا ہے تو کسی کو جلا دیا جانا ہی اس کی آخری رسم ہوتی ہے۔

انیس ناگی کے ناول "دیوار کے پیچھے" کی کہانی میں اس فلسفہ پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی تحریر اس حقیقت کی نقاب کشائی کرتی ہے کہ دراصل حقیقی فساد کی جڑ تو زندگی ہی ہے زندگی کو قتل کر دیا جانا چاہیے تاکہ نا کوئی اس کی تکمیل کے لیے دوڑے اور نہ ہی کوئی فساد برپا ہو۔ یہاں پر طاقت کو آگے بڑھنے کا حق ہے، جھوٹا اس ڈھٹائی سے جھوٹ پر ثابت قدم ہے کہ سچائی شرمسار ہے۔ موت کے انتظار میں زندگی

گزارنے کے لیے ہزاروں تکالیف برداشت کرنا ایک ایسا فلسفہ ہے جس کی رو میں ہر انسان بہتا چلا جاتا ہے ۔انیس ناگی نے اسے یوں بیان کیا ہے:

> ''ابھی تک کوئی راہ نظر نہیں آئی صرف یہی جانتا ہوں کہ مجھے اپنے علاوہ دوسروں کا دفاع بھی کرنا ہے انسان انسان پر حملہ آور ہے انسان انسان کی مصیبت ہے انسان انسان کو عافیت نہیں دے سکتا۔۔۔ قابیل کی اولاد ہوں، میں اپنے مکر سے تمہارا شجرہ نسب ادھیڑ دوں گا تمہیں بعد میں پتہ چلے گا کہ میں اپنی طاقت کے ذریعے تم سب کو بیوقوف بنایا ہے۔۔۔نئے عزم کا ظہور ہو چکا ہے۔۔۔۔ یہ میری خانگی زندگی کا سب سے اہم دن ہے۔''(۳۶)

زندگی کی بھیڑ بھاڑ میں بھاگم بھاگ دوڑتا ہوا انسان خود تو ناشکرا ہے لیکن دوسروں کو قناعت پسندی کا درس دیتا دکھائی دیتا ہے۔ حوس پرستی کا دور دورہ ہے۔ خواہشات کے پیچھے بھاگتا ہوا انسان اچھائی اور برائی کے درمیان فرق کو نہیں سمجھتا۔ موجودہ زندگی دراصل حقیقی زندگی پر ملمع ہے ہم زندگی کے اصل چہرے کو بہت سے رسمی پردوں سے ڈھانپ کر دنیا کے سامنے خود کو خوبصورت ظاہر کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

قناعت پسندی کا بہروپ اوڑھے ناشکری کی دلدل میں دھنستے چلے جارہے ہیں مگر اپنا چہرہ خود بھی دیکھنے سے کنارہ کش ہیں۔ ہمارے آئینے بھی جھوٹ بولنا سیکھ چکے ہیں وہ ہمیں ہمارا اصلی چہرہ دکھانے کی بجائے اس بہروپ کی شکل دکھاتے ہیں جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ علم انسان کو آگہی دیتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے وہ دنیا میں کیوں آیا ہے۔ علم کے تصورات پر غور کرنے سے ہی اس کی افادیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ علم کے بنیادی تصورات میں افلاطون کے نظریے کو خاصی اہمیت حاصل ہے ۔سعید انصاری کے بقول افلاطون نے علم کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب ''اکابر تعلیم'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''افلاطون نے علم کی تین قسمیں قرار دی ہیں: (ا) پہلی قسم علم کی وہ ہے جو حواس کے ذریعے آتا ہے، جیسے ترز، سرد، نرم، رنگین وغیرہ۔ اس کے نزدیک حواس کے ذریعے جو علم آتا ہے وہ زیادہ صحیح نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ خود حواس حقیقی نہیں ہیں۔(۲) دوسری قسم علم۔۔۔۔ عام تصورات اور مجرد خیالات اس قسم کے علم میں داخل ہیں۔ حسن، عدل، نیکی وغیرہ کے تصورات کبھی تجربے سے حاصل نہیں ہوتے۔ وہ خلقی ہوتے ہیں۔''(۳۷)

علم کے تصور کی ابتدا سے لے کر اب تک انسان فلسفے کی گہری کھائی میں دھنستا چلا جا رہا ہے یہ دراصل فلسفے کی کھائی نہیں ہے فلسفے کے پاس تو نتائج ہیں، حقیقت ہے۔ یہ تو خود فریبی کا گہرا گڑھا ہے۔ ہر کوئی خود فریبی میں مبتلا ہے، یہی تو حقیقت ہے اس بے حقیقت زندگی کی۔

انیس ناگی کی زبان سے ''دیوار کے پیچھے'' کے سب مناظر کا فلسفہ انتہائی خوبصورتی سے زینت قرطاس بنا ہے وہ اس حقیقت کا پردہ فاش کرنے کے لیے اپنے ناول کے کرداروں کو استعمال کرتا ہے اور اس حسن و خوبی سے تکمیل تک پہنچاتا ہے کہ سوچ سے بعید محسوس نہیں ہوتا۔ ملاحظہ ہو:

> '' مجھے پہلے بہت سی چیزوں سے اختلاف تھا لیکن ہمیشہ مصالحت اور مفاہمت کو ترجیح دیتا تھا لیکن اب میری طبیعت آمادہ فساد معلوم ہوتی ہے نہیں ابھی نہیں مجھے صبر اور قناعت سے کام لینا چاہیے لیکن قناعت ضرورتوں کا پیٹ نہیں بھر سکتی اگر قناعت واقعی قابل عمل فلسفہ ہے۔۔۔۔۔ موت کے بعد کی خاموشی کے بارے میں ہر کوئی خاموش ہے میرا رجعت کے وعدہ پر یقین نہیں کیونکہ ہر شہر کے شہر خموشاں کا رقبہ ہر روز بڑھتا جا رہا ہے۔''(۳۸)

انیس ناگی زندگی کے چلن سے مایوس ہے۔ اس نے پروفیسر کو ایک ایسے کردار کے طور پر پیش کیا ہے جو دنیا اور دنیاداری کی حقیقت کو چیخ چیخ کر بیان کرنا چاہتا ہے اس کا فلسفہ زندگی کے بارے میں بہت مختلف ہے۔ وہ لوگوں کو گمراہ سمجھتا ہے۔ لوگوں کے اس نظریہ پر تنقید کرنا چاہتا ہے کہ تعلیم ہی سب کچھ ہے وہ چاہتا ہے کہ لوگوں پر ظاہر کر دے کہ تعلیم میں سوائے مایوسی کے کچھ نہیں رکھا۔ لوگ جھوٹ بولتے ہیں کہ تعلیم شعور دیتی ہے تعلیم تو آپ کو آپ کی پہچان بھی نہیں کروا پا رہی۔ پروفیسر اپنی زندگی کو بطور نمونہ پیش کر کے ثابت کرنا چاہتا ہے کہ دراصل تعلیم انسان کو راہ راست سے بھٹکا رہی ہے وہ تو انسان کو یہی بتانے سے قاصر ہے کہ تعلیم کے اصل مقاصد کیا ہیں۔

وہ معاشرے کو اپنی فلسفے کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سوائے جھوٹ کے کچھ بھی نہیں۔ کوئی حقیقت بھی سامنے نہیں آتی۔ یہاں سب کچھ دکھاوے کے لیے ہے۔ سب بہروپ ہے۔ وہ جب اپنے مکان سے باہر دیکھتا ہے اور اسے ننھے منے بچے تعلم کی دلدل میں قدم رکھتے دکھائی دیتے ہیں تو وہ چلانا چاہتا ہے، چیخنا چاہتا ہے۔ وہ ان بچوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ آپ غلط راستے پر گامزن ہو برباد ہو جاؤ گے۔ انیس ناگی اس سارے فلسفے کو اپنے کردار کی زبان سے یوں ادا کرواتا ہے کہ:

"ننھے منے، سفید اور میلے کپڑوں میں ملبوس بچے، ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے بچے، خاکی اور نیلی وردیاں پہنے ہوئے بچے پڑھنے جارہے ہیں میں انہیں سکول جانے سے نہیں روک سکتا، میں بہتے ہوئے وقت کو نہیں روک سکتا، میں ان بچوں کو کس طرح ان کے تاریک مستقبل سے مطلع کروں کہ وہ آبادی کے غیر معمولی پھیلاؤ کے مظہر ہیں۔ تمہارے ہاتھوں کے لیے کام نہیں ہے تمہارے شکموں کے لیے صرف قحط اور خیراتی گندم ہے جس کے کھانے سے توانائی کی بجائے بھوک کا احساس قوی ہوتا ہے جاؤ اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاؤ سکولوں کے مدرس سکولوں میں صرف تنخواہ لینے آتے ہیں، ان کے شکم اور ذہن دونوں خالی ہیں۔"(۳۹)

پروفیسر تعلیم سے اس قدر نالاں ہے کہ اب وہ ہر کسی کو اس تکلیف سے بچنے کی تلقین کرنا چاہتا ہے وہ اس قدر مایوس ہو چکا ہے کہ اب وہ ان بچوں کے پیدا ہونے کے امر کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور انہیں والدین کے ذہنی تلذذ کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور انہیں یہ کہنا چاہتا ہے کہ بچے اپنے والدین سے وجہ تولید پوچھیں۔ زمانے نے پروفیسر پر جو ستم کیے ہیں وہ اس قدر زیادہ ہیں کہ دنیا پروفیسر کے سامنے سوائے دھوکے کے اور کچھ نہیں۔ زندگی کا فلسفے پروفیسر نے جو بیان کیا ہے وہ اولاد کو پیدا کرنے کو بھی صرف والدین کے ذاتی تلذذ قرار دیتا ہے۔ انیس ناگی نے "دیوار کے پیچھے" ناول میں اس کردار کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

جاؤ، اپنے والدین سے اپنی وجہ تولید پوچھو کہ تم ذاتی تلذذ کا نتیجہ ہو یا تمہاری ضرورت کو محسوس کیا گیا تھا۔۔۔ بچو پیارے بچو! علم میں کوئی برکت نہیں ہے یہ نہ حقیقت کا روپ دکھاتا ہے اور نہ زندگی کرنے کا فن سکھاتا ہے انہیں بتانا کہ میں بھی کبھی۔۔۔۔۔ بڑھاپے کے وقت تمہارے وجود سے تمہارے والدین پریشان ہوں گے اور اپنے آپ کو نادم پائیں گے کہ انہوں نے چند ساعتوں کی مسرت کے لیے ایسے جسموں کو جنم دیا جو محض پریشانی کا موجب ہیں۔"(۴۰)

دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہمیں ہر مکتب ہائے فکر کے پاس ملتا ہے ہر کسی نے اس فلسفہ کو اپنی اپنی سوچ کے دائرہ میں رہ کر بیان کیا ہے۔ تمام مذاہب عالم بھی اس بات پر متفق ہیں کہ واقعی کسی بھی چیز کو ثبات نہیں ہے یہاں ہر نام پیدا کرنے کے لیے بہت سی اچھائیوں اور کامیابیوں کی ضرورت ہے مگر انیس ناگی کے ناول "دیوار کے پیچھے" میں اسی طرح کے فلسفے کا پرچار کیا گیا ہے اس میں مرکزی کردار ایک لاابالی سوچ کا

حامل شخص ہے جسے زندگی کے اتار چڑھاؤ سے فرق نہیں پڑتا کیوں کہ وہ ہار مان چکا ہے اس کے نظریات ملاحظہ ہوں:

> ''فرض محال مجھے ایک دم کہیں سے ایک ہزار روپیہ ماہوار ملنے شروع ہو جائیں تو میں پھر کیا کروں گا؟نہ ہونے نے میری سوچ کو الٹ دیا ہے؟ہاں سب کی سوچ الٹی ہوئی ہے اسی لیے تو ایک نئے معاشرے نے جنم لیا ہے۔۔۔شہر کا مئیر ایک اُمّی ہے اور سب اس کی حاکمیت میں ہیں، یہ اس شہر کے تعلیمی مدرسوں کی سزا ہے اور میری سزا اپنے آپ سے دور رہنا ہے۔اور میری سزا اپنے آپ سے دور رہنا ہے۔''(۴۱)

پروفیسر نے معاشرے کے اتار چڑھاؤ کو اچھی طرح بھانپ لیا ہے اب اگر کوئی اس کے سامنے ایک اچھا انسان ہو جو معاشرے کی فلاح و بہبود کا نام لیتا ہے تو وہ اسے اچھی طرح جانچ لیتا ہے۔پروفیسر ایک فلسفی کی طرح سوالات میں الجھتا چلا جاتا ہے اور اسے ہر سوال کا جواب بھی چاہیے جو س کے ذہن میں جنم لیتا ہے۔ پورے شہر کا حاکم ایک ان پڑھ شخص ہو سکتا ہے تو یہ اس کے نزدیک اس بے رحم، جھوٹے اور فریبی معاشرے کی سزا سمجھتا ہے۔پیدائش سے موت تک کا سفر یا تو انسان کو اس کے کردار کی وجہ سے ہمیشہ کی زندگی عطا کرتا ہے یا پھر وہی شخص اپنے اخلاق و کرادر کے وجہ سے ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتا ہے، پروفیسر کو اپنا جینا بے مقصد لگتا ہے اور وہ خود تضاد کے پیدا ہونے کی وجہ کو یوں بیان کرتا ہے:

> پیدائش فنا کے سفر کا آغاز ہے، ہر چیز اور فعل میں عمداً مقصدیت پیدا کی جاتی ہے کہ خلا انسان کو اس کی ہلاکت کی طرف راغب نہ کر دے، میں یہ سب کچھ جانتا ہوں اس لیے ابدیت کا خریدار نہیں ہوں۔اگر دنیا میں دکھ ہے تو پھر کیا؟خوشی ہے تو پھر کیا دونوں کو ثبات نہیں ہے۔۔۔عام مفروضہ ہے کہ اچھے کام کرنے والا ہمیشہ زندہ رہتا ہے اف ہیشگی کا بوجھ تمام انسانیت اور تمام نظاموں کی شکست ہے، یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں اچھے برے کاموں کے تفرقات سے آزاد ہوں، صرف جیتا ہوں اور بے مقصد جیتا ہوں۔''(۴۲)

انیس ناگی کی اس تخلیق میں اساتذہ کے ساتھ روا رکھے جانے والے عمومی رویہ جات پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔''دیوار کے پیچھے'' کی تحریر بتاتی ہے کہ تعلیم کے شعبہ میں موجود ایک اُستاد کا کیا مقام ہونا چاہیے۔ انیس ناگی نے اساتذہ کو جس مقام پر دکھایا ہے بلاشبہ یہ ہمارے معاشرے کا حصہ ہے۔اُستاد کے ساتھ روا رکھے

جانے والا سلوک قابلِ مذمت ہے اور دل چیر دینے والی داستان بھی، معاشرے کو پرکھنا اور پھر حقیقت میں ویسا بیان کرنا جیسا کہ محسوس کیا ہے یہ ہر ادیب کا کام نہیں لیکن انیس ناگی نے "دیوار کے پیچھے" لکھ کر خود کو ایسے ادیبوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جو حقیقت نگار ہیں۔ انیس ناگی نے پروفیسر کے ذریعے زندگی کو فلسفے کو بھی بیان کیا ہے جو کہ لائقِ تحسین ہے۔

iii۔ ماسٹر صاحب بطور فلسفی (جنم کنڈلی)

ہم زندگی میں زائچوں کے پابند ہیں اور روایات میں جکڑے ہوئے ہیں، ہماری سوچ کے گرد مختلف دائرے ہیں، جن سے سوچ کو باہر نکلنا ایسے ہی ہے جیسے انسان خود کو اپنی معاشرت سے نکال رہا ہو لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہم اپنے معاشرے سے نہیں نکلتے بلکہ کوئی بھی مثبت رویہ جو ہماری سوچ سے کسی دائرے کو توڑتا ہے وہ اصل میں ہماری معاشرت میں نکھار پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔

ہم زندگی کی ستم ظریفیوں میں اپنی مرضی سے پھنستے ہیں کیونکہ ہم اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی بجائے زندگی کے چال چلن کو ہی اپنا رہنما سمجھ لیتے ہیں اور یہی ہمارا سب سے بڑا عیب ہے۔ ہم بدل سکتے ہیں مگر بدلنا نہیں چاہتے۔ ہم مکافاتِ عمل پر یقین ہی نہیں رکھتے بلکہ اس کے دائرے میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ ہم مکافاتِ عمل کو معاشرت پر نہیں اپنی نسلوں پر Apply کرنا چاہتے ہیں، کیوں کہ ہمارے اعتقادات ہی اس دیو ملائی سوچ میں مرتکز ہیں کہ کہانی نہیں ختم ہوتی بلکہ نئے روپ کے ساتھ جنم لیتی رہتی ہے کردار مرتے رہتے ہیں اور نئے چہرے کے ساتھ دوبارہ سے کہانی کا حصہ بن جاتے ہیں۔

فہیم اعظمی کا جدید ہئیتی ناول جو کہ مکمل طور پر نہ سہی لیکن بہت زیادہ علامتوں کے سہارے پر ہے ہماری انہی معاشرتی سوچوں کی عکاسی کرتا ہے اس میں مصنف انتہائی چابکدستی سے اپنی نظریاتی حدود کو عوامی شعور کی حدوں تک وسیع کرتے ہوئے اپنے فلسفیانہ نظریات کا عکس عام قاری کے دماغی احاطے میں نقش کرتا چلا جاتا ہے۔ "جنم کنڈلی" کا مبہم مرکزی کردار بہت سے ادوار کے ساتھ منسلک ہے اور ہر دور کے مآخذات کو اپنی فلسفیانہ سوچ کے پیرہن میں زیبائش دے کر قارئین کے لیے پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کی کہانی میں وہ ہاتھوں کی لکیروں کے فلسفے کو یوں پیش کرتا ہے:

"یہ کس کی جنم کنڈلی ہے؟ اس میں نام تو ہے نہیں۔"

"یہ ایک آدمی کی جنم کنڈلی ہے۔ ہر آدمی کی جنم کنڈلی ہے۔

حادثات مختلف ہوتے ہیں مگر اثر ایک ہی ہوتا ہے۔۔۔۔

"یہ ہر جگہ کی بات ہے۔زمین کی بات ہے۔اسپیس کی بات ہے۔اس کی حدود کوئی نہیں۔"(۴۳)

"جنم کنڈلی" ناول کے مرکزی کردار میں شروع سے ہی الجھن موجود ہے۔اسے زندگی گزارتے انسان عجیب لگتے ہیں جو تضادات کو نظر انداز کر کے زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں اور یہ بات وہ اپنے لیے ممکن نہیں پاتا۔ناول کا مرکزی کردار ماسٹر سمجھتا ہے کہ علم کی روشنی میں بھی اندھیرا ہے اس کے نزدیک پاکیزگی اور تقدس کی لبادے میں چھپے ہوئے لوگ بھی داغ دار ہیں۔اب وہ خود سے ہی پوچھتا ہے کہ ایسے حالت میں انسان جائے تو جائے کہاں؟زندگی کے سفر میں وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اس کی الجھن بھی بڑھتی جاتی ہے۔دنیا کی حقیقت یہی ہے کہ ہر انسان کا کشکول خالی ہے اور وہ اسے بھرنے کے لیے دوسروں کے کشکول کا سہارا لیتا ہے اور یہ ایسی بھوک ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی انسان ختم ہوتے رہتے ہیں۔فہیم اعظمی کے ناول کے مرکزی کردار "ماسٹر" کو الفاظ مبہم معلوم ہوتے ہیں اور ہاتھ کی لکیریں بھی فریبی لگتی ہیں،وہ سمجھتا ہے کہ کہانی کبھی ختم نہیں ہوتی بلکہ اسے دہرایا جاتا ہے کبھی کسی روپ میں تو کبھی کسی روپ میں۔یہی زندگی انسان کو شروع سے لے کر آخر تک الجھائے رکھتی ہے اور یہی زندگی کا فلسفہ ہے:

"اس کے الفاظ مبہم ہیں۔سمجھ میں نہیں آتے۔"

"ہاتھ کی ریکھائیں بھی سمجھ میں آجاتی ہیں۔اس میں اپنی جنم کنڈلی تلاش کرو سب سمجھ میں آجائے گا۔"

۔۔۔۔اُفقی ہوتا ہے اور ورٹِکس نہیں بنتا۔صرف بُھومیکا بناتا ہے۔"

"ساری کہانی مُلغز ہے۔"

"یہ آدمی کی زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔"(۴۴)

وقت تیزی سے بڑھتا چلا جاتا ہے،اس کی رفتار کے ساتھ بھاگنا ممکن نہیں اور اس کو پکڑ کر روکنا بھی ناممکنات میں سے ہے۔ہم اکثر اس وقت اجنبیت کا شکار ہوتے ہیں جب ہم اپنے بچپن میں جاکر موجودہ دور کو جھانکتے ہیں جس میں کہ ہم موجود ہیں۔بیس،پچیس یا تیس سال پہلے کے دور میں بیٹھ کر موجودہ دور میں جھانکتے ہیں تو ہمیں زندگی بہت تبدیل دکھائی دیتی ہے۔کب ہم مٹی میں کھیلتے کھیلتے زندگی کی پختگی کو چھو لیتے ہیں کوئی پتہ نہیں چلتا۔

نیکر سے پینٹ اور پینٹ سے شلوار اور شلوار سے تہبند کی عمر میں داخل ہو جانا بھی معمولی لگتا ہے لیکن جب ہم اس سارے سفر کو بچپن میں بیٹھ کر جھانکتے ہیں تو عجیب معلوم ہوتا ہے اور ہم سوچوں کے کسی دور دراز تک پھیلے ہوئے صحراؤں میں جھانکتے ہیں جہاں ہم اپنے آپ کو تلاش کرنا تو دور کی بات محسوس بھی مشکل سے کر پاتے ہیں۔

فہیم اعظمی اپنے نظریات کو اس سفر کے منظر نامے کی مدد سے بیان کرتے ہیں۔ وہ زندگی کی تبدیلیوں کو اس مناسبت سے بیان کرتے ہیں کہ ان کی جامعیت واضح ہوتی ہے۔ ''جنم کنڈلی'' کے مصنف زندگی کی تبدیلیوں کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا عکس پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے جائزہ پر خوبصورت نظریات قائم کرتے ہوئے فلسفہ کی رو سے بھی تحریر میں یوں رنگ بھرتے ہیں:

> ''اُس نے تنہائی میں دیر سے آنے والی نیند سے کچھ کہا اور اس نے اس کے اعصاب پر سوار ہو کر اسے جھنجھوڑ دیا اور اس کو ٹینس کھیلنے والا جوتا پہنے ہوئے اپنے پیچھے آتے دیکھا اور پھر تیس سال کا ایک قدم ۔۔۔۔ سمیٹری کے پتھر اس کے سامنے سے گزرنے لگے اور وہ زمین کی طرح معلق رہا اور نیند نے اس کے اعصاب پر سے اتر کر اسے پھر جھنجھوڑا اور بستر پر ٹیک دیا اور اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں گھس گئی اور صبح کو رات کے مافوق الطبیعاتی یاد، اس کو مسکرانے کے لئے چھوڑ گئی اور چند لمحوں کے بعد وہ اپنی تنہائی میں غرق ہو گیا۔''(۴۵)

زندگی ایک نامکمل حقیقت ہے یہ ایک ایسا مقام ہے جو دیرپا نہیں، اصل میں زیست اپنی موت کے تعاقب میں سرگرداں ہے۔ جیون کی حقیقت کا اختتام موت پر ہے۔ کوئی بھی اور کچھ بھی یہاں مستقل نہیں۔ سب کچھ اپنے فنا کی جانب گامزن ہے۔ بچپن، لڑکپن، جوانی، ادھیڑ عمر، بڑھاپا اور موت زیادہ سے زیادہ اتنے ہی مراحل ہیں اور یہ بھی کہ ہر کسی کو سارے مراحل نصیب نہیں ہوتے۔ زندگی کہاں تمام ہو جائے گی کوئی نہیں جانتا مگر اس کے لوازمات اکٹھے کرتے کرتے لوگ وقت برباد کر دیتے ہیں۔

فہیم اعظمی نے زندگی کے اس سارے فلسفے کو انتہائی مدبرانہ انداز میں محسوس کیا اور پھر ''جنم کنڈلی '' کے ذریعے زندگی کی اس فلسفیانہ گھتی کو سلجھا کر پیش کر دیا۔ اس سارے سفر کی روداد کو'' جنم کنڈلی'' کے مرکزی کردار جو کہ کہیں پس منظر میں روپوش ہے مگر ہر دور کے فلسفے اور ہر دور کی منطقی انتہا کو بھرپور جانتا ہے کے ذریعہ خوب بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''چائے حاضر۔ ناشتہ غائب۔ ایڑی کی دھمک۔ ہتھیلی دکھاؤ۔ ہتھیار تو نہیں ہے۔ دس ہتھیلیاں۔ بیس ہتھیلیاں۔ سینکڑوں ہتھیلیاں۔ ہاتھ اٹھاؤ۔ ہاتھ نیچے کرو۔ پسینہ پوچھو۔ پتلون میں ہاتھ ڈال کر کھجاؤ۔ سامنے دیکھو۔ گڈ مارننگ سر۔ چار ڈانٹ بتاؤ۔ ایک ڈانٹ کھاؤ۔ ایک سو تیس۔۔۔۔۔ پورب دیکھو۔ اباؤٹ ٹرن۔ کافی بلیک۔ زہر وہائٹ۔ دوڑ کر آؤ۔ بھاگ جاؤ۔ نان سنس۔ شٹ آپ۔ گیٹ آؤٹ۔ کم ان۔ اندر کرو۔ باہر نکلو۔ بیلٹ ڈھیلی کرو۔ کھانا کھاؤ۔ وزن کرو۔ سیدھا کرو۔ تیار ہے۔ اگلی کشتی جیتے گا۔''(۴۶)

''جنم کنڈلی'' میں مرکزی کردار یعنی ماسٹر کی خود کلامی کے ذریعے زندگی کے فلسفے کو پیش کیا گیا ہے وہ اپنے وجود کے معنی تلاش کرتا ہے اور بے معنویت کی زندگی نہیں گزارنا چاہتا لیکن کوئی سہارا نہیں ملتا جو اسے ساحل تک پہنچا دے۔ وہ زندگی میں انسان کے ساتھ واسطہ پڑنے والے مختلف امور اور چیزوں کے ساتھ خود کلامی کے ذریعے بات کرتے ہوئے زندگی کی معنویت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی کی معنویت کو سمجھنا انسان کے لیے بہت ضروری ہے اور ناول کا مرکزی کردار بھی اسی کے گرد گھومتے ہوئے زندگی کے فلسفے کو سمجھنے کے تگ و دو میں مصروف عمل دکھائی دیتا ہے۔

''دنبہ ہے۔ پالتو ہے۔ گھاس نہیں کھاتا۔ باتھ روم لے جاؤ۔ نیکر پہنو۔ ریکٹ دکھاؤ۔ ہاکی کہاں ہے۔ ایک گول۔ دو گول۔ بیس بال۔ رن آؤٹ۔ سو جاؤ۔ الارم لگاؤ۔ بلیچ کرو۔ سینہ تانو۔۔۔۔۔ بارش نہیں ہوئی۔ ایک پیالہ پتّہ۔ برف گری ہے۔ پلیٹ ہٹاؤ۔ پانی لاؤ۔ سرف چھپکلی چلاؤ گے۔ نہیں پچاسواں نہیں۔ وہ وشوامتر کا حصہ ہے۔ اچھا پھر آج جانے دو۔ یہ پھولوں کا ہار پہن لو اور پان کھا لو۔ میرا سگریٹ کا پیکٹ کہاں ہے؟ اچھا گڈ نائٹ۔''(۴۷)

فہیم اعظمی کے ناول ''جنم کنڈلی'' کو کوئی ان دیکھی کش مکش درپیش ہے۔ شاید اس کہانی کو جان بوجھ کر الجھایا گیا ہے یا پھر خود بخود ادوار و شخصیات میں الجھتی چلی گئی ہے۔ اس کہانی کے ادوار میں ربط ہے اور نہ ہی ابواب میں۔ کسی ایک ہی باب میں مختلف ادوار کو زیر بحث لایا جانا ___ جب کہ ان کی ترتیب ملحوظ نہ ہو ___ ایک خامی گردانی جاتی ہے لیکن فہیم اعظمی کے ناول ''جنم کنڈلی'' میں اسی خامی کو خوبی بنا کر استعمال کیا گیا ہے۔

جنم کنڈلی کی کہانی کے ادوار پر بحث کو طویل اور دلچسپ بنایا جا سکتا ہے مگر یہ بات سچ ہے کہ اس ناول کے کسی بھی باب سے شروع کر کے کسی بھی باب کو آخری سمجھ لیا جائے کیوں کہ اس میں بے ترتیبی ہے۔

فہیم اعظمی ایک منجھے ہوئے ادیب ہیں۔انھیں فلسفہ اور تاریخ کے علوم سے گہری دلچسپی ہے اور یہ امر ان کی تحریر کا مرکزی خیال بھی ہے کیوں کہ وہ تاریخ کے مختلف ادوار کی مختلف شخصیات کو موضوع بحث بنانے کی بجائے گفتگو میں شامل کر لیتے ہیں جہاں پر یہ کردار اپنے دور کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ایک کردار کی حیثیت سے باتیں کرتے اور چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔اس ناول میں انھوں نے ماسٹر صاحب کے ذریعے فلسفے کو انتہائی عامیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

iv۔ پروفیسر سہارن رائے بطور فلسفی (آدھے ادھورے خواب)

فلسفہ علم کا اہم جزو ہے۔انسانی زندگی کے آغاز و ارتقا اور موجودہ ترقی یافتہ تمدنی زندگی تک رسائی کے بعد آگے بڑھتے ہوئے مزید کامیابیوں کے زینے طے کرنے کے لئے حاصل کئے گئے یا استعمال کیے گئے علم کے پسِ منظر میں تحقیق اور فلسفہ ہی تو کار فرما ہے۔انسان فلسفہ کے مختلف زینوں پر قدم جماتے ہوئے ادراک کی منزل تک جا پہنچتا ہے۔مادیت سے قطع نظر اگر ہم عرفان ہستی کے مباحث میں جائیں تو بھی ہمیں فلسفہ کی ضرورت پڑتی ہے اور پھر فلسفیانہ گتھیاں سلجھاتے ہوئے ہم موجودات کی حقیقت اور ضرورت کو پا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ دراصل عرفان ہستی ہی عرفان الٰہی کا اول زینہ ہے مگر یہاں عرق ریزی سے انتہائی مدبرانہ سوچ درکار ہوتی ہے ورنہ ایک نکتہ کی غلطی کی بنا پر بھی بھٹکا ہوا انسان جہالت کے راستوں پر گامزن ہو سکتا ہے۔ ہم اس امر کو واضح کر سکتے ہیں کہ دنیا کے مختلف مذاہب کے ہاں خدائی اور کبریائی کے مختلف نظریات پائے جاتے ہیں اسی منظر نامہ کو معروف شاعر اکبر الہ آبادی یوں بیان کرتے ہیں:

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں
معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے
شہرِ تن میں جب کہ خود اپنا پتہ ملتا نہیں (۴۸)

دراصل فلسفہ عرفانِ حقیقت کا راستہ ہے اور انسان کے افکار و نظریات کو تقویت دینے کا زینہ بھی۔ انسان زندگی میں مختلف آراء رکھتا ہے، بہت سے انسانوں کی کسی ایک ہی چیز کے بارے میں مختلف آراء ہو سکتی

ہیں دراصل ہر رائے کا باقاعدہ ایک فلسفہ ہے اور ہر فلسفہ دوسرے سے مختلف۔ یہاں پر ایک مثال پیش کی جا سکتی ہے کہ ایک مصنف اپنی ڈائری تحریر کرتے ہوئے افسردگی میں مبتلا ہو گیا اور اس نے اپنی ڈائری کے اس صفحہ کو یوں تحریر کیا کہ آج میں بہت افسردہ ہوں جس کی وجہ گذشتہ برس ہے۔ یہ میرے لیے بدترین سال تھا جس میں میری نوکری کی مدت ختم ہوئی اور مجھے ساٹھ سال کی عمر کا کہہ کر گھر میں بیٹھا دیا گیا کہ میرے والد صاحب پچاسی سال کی عمر میں انتقال کر گئے میرے بیٹے کا میڈیکل میں داخل ہوتے ہوتے اس ایکسیڈنٹ کی وجہ سے رہ گیا جس میں بیٹا تو معمولی زخمی ہوا تھا مگر گاڑی کا اچھا خاصا نقصان ہو گیا تھا۔ میرا وہ سال بہت افسوسناک تھا۔ دوسری طرف اس کی بیوی ڈائری لکھتے ہوئے بہت خوشی کا اظہار کر رہی تھی کہ میرے شوہر کی ریٹائرمنٹ یکسوئی عطا کرے گی اور اس طرح وہ بہتر تحریر کر سکیں گے۔ دوسرا یہ کہ کام کے بوجھ کی وجہ سے ان کا دھیان بٹتا تو ان کا بلڈ پریشر بھی تیز ہو جاتا تھا اور خدا کا یہ بھی احسان گزشتہ برس ہی ہوا کہ جب سسر والد اس دنیا سے اپنی پچاسی سالہ زندگی گزارنے کے بعد کسی پر بوجھ بنے بغیر خالق کے پاس جا پہنچے۔ خدانخواستہ ان کو کوئی عارضہ لاحق ہوتا تو کیا بنتا اور سب سے بڑی خوشی تو مجھے اس بات کی ہے کہ اللہ نے ایک جان لیوا حادثے میں میرے بیٹے کو نئی زندگی بخشی اس بات پر تو جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ اس مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ہی جیسے عوامل کے پیچھے دونوں کے نظریات میں بالکل تضاد ہے اور دونوں ہی اپنی اپنی فلاسفی کی وجہ سے بالکل درست بھی ہیں۔ ہمارے یہاں پر فلسفہ کو تعلیم کے ساتھ بھی جوڑا جاتا ہے اور یہ گمان کیا جاتا ہے کہ جو شخص جتنا زیادہ تعلیم یافتہ ہو گا اتنا ہی زیادہ زیرک ہو گا اور مختلف چیزوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کا حق بھی رکھتا ہو گا لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ ہر انسان اچھی رائے قائم نہیں کر سکتا، پڑھا لکھا ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی چکی میں پسے ہوئے شخص کے نظریات میں زیادہ ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ معروف اردو شاعر ''آشو مشرا'' زیادہ پڑھنے کے سبب زیادہ فلسفی ہونے کا نظریہ یوں پیش کرتے ہیں:

میرے سخن میں تبھی فلسفہ زیادہ ہے

کہ میں نے لکھا بہت کم، پڑھا زیادہ ہے (۴۹)

در حقیقت اگر دیکھا جائے تو فلسفہ تعلیم پر کم اور مشاہدہ پر زیادہ تکیہ کرتا ہے مشاہدہ کسی بھی چیز کے بارے میں بصیرت عطا کرتا ہے پھر وہ معاشرے کا کوئی نظام ہو یا تعلیم کا نظام، نظام حکومت ہو عائلی زندگی کا نظام، مشاہدہ میں عادلانہ منطق کی راہیں ہموار کر کے لیتا ہے۔

قلم کی نوک کے نیچے پننپے والی فلاسفی بہر حال سب سے زیادہ موزوں متصور ہو گی کیونکہ ان کا وجود دیرپا ہے یا پھر اگر بڑے نظریات ہوں تو لازوال حیثیت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ ہماری اس تحریر میں موضوع بحث اردو ناول نگار شاہد صدیقی کا وہ نظریہ ہے جو انھوں نے اپنے ناول ''آدھے ادھورے خواب'' کے کردار پر پروفیسر سہارن رائے کی زبانی اپنے قارئین کی نذر کی۔

پروفیسر سہارن رائے سادہ مزاج فلسفی ہیں۔ مختلف معاملات میں اس خوبصورتی سے اپنے نظریات کا پرچار کر جاتے ہیں کہ ان کی سادگی اور سادہ بیانی کی بنا پر شائبہ تک نہیں ٹھہرتا کہ یہ بات کس گہرائی تک اثر رکھتی ہے ہاں مگر ان کے سامع کی سوچ پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک اس بات سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ درس وتدریس پروفیسر کا اوڑھنا بچھونا ہے یہ صرف ان کا پیشہ ہی نہیں بلکہ اس کے تحت وہ زندگی گزارنے کے لیے راہیں بھی ہموار کرتے ہیں۔ پروفیسر سہارن رائے شعبہ تدریس کے تجربات کا فلسفہ آپ بیتی کی شکل میں یوں بیان کرتے ہیں:

> '' ٹیچنگ میرا محبوب پروفیشن ہے۔ میں اسے ایک تخلیقی کام سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے طلباء بہترین منصف ہوتے ہیں۔ وہ جلد ہی اُستاد کا جائزہ لے کر ایک نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ ایک اُستاد کی شہرت کلاس روم سے جنم لیتی ہے اور دنوں میں یہ شہرت دوسرے طالب علموں سے ہوتی ہوئی کالج کے برآمدوں، ہاسٹلوں اور کیفے ٹیریا میں پھیل جاتی ہے۔''(۵۰)

زندگی میں ہماری بصارت بہت سی چیزوں کو پرکھتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جس نقطہ نظر سے ہم دوسروں کی تخلیقات پر تنقید کے نشتر برسا سکتے ہیں وہ نقطہ نظر ہم اپنے لئے قائم کر لیں یہ بہت مشکل کام ہے۔ ہمیں زندگی میں اپنے ہاتھوں سے بنائی گئی چیزیں ہمیشہ پسند آتی ہیں یا یوں کہہ لیں کہ ہم اپنی تخلیقات کو ہمیشہ ہی قابل داد تصور کرتے ہیں۔

شاہد صدیقی کی ذہنی حساسیت کا اندازہ اس امر سے لگانا مشکل نہ ہو گا کہ انھوں نے اس فلسفے کو بھی اپنی تحریر کا حصہ بنایا۔ انھوں نے اس نظریے کو عمومی ذہنوں تک رسائی دینے یا عمومی ذہنوں کو اس فلسفہ کی

حدود میں داخل کرنے کے لئے پروفیسر سہارن رائے جیسے کردار کو تخلیق کیا۔ ناول ''آدھے ادھورے خواب'' کے کردار پروفیسر سہارن رائے اس فلسفہ کو بیان کرنے کے لیے الفاظ سے زیادہ عمل پر تکیہ کرتے ہیں اور اس بات کا اظہار کلاس کے پہلے ہی دن اپنی تعریفی گفتگو میں کر دیتے ہیں ان کی ابتدائی گفتگو جو وہ اپنی جماعت کے ساتھ کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

''کچھ ہی دیر میں ہماری ہی عمر کا ایک نوجوان کلاس میں داخل ہوا۔ ابتدائی تعارفی جملوں کے بعد اس نے کلاس سے کہا۔ مجھے یہاں بہت سے آرٹسٹ بیٹھے نظر آرہے ہیں۔۔۔ پھول کی صرف تین پتیاں تھیں۔

یہ سر رائے سے میرا پہلا تعارف تھا

بورڈ پر پھول بنا کر وہ ہماری طرف پلٹے اور شرارت سے کہنے لگے۔

''یہ بہت خاص پھول ہے پتہ ہے کیوں؟''(۵۱)

پروفیسر سہارن رائے کو دماغوں کو کھولنے اور ان سے کام لینے کا ہنر آتا ہے۔ انھوں نے بورڈ پر پھول بنانے کے بعد اپنے طلبہ کے دماغ کھولنے کے لیے آسان سا سوال کیا اور سبھی نے باری باری اس پر اپنے جوابات دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ پروفیسر نے سب کی رائے کا احترام کیا اور ان کو ان کے ناموں سے پکار کر سب کے جواب کو غور سے سنا، کلاس میں سے جواب دینے کے لیے طلبہ نے ہاتھ کھڑے کیے اور باری باری جواب دینے لگے:

''کلاس کی پڑھاکو لڑکی سعدیہ نے ہاتھ کھڑا کیا اور کہنے لگی ''سر کیوں کہ اس کی تین پتیاں ہیں۔''

''ویری گڈ سعدیہ۔'' سر رائے نے اس کے نیم ٹیگ کو دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔۔۔

لفظ ''میرا'' پر پروفیسر رائے نے ضرورت سے زیادہ زور دیا تھا پھر انھوں نے ہماری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ہر چیز جس میں اپنی ذات کا رنگ اور پرتو ہو خاص چیز بن جاتی ہے۔ تو آج ہم سب اپنا اپنا پھول تخلیق کر رہے ہیں۔''(۵۲)

ہر وصال کو جدائی ایک اٹل حقیقت ہے۔ بسا اوقات ہم زندگی کے کسی موڑ پر کسی انسان کو بے انتہا دل و دماغ تک رسائی دے بیٹھتے ہیں کہ پھر بچھڑنے کا ایک موہوم سا خیال بھی جان لیوا ہو سکتا ہے۔ ہاں مگر

جانے والے کہاں رکتے ہیں۔ یہ تو امر لازم ہے کہ جو ملتے ہیں وہ بچھڑتے ہیں، جو ٹھہرتے ہیں وہ جاتے ہیں، جو رکتے ہیں وہ چلتے ہیں، جو قیام کرتے ہیں ان کا کوچ بھی ضرور ہوتا ہے۔

شاہد صدیقی اس فلسفے کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اور ممکنہ حد تک اس سچائی کو اپنے قارئین کے دماغوں پر نقش کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اپنے ناول ''آدھے ادھورے خواب'' کی کہانی میں جب وہ پروفیسر سہارن رائے کو ان کی کلاس سے جدا کرتے ہیں تو جدائی کا انتہائی خوبصورت خاکہ تحریر کرتے ہیں، اساتذہ کی ان کے طلبہ سے جدائی کو ایک ایسے انداز میں بیان کیا ہے جو کہ اپنی یادوں کو طلبہ کے ذہنوں میں ہمیشہ کے لیے نقش کر جاتے ہیں، البتہ قابل ذکر بات ان کی جدائی جدائی نہیں بلکہ وہ فلسفہ ہے جو ایک ہی فکر میں پروفیسر سہارن رائے بیان کر دیتے ہیں کہ ''ہم سب کو ایک روز جانا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا فلسفہ جو کہ ہر انسان پر پورا اترتا ہے، کیوں کہ جو انسان دنیا میں آتا ہے وہ ایک نہ ایک دن دنیا سے چلا جاتا ہے۔ پروفیسر سہارن رائے جب کالج سے جاتے ہیں تو اس وقت تمام طلبہ انہیں الوداع کہنے جاتے ہیں، ناول ''آدھے ادھورے خواب'' میں تحریر یہ منظر ملاحظہ ہو:

> ''ہم سب دوست انہیں الوداع کہنے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ہم سب ہنس بول رہے تھے۔ لیکن ہم میں سے ہر ایک اپنے اندر کا حال ایک دوسرے سے چھپا رہا تھا۔ مگر کب تک۔ آخر ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ تسنیم بولتے بولتے رو پڑی۔ ''سر ہم آپ کو بہت مس کریں گے۔'' وہ اب ہچکیوں سے رو رہی تھی۔
>
> پروفیسر رائے نے تسنیم کے شکستہ چہرے کو دیکھا اور صرف اتنا کہا ''ہم سب کو ایک روز جانا ہوتا ہے۔''
>
> گاڑی کی وسل کی آواز سنائی دی۔ ہم سب پروفیسر رائے کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھا رہے تھے۔''(۵۳)

پروفیسر سہارن رائے کا یہ جدائی کا فلسفہ دراصل اس قدر جامع ہے کہ اس کی گہرائی میں جانے سے ہم مختلف جہات تک عقلی رسائی حاصل کر لیتے ہیں، ''ہم سب کو ایک دن جانا ہوتا ہے'' ایسا خوبصورت اور جامع نظریہ ہے کہ اس میں دنیا جہان کی سچائی سمٹ آئی ہے کیونکہ اسی ایک مختصر سے فقرے کو اگر زندگی کی ناپختگی پر لیا جائے تو بھی یہی حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ہر کوئی جانے کے لیے آیا ہے۔

پروفیسر سہارن رائے کی شخصیت انتہا درجہ کی حساس ہے اور اس حساسیت کے پس منظر میں شاہد صدیقی کا قلم اور فکری بلندی ہے، جو ان کے کردار کو اس قدر زیرک بنا کر پیش کرتی ہے۔"آدھے ادھورے خواب" کا مطالعہ کرتے جائیں تو آپ پر زندگی کے کتنے ہی در ایک ایک کر کے وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم پڑتا ہے کہ پروفیسر سہارن رائے کی نظر ہمارے یہاں کے حقیقی اساتذہ اور جز وقتی اساتذہ کے انداز تدریس (teaching method) پر بھی بہت گہری ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک اُستاد کی شخصیت میں کیا خوبیاں درکار ہوتی ہیں اور اس کے انداز تدریس میں کون کون سے محاسن انتہائی ضروری ہیں۔

شاہد صدیقی اپنے تخلیق کردہ کردار پروفیسر سہارن رائے کی زبان سے تمام مشاہدات کسی فلسفی کی طرح اگلواتے ہیں اور عمومی قارئین کی ذہنی سطح کو مد نظر رکھتے ہوئے ثقیل زبان سے گریز کرتے ہیں۔"آدھے ادھورے خواب" میں پروفیسر سہارن رائے ایک اُستاد کے محاسن کی بحث یوں چھیڑتے ہیں:

> "سوال یہ ہے کہ ایک اچھے اُستاد کی تعریف کیا ہے؟" وہ بولے!"ہم میں سے ہر ایک دو منٹ سوچے اور پھر اپنا جواب نوٹ بک پر لکھ لے۔"
>
> "سر۔ سر۔"فوزیہ نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ طالب علموں کے دماغ بند تجوریوں کی طرح ان کھلے رہ جاتے ہیں۔ علم کے کیسے کیسے ہیرے موتی بغیر استعمال کے زنگ آلودہ ہو جاتے ہیں؟ ہر طرح کے جوابات آ رہے تھے۔"علم، مہارت، ٹیکنیک، کمیونیکیشن، سائیکالوجی، کمٹمنٹ، شخصیت وغیرہ وغیرہ۔"(۵۴)

ایک فلسفی کا کام اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرنے کے لئے مثالیں پیش کرنا بھی ہوتا ہے پھر خواہ کوئی عمومی فلسفہ ہو یا پھر کچھ انتہائی عالمگیر سطح کی بات، عمل تعلیم یقیناً عالمگیر حیثیت کا حامل ہے اور اس میں مختلف آراء کی روشنی میں طریقہ تدریس، معلّم، متعلم، تعلم، تدریس، معاشرہ، نصاب اور موثر طریقہ ہائے تدریس پر مباحث عمل میں آتے ہیں۔ شاہد صدیقی کے مطابق علم ایک عطا جبکہ تدریس (Teaching) ایک فن ہے اور ہر صاحب علم تدریس کے ہنر سے واقف ہو یہ ممکن ہی نہیں۔ وہ اپنے اس نظریہ کی تائید پروفیسر سہارن رائے کی زبان سے اس وقت کرواتے ہیں جب وہ کلاس میں موجود طلبہ کے درمیان ایک اچھے اُستاد کے اوصاف کی بحث چھیڑ چکے ہوتے ہیں۔

پروفیسر سہارن رائے مختلف طلباء کی آراء حاصل کرنے کے بعد اپنے فلسفیانہ موقف کو خوبصورت مثالوں سے واضح کرتے ہیں وہ حقیقتاً بتانا چاہتے ہیں کہ ایک اُستاد کو کس طرح کا ہونا چاہیے پروفیسر سہارن رائے کے فلسفیانہ نظریات کے لیے ناول ''آدھے ادھورے خواب'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> '' آپ میں سے کس کس نے بیکنگ (Baking) کی ہے؟ بہت سی لڑکیوں نے ہاتھ کھڑا کیا۔ ''اور آپ میں سے کس کس نے کیک بنایا ہے؟'بہت سے ہاتھ ہوا میں بلند ہوئے۔
>
> یہ پروفیسر رائے کی کلاس کا رنگ تھا کہ ہر طالب علم گفتگو کا حصہ تھا۔وہ مکالمے میں برابر کا شریک تھا۔
>
> ''اُستاد بھی کیک کی طرح ہوتا ہے۔'' پروفیسر رائے نے ڈرامائی لہجے میں اعلان کیا۔''(۵۵)

پروفیسر سہارن رائے، تمام جماعت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے ہنر کو بخوبی جانتے ہیں۔ غور سے اگر معاشرتی تناظر کو دیکھا جائے تو ہمیں معاشرے میں ایسے بہت سے اساتذہ ملتے ہیں جو تحقیق تو بہت کرتے ہیں لیکن وہ کلاس میں اپنے نالج کو ڈیلیور نہیں کر پاتے۔پروفیسر سہارن رائے نے اُستاد کو کیک سے تشبیہ دے کر سب کو حیران کر دیا اور اس پر تمام کلاس سوچنے لگ جاتی ہے اور پھر کلاس میں سوال کرنے پر سنجیدگی سے کیک اور اُستاد کے درمیان مماثلت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> ''سر! اُستاد اور کیک میں آخر کیا مماثلت ہے؟'' سب کی آنکھوں میں یہی سوال تھا۔لیکن سر رائے کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔
>
> ''کچھ اُستاد ایک تہہ والے کیک کی طرح ہوتے ہیں اور یہ تہہ سبجیکٹ نالج (Subject Knowledge) کی ہوتی ہے۔''۔۔۔۔
>
> آنکھیں بند کیں تو میرے دماغ کی سکرین پر ایک اُستاد کا چہرہ گھوم گیا جو بقول اس کے ریسرچ میں بہت اچھی تھی۔لیکن اس کی کلاس میں ہمارے پلے کچھ نہیں پڑتا تھا۔''(۵۶)

پروفیسر سہارن رائے تمام طلبہ کو اپنی طرف متوجہ پا کر ان کے ذہنوں پر ایک اور دستک دیتا ہے جس سے تمام طلبہ اپنے ماضی میں کھو جاتے ہیں اور اپنے اساتذہ کے بارے میں پروفیسر سہارن رائے کے فلسفے کے

مطابق سوچتے ہیں۔ یہی ایک کامیاب اور مکمل اُستاد کا فن ہوتا ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے اپنے طلبہ کی ذہن سازی کرتا ہے:

"خواتین و حضرات۔" پروفیسر رائے کی آواز گونجی۔ "ہم ایک اچھے اُستاد کی تلاش میں ہیں۔ علم کے علاوہ ایک اچھا اُستاد بننے کے لیے کیا چاہیے؟"
" سر پڑھانے کا طریقہ۔" بہت سی آوازیں آئیں۔
" بالکل درست۔" سر رائے بولے۔
پھر وہ میز پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے۔ "کچھ اُستاد ۔۔۔۔ بھی آگاہ ہوتے ہیں۔"
"تو کیا ایک اچھے اُستاد کی تکمیل ہوگئی؟" "نہیں۔ ہر گز نہیں۔" سر رائے نے خود ہی سوال پوچھا اور اس کا جواب دے دیا۔"(۵۷)

فلسفہ کا کمال یہ ہے کہ بڑی بڑی گتھیوں کو سلجھا دیتا ہے۔ معاشرے کے بگاڑ اور اونچ نیچ جیسے معاملات میں ہر شخص اپنی سی رائے قائم کرتا ہے۔ معاشرے میں ہر انداز سے سوچنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں اور مختلف مکتب ہائے فکر کے لوگ اپنے اپنے انداز سے تشریح کرتے ہیں۔ ہر شخص کی سوچ کا اپنا ایک معیار ہے اور ہر معیار کے بے شمار زاویے۔ اس لئے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کسی بھی معاملہ کو پرکھنے کے لیے کسی ایک ہی سوچ پر تکیہ کرنا جہالت ہے یا پھر ایک ہی جیسی سوچ کو لگاتار لے کے چلتے رہنا دراصل علمیت نہیں بلکہ تقلید ہے۔

شاہد صدیقی بخوبی جانتے ہیں کہ معاشرہ میں بگاڑ کی بڑی وجوہ کیا ہیں؟ وہ دراصل یہ سچائی سمجھ چکے ہیں کہ مادیت ہی بگاڑ کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب ہے۔ ہوس اور لالچ انسان کو اندھا کر دیتا ہے اور اسی اندھے پن کی دوسری بڑی وجہ انسان کی اولاد ہے کیونکہ دولت کی ہوس کا اصل مقصد اگلی نسل کے لئے سکون و آرام کے راستے استوار کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس امر کی وضاحت فرمائی ہے کہ:

''انما اموالکم و اولادکم فتنہ''

ترجمہ: بے شک تمہارا مال اور اولاد تمہارے لیے فتنہ ہے"(۵۸)

شاہد صدیقی اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید فرقان حمید میں بیان کیا گیا یہی فلسفیانہ نظریہ اپنے ناول " آدھے ادھورے خواب" کے کردار پروفیسر سہارن رائے کے ذریعے زیر بحث لاتے ہیں اور واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ معاشی عدم مساوات ہی معاشرتی بگاڑ کا سبب ہے۔ پروفیسر سہارن رائے اپنا نظریہ پیش

کرنے سے پہلے مختلف فلسفیوں کی آراء کو اپنی گفتگو کا حصہ بناتے ہیں اور پھر جب مناسب سمجھتے ہیں تو اپنی رائے کچھ یوں قائم کر دیتے ہیں:

> ” پروفیسر رائے نے اٹلی کے دانش ور گرامچی (Gramsci) سے گفتگو کا آغاز کیا۔ پھر گفتگو میں فوکو (Foucault) کا علم اور طاقت کا نظریہ بحث آیا۔ اسی لیکچر میں میں نے پہلی بار فرانسیسی سوشیالو جسٹ Bourdieu کے Symbolic Violence کے بارے میں سنا۔۔۔ تعلیم کے غیر رسمی ذرائع دریافت کرنا، ان کا احیاء کرنے اور ان کو تخلیق کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکچر شروع ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا لیکن یہ وقت اتنی تیزی سے بیت گیا کہ ہمیں احساس ہی نہیں ہوا کہ پروفیسر رائے اپنا لیکچر ختم کر چکے ہیں۔“[۵۹]

ہمارے آس پاس مادیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لاکھوں لوگ دوسروں کے راستوں میں صرف اس لئے رکاوٹ بنتے ہیں کہ کوئی دوسرا ان کے برابر نہ آن کھڑا ہو۔ ہمیں ہر طرف دیکھنے کے باوجود دوسروں کو برابری پر لا کھڑا کرنے کی کوشش کرنے والے لوگ ہمارے معاشرے میں بہت قلیل ہیں۔

” آدھے ادھورے خواب“ میں موجود پروفیسر سہارن رائے اس نظریے کی وضاحت انتہائی فلسفیانہ مباحث سے پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مختلف زاویوں سے اپنی بات کی وضاحت کو بھرپور انداز میں بیان کرنے کی کوشش میں سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ معاشرے کا طاقتور طبقہ کبھی بھی نہیں چاہے گا کہ کمزور لوگ بھی ان کی برابری کریں، یہی طاقت ور طبقہ اصل میں معاشرے کی سب سے بڑی بگاڑ ہے جو کمزور لوگوں سے جینے کے حق کو بھی چھیننا چاہتا ہے اور ان کو اپنا غلام بنا کر رکھنا اس کے اوّلین مقصد میں سے ہے۔ وہ اپنے گھر ملاقات کے لیے آئے ہوئے طالب علموں کے ساتھ اس نظریہ پر یوں بحث و تکرار کرتے ہیں:

> ”معاشرے کے طاقتور طبقے نہیں چاہتے کہ معاشی اور سماجی ناہمواریاں کم ہوں۔ ایسا ہونے سے ان کی اپنی پاور بیس خطرے میں پڑ جاتی ہے۔“ میں نے بات جاری رکھی۔

”تعلیمی ادارے معاشی اداروں اور سماجی فرق کو کم کرنے کی بجائے اور بڑھا رہے ہیں
آج سے تیس سال پہلے غریبوں کے بچے بھی اعلیٰ عہدوں پر پہنچ جاتے تھے لیکن
آنے والے دنوں میں شاید ایسا ممکن نہ ہو۔“(۶۰)

طاقت اور کمزوری کا قانون وقت کی ابتدا ہی سے کار فرما ہے۔ ہر دو طرف ایک خاص قسم کی زور آزمائی ہے۔ طاقتور ہمیشہ چاہیں گے کہ کمزور کو زیر کر کے محکومی کی حالت میں رکھیں اور کمزور طبقہ ہمیشہ مزاحمت پر عمل پیرا رہتا ہے اور کچھ کچھ حالات میں اپنی ہار تسلیم کرتے ہوئے سرنگوں بھی ہو جاتا ہے۔

قوت بدستور عروج پکڑے رکھتی ہے اس بارے میں شاہد صدیقی کا مشاہدہ بہت فلسفیانہ ہے۔ اپنے ناول ”آدھے ادھورے خواب“ کے کردار پروفیسر سہارن کی زبان سے وہ اس پر انتثال کے ساتھ مکالمہ نقل کرتے ہیں جس میں فلسفیانہ بنیادوں کو روزمرہ گفتگو کی طرح موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ پروفیسر سہارن زور آوروں اور کمزوروں کی تقسیم پر بحث چھیڑتے ہوئے مزاحمت کی اہمیت تک پہنچتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ اپنا فلسفہ انتثال کی سوچ میں اتارتے چلے جاتے ہیں۔

پروفیسر سہارن رائے کے مطابق کسی بھی منفی قوت کے سامنے ڈٹ کر مقابلہ کرنے والی مزاحمت دراصل گھپ اندھیرے میں روشنی کی طرح ہے۔ شاہد صدیقی قوت و مزاحمت کے فلسفہ کو پروفیسر سہارن کی زبانی یوں قلم بند کرتے ہیں:

”سوشل کلاس، نسل اور جنس کی بنیاد پر معاشرے کو تقسیم کر دیا گیا ہے لیکن اس
سے بھی بڑی تقسیم زور آوروں اور کمزوروں کی ہے۔“
”سر اس کا حل کیا ہے؟ مجھے لگتا ہے کہ استحصال کا یہ نظام کبھی ختم نہیں ہو گا۔ جو سر
پھرے اس نظام سے ٹکرا رہے ہیں۔۔۔۔ گھٹن آلود ماحول میں تازہ ہوا کا جھونکا۔
روشنی اور تازہ ہوا کے یہ استعارے ہی نہ رہے تو زندگی بے رنگ ہو جائے گی۔“ وہ
غور سے میری باتیں سن رہی تھی۔ اسی دوران اس کے موبائل کی گھنٹی بجی لیکن اس
نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔“(۶۱)

شاہد صدیقی کے ناول ”آدھے ادھورے خواب“ کے مرکزی کردار پروفیسر سہارن رائے لگاتار کسی عظیم دانشور کی طرح ہر بیٹھک میں اپنے نظریات کی کڑیاں پروتے ہوئے کسی ان دیکھی زنجیر کی تکمیل میں

مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی سوچ کے مختلف زاویے انتہائی حد تک عمومی نظریات کے قریب تر دکھائی دیتے ہیں اس کے باوجود یہ امر قابل توجہ ہے کہ ان کی گفتگو، فلسفے اور سوچ میں نیاپن موجود ہے۔

ہم اکثر کسی سفر کے دوران بھی اپنے آس پاس موجود دیگر لوگوں سے جن کی منزل ہمارے ساتھ یکساں ہو، ہم آہنگی بڑھالیتے ہیں اور بالیقین یہ اس وجہ سے وقوع پذیر ہوتا ہے کہ ہم میں قدر مشترک فقط ایک جگہ پر پہنچنا ہی ہے لیکن دوران گفتگو بہت سی دیگر باتوں میں بھی ہم آہنگی کا ادراک ہو سکتا ہے، جیسے کہ ہمیں بھی سیاست میں دلچسپی ہو اور انھیں بھی یا پھر طرفین ہی پیشہ کے لحاظ سے یا تعلیمی ڈگری کے لحاظ سے ایک جیسے ہوں اور یہ اشتراک ہمیں لگاتار ایک دوسرے سے مانوس اور قریب تر کرتا چلا جاتا ہے۔

پروفیسر سہارن رائے اس عمومی فلسفے کی خصوصیت بیان کرنے کے ساتھ اس کی عالم گیریت کا راستہ ہموار کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ زندگی میں جب ہماری منازل ایک ہوتی ہیں تب ہمارے درمیان اپنائیت پیدا ہونا فطری عمل ہے۔ شاہد صدیقی اپنے ناول ''آدھے ادھورے خواب'' میں پروفیسر سہارن رائے کی زبان سے یوں بیان کرتے ہیں:

> ''یہ رشتے بھی کیسے رشتے ہیں۔ جہاں ہم خیالی، محبت، عقیدت اور دوستی کی بنیاد
> بنتی ہے اور منزلوں کا اشتراک ہمیں رفاقت کی لڑی میں پرو دیتا ہے۔''(۶۲)

محبت اور نفرت انسان کے دو انتہائی حساس جذبات ہیں۔ محبت بھی انسان کو عقل و شعور سے دور کر سکتی ہے اور نفرت بھی انسان کو اندھا کر سکتی ہے۔ بہت سے فلسفیوں نے محبت کے عنوان کو اپنی اپنی سوچ کے مطابق پرکھتے ہوئے اس پر نقطہ نظر قائم کیے ہیں۔ انسانی سوچ پر سب سے زیادہ حاوی ہونے والا اور پروان چڑھنے والا جذبہ محبت ہی ہوتا ہے۔ انسان محبت کے لیے قربانیاں دیتا ہے حتیٰ کہ اپنی زندگی تک قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ محبت ہی تو ہے جو شعراء کو موضوعات فراہم کرتی ہے اور ان کے دیوان مکمل ہوتے ہیں الغرض انسان محبت کا بھوکا ہے۔

انسانی عقیدت کی حدود بھی محبت ہی کے خیمے میں موجود ہے دراصل انسان اپنی محبت کے بل پر خود میں احساس محسوس کرتا ہے اور یہی بنیادی انسانیت کا درس ہے۔ شاہد صدیقی کے ہاں محبت کا فلسفہ بہت خوبصورت ہے وہ سمجھتے ہیں کہ محبت ''من و تو'' کا نہیں بلکہ ''تو ہی تو'' کا فلسفہ ہے۔ اس میں انسان خود کو مٹا دے تو ہی منازل طے کر سکتا ہے وہ پروفیسر رائے کی زبان سے نقل کرتے ہیں کہ محبت کاروبار نہیں جس میں

لین دین اور سودے بازی کا چلن ہو۔ محبت تو قربانی ہے جو اپنی حیثیت سے کوئی بھی ادا کرے۔ پروفیسر رائے کے فلسفیانہ نظریات ملاحظہ ہوں:

> ”محبت زندگی ہے۔ محبت کے بغیر کوئی جذبہ، کوئی خواب مکمل نہیں۔“
>
> ”لیکن سر اگر آپ جس سے محبت کرتے ہو وہ اس کا جواب نہ دے تو؟ مثلا سر اگر یکطرفہ طور پر ہی۔“ میں نے اپنی دلیل دی ”میں سمجھ گیا۔“ میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی سر رائے بولے محبت کاروبار نہیں کہ اس میں مول تول ہو۔ محبت میں کوئی منطق کوئی reasoning نہیں ہوتی۔ آپ جس سے محبت کرتے ہیں اسے خوش دیکھنا چاہیے۔ کسی عمل کا بدلہ نہیں چاہتے اگر کوئی ایسا چاہتا ہے تو محبت نہیں کاروبار کر رہا ہے۔“ (۶۳)

پروفیسر رائے مزید بحث کرتے ہوئے یکطرفہ محبت کے حق میں دلائل کا وزن بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ محبت وہ جذبہ ہے جو ناقابل بیان ہے ملاحظہ ہو۔

> ”اور سر یہ کیا بات ہوئی آپ تو محبت کرتے چلے جائیں اور جس سے محبت کریں وہ اتنا کٹھور ہو کہ ____“
>
> سر رائے مسکرائے۔ وہی دل آویز مسکراہٹ اور کہنے لگے۔
>
> ”محبت ایک ایسا جذبہ ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ محبت کسی آدرش، کسی جذبے، کسی نظریے، کسی ان دیکھی صبح سے بھی کی جا سکتی ہے۔“ (۶۴)

پروفیسر رائے کا نظریہ محبت کے بارے میں کچھ عجیب نہیں ہے کیوں کہ عمومی خیال کی طرح پروفیسر رائے کا کہنا بھی یہی ہے کہ محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے اور انسان کب محبت میں گرفتار ہو گیا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ان کا خیال ہے کہ سب سے ارفع محبت خواب کی ہے یا پھر نظریاتی۔ بسا اوقات جس سے محبت کی جاتی ہے اسے ایک طویل عرصہ تک معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس سے محبت کی جا رہی ہے۔ شاہد صدیقی پروفیسر سہارن رائے سے محبت کے موضوع کو تفصیل سے یوں بیان کرواتے ہیں:

> ”خواب اور نظریے کی محبت سب سے ارفع محبت ہے جو ہمیں باقی تمام محبتوں سے بے نیاز کر دیتی ہے، یا یوں سمجھو کہ پھر اس خواب اور نظریے سے وابستہ سب

لوگوں سے ہمیں محبت ہو جاتی ہے۔ محبت قربانی مانگتی ہے۔ کبھی مال کی، کبھی مرتبہ کی، کبھی جان کی۔"

"توبہ سر توبہ! میں نے نہیں کرنی یہ محبت۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا ایسے میں ویٹر نے کہا۔ "ہائی ٹی کا وقت ختم ہونے والا ہے۔"(۶۵)

آدھے ادھورے خواب کے مصنف شاہد صدیقی کے نزدیک محبت کیے جانے کا فلسفہ ایک مضحکہ خیز بات ہے کیوں کہ وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے اور جو کی جائے وہ محبت نہیں کچھ اور ہے۔ پروفیسر سہارن رائے کی زبان سے وہ اپنا یہ فلسفہ یوں بیان کرواتے ہیں کہ:

"ہاں تو تم کہہ رہی تھی تم نے محبت نہیں کرنی۔ اصل میں محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی پیشگی منصوبہ بندی نہیں ہوتی۔۔۔۔

"اتنے ہی خوش قسمت لوگ وہ ہوتے ہیں جو محبت کرتے ہیں۔" سر رائے بولے۔ انہوں نے کھڑکی سے باہر بیلوں سے لپٹے نیلے رنگ کے پھولوں کو دیکھا، تبسم کیا اور بولے۔

"بہت سے لوگوں کو آخر تک علم نہیں ہوتا کہ ان سے محبت کی جا رہی ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ انہیں محبت ہو گئی ہے۔ اس کا پتا تب چلتا ہے جب دیر ہو چکی ہوتی ہے۔"(۶۶)

"آدھے ادھورے خواب" کے مصنف شاہد صدیقی نے اپنے کرداروں کو جیتی جاگتی تصویروں کی شکل میں پیش کرتے ہوئے اپنی تحریر کو زندہ مثال بنایا۔ انھوں نے اپنی تحریر کے ذریعے معاشرے کے خوبصورت اور بدصورت پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

شاہد صدیقی کے ہاں ایک اُستاد کی شخصیت اور اس کے نظریات کی اہمیت واضح ہے لیکن وہ اساتذہ کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویہ جات پر ایک ناقد کی نظر سے مطالعہ کرتے ہوئے معاشرہ کا تعلیم اور معلّم کے بارے میں خوب صورت اور بدصورت چہرہ نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ناول میں معاشرے میں اُستاد کی حیثیت کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس ناول کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے مصنف تعلیم اور ادبیات کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو کم کرنے کے لیے پروفیسر سہارن رائے جیسے کردار کا سہارا لے کر ایک جان دار قلمی و علمی تحریک کی جانب پیش قدمی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

ج) منتخب ناولوں میں اُستاد بطور فلسفی: مجموعی و تقابلی جائزہ

نظامِ کائنات متضاد رویہ جات کا عکاس ہے۔ اچھائی اور بُرائی کا تصور، جھوٹ اور سچ کا تقابل، رات اور دن کا ہیر پھیر، نیکی اور بدی کا تضاد، نشیب و فراز کا سلسلہ، رحم اور ظلم کا مدِ مقابل ہونا، روشنی اور اندھیرے کے درمیان کھینچا تانی، علم اور جہل کے درمیان خلیج، یہ سب مثالیں ہمیں متضاد رویہ جات کو سمجھنے میں مدد و معاون ہیں۔

یہ سارے عکس، انسانی شعور پر نقش کرنے کے لیے قلم کا سہارا لیا جاتا ہے جو کہ ایک طاقت ور ہتھیار ہے۔ اُستاد کی شخصیت میں فلسفی کے حوالہ سے زیرِ بحث عنوان میں چار مختلف ناولوں کو لیا گیا ہے، در حقیقت چار مختلف شعور آپس میں تقابل کے لیے جوڑے گئے ہیں۔ بانو قدسیہ ''راجہ گدھ''، انیس ناگی ''دیوار کے پیچھے''، فہیم اعظمی ''جنم کنڈلی'' اور شاہد صدیقی ''آدھے ادھورے خواب'' کے ذریعے اپنی زندگی کی تحقیق کا نچوڑ اور ادراک و مشاہدہ کا عکس پیش کرتے ہیں۔

اگر ''راجہ گدھ'' کا جائزہ لیا جائے تو اس کے ٹائٹل میں دو چیزیں مذکور ہیں ایک راجہ یعنی بادشاہ اور دوسرا گدھ یعنی مردہ خور ایک جانور۔۔۔ اس ناول کے عنوان سے معلوم پڑتا ہے کہ بانو قدسیہ انسان اور انسانیت کی موجودہ حقیقتوں پر بحث کرنا چاہتی ہیں اور عام معاشرتی برائیوں کو زیرِ بحث لانا ہی ان کا اصل مقصود نظر ہے۔ بانو قدسیہ کے ہاں محاسن و معائب کی ایک تفصیل اس ناول کے حصار میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مصنفہ اپنے اس علامتی ناول میں عشق کی رموز کو بھی موضوعِ بحث بناتی ہیں۔ عشق حقیقی کیا ہے، عشق کی حقیقت کیا ہے، عشق کا نظریہ کیا ہے، عشق میں فلسفہ کیا ہے اور آج کے دور میں رائج عشق اور عشق کی تباہ کاریاں کیا ہیں۔۔۔ یہ تمام تر موضوعات کی اکھاڑ پچھاڑ ہمیں اسی ناول کا حصہ دکھائی دیتی ہیں۔ بانو قدسیہ اپنے ناول ''راجہ گدھ'' کے ذریعے اپنے معاشرہ میں موجود اچھائی کا لبادہ اوڑھے ہوئے بدترین چہروں کی نقاب کشائی بھی کرتی ہیں۔ لبابہ نجمی اس عنوان پر ''راجہ گدھ'' کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> ''یہ کہانی کئی نظریات کے محور میں گردش کرتی ہے ایک فرائیڈ کا نظریہ انسانی جبلت، جہاں انسان کی اشتہا کا کسی بھی صورت میں پایہء تکمیل ہونا ضروری ہے۔ مگر مصنفہ کہتی ہیں کہ ایسی اشتہا عشقِ لاحاصل کی جستجو ہے۔ ''مانے نہ مانے کوئی۔۔۔۔۔ اصل پاگل پن کی صرف ایک وجہ ہے۔۔۔۔ صرف ایک وجہ، عشق لاحاصل۔۔۔۔ عشق لاحاصل۔۔۔۔ عشق لاحاصل۔'' (٦٧)

"راجہ گدھ" میں موجود دیگر موضوعات کی طرح ایک فلسفہ حرام وحلال کا بھی ہے۔ ان کے نزدیک حرام کھانے سے اگلی کئی نسلوں تک اس کے اثرات جاتے ہیں۔ وہ اپنی بائیولوجیکل بحث میں غیر مرئی صورتوں کو بھی جینیاتی منتقلی کا حصہ بناتی ہیں۔ بانو قدسیہ کے بقول جب کوئی جسم حرام خوری سے پروان چڑھتا ہے تو لازمی طور پر اس میں کچھ غیر اخلاقی عادات شامل ہو جاتی ہیں اور یہ اسی ایک جسم تک موقوف نہیں رہتا بلکہ اگلی متعدد نسلیں اس حرام رزق کی تباہ کاریوں کا شکار ہوتی ہیں۔

> "دوسرا نظریہ حرام اور حلال رزق سے انسان میں پیدا ہونے والی بائیلوجیکل تبدیلی جو مابعد الطبیعات اور انسانی نفسیات کے تغیر کا بڑا سبب بنتی ہے جس کے نتائج دور تک دکھائی دیتے ہیں اور آنے والی کئی نسلیں یا تو ہمہ وقت یا پھر کسی ایک نسل کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرتی ہے۔"(۶۸)

بانو قدسیہ نے ناول میں امیر گھرانے کو پیش کیا ہے جو بیوروکریسی کے سبب اپنی عائلی زندگی کی چپقلش میں اولاد کو اس کا حق نہیں دیتا، سیمی اسی گھرانے کی لڑکی جو اس کہانی کا اہم کردار اسی چپقلش اور بے توجہی کا شکار ہو کر حالات کے ہاتھوں مجبور اور محبت میں ناکامی کی وجہ سے خودکشی کر لیتی ہے۔ دراصل کہانی آفتاب قالین ساز گھرانے کا دولت مند خوش شکل نوجوان، سیمی حسین اور امیر طبقے سے تعلق، قیوم دیہاتی نوجوان کی محبت کی تکون ہے جس میں سیمی و آفتاب ایک دوسرے سے اور قیوم سیمی سے محبت کرتا ہے مگر پروفیسر سہیل کی باتوں کی وجہ سے اور اپنے خاندان کے دباؤ میں آکر ان کی مرضی سے آفتاب شادی کر لیتا ہے۔ سیمی اس صدمے کو برداشت نہیں کر پاتی اور قیوم سے محض اس لیے غلط مراسم قائم کر لیتی ہے کہ شاید آفتاب اور قیوم دونوں نے ہاسٹل میں ایک ساتھ رہتے ہوئے ہم جنسی وقت گزارا ہو، اس کے باوجود بھی وہ خودکشی سے باز نہ آسکی مگر والدین نے پھر بھی پلٹ کر خبر نہ لی۔

کہانی ایک دوسرا موڑ لیتی ہے جہاں پروفیسر سہیل جو گورنمنٹ کالج لاہور میں ان تینوں کے سوشیالوجی کے پروفیسر ہوتے ہیں، کی ملاقات قیوم سے ہوتی ہے۔ پروفیسر سہیل قیوم کی حالت السر کو دیکھ کر مختلف یوگا کی مشقیں کرنے کی تجاویز دیتے ہیں۔ قیوم کی یہ حالت پے در پے مختلف عورتوں سے کیے گئے ناجائز تعلقات کی بناء پر ہوتی ہے جہاں اس کا جسم اور روح بری طرح متاثر ہو چکی ہوتی ہے۔ قیوم اس ناول کا ایک ایسا کردار ہے جو باقی تمام کرداروں سے تعلقات استوار کرتا ہے کسی سے جائز تو کسی سے ناجائز۔ لبابہ نجمی نے ناول "راجہ گدھ" پر مزید تبصرہ یوں کیا ہے:

> ”قیوم معاشرے کا وہ فرد ہے جس کی شومئ قسمت دیکھئے کہ وہ جس عورت کی طرف بڑھتا ہے وہ پہلے کسی نا کسی سے وابستہ ہوتی ہے اور یوں قیوم کے اس سے تعلقات گدھ کے علامتی معنی کو پورا کرتے ہیں۔ مصنفہ اس کا جواز یوں سامنے لاتی ہیں کہ اس کی پچھلی نسلیں ایسے کسی جرم اور رزقِ حرام کی مرتکب ہوئیں۔“(٦٩)

ناول کا ایک کردار آفتاب شادی کر کے بیرونِ ملک چلا جاتا ہے اور وہاں سے پاکستان واپسی بیٹے کے پاگل پن کی کیفیت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اب وہ بیٹے کو اس حالت دیوانگی میں دیکھ کر اذیت و کرب تا عمر برداشت کرے گا جو اس کا سیمی کے ساتھ کی گئی زیادتی کا مکافاتِ عمل ہے۔ مصنفہ کا اسلوب سادہ اور جدید وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

انگریزی زبان کے الفاظ کی اردو میں آمیزش چونکہ آج کا رواج ہے سو ناول میں الفاظ کا بکثرت استعمال ملتا ہے۔ نئے سائنسی علم کے مطابق غذا کا معدے تک پہنچنا نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی تبدیلیوں کا بھی مؤجب بنتی ہے جو انسان سے ضبطِ نفس یعنی برداشت و صبر چھین لیتی ہے۔ ناول انتہائی فکر انگیز پہلوؤں کا ادراک کرواتا ہے جن پر مذہبی نظریہ سمجھ کر توجہ نہیں دی جاتی۔ اخلاقِ فضیلہ سے پہلو تہی اخلاقِ رذیلہ کو جنم دیتی ہے جہاں شاہین وعقاب پیدا نہیں ہوتے بلکہ راجہ گدھ پیدا ہو کر سماج کو اپنی لپیٹ میں لے کر ٹھکانے لگا دیتے ہے۔ بلاشبہ یہ ناول ایک نفسیاتی اور کلاسیکل ناول ہے۔

انیس ناگی نے ”دیوار کے پیچھے“ ناول میں دوستو فسکی، کافکا آندرے ژید، فاکز، سارتر، اور کامیو کی ادبی روایت کو پاکستان میں محض متعارف نہیں کروایا بلکہ خود اس روایت کو آگے بڑھایا ہے جیسے ڈاکٹر عبدالسلام نے آئن سٹائن کے نظریے کو ترقی دی ہے یورپ میں یہ روایت پانچویں دھائی میں زوال پذیر ہو گئی تھی۔ کامیو کا انتقال ١٩٦٠ء کے پہلے عشرے میں ہوا، سارتر دوسری جنگ عظیم کے بعد مارکس کے گوشہ عافیت سے پناہ کا طلب گار رہا ہے، یوں اس کا رشتہ وجودی ادب اور دانش سے ٹوٹ چکا تھا دوسری طرف وجودیوں کی دوسری نسل اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار میں ناکام رہی ہے، کولن ولسن کے بعد اس کی دلچسپیوں کا رخ بدل گیا ہے، اجتماعی تعمیر کے بعد جنگ کی یورپی جدوجہد کی کامیابی اور سیاسی و معاشی استحکام نے اس تبدیلی کا رخ متعین کیا ہے۔ قاضی جاوید نے انیس ناگی کے ناول ”دیوار کے پیچھے“ پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

"وجودی فلسفہ ادبی عمل کے دوران پر حاصل ہونے والی انسانی مقدر کے برابر میں بصیرت تخلیقی تحریک حاصل کرتا رہا ہے "دیوار کے پیچھے" نئے انسان کے وجودی کرب کا ایک تخلیقی بیان ہے اس لئے گراں قدر ادبی تخلیقی ہونے کے علاوہ فلسفے کے نئے امکانات سے بھی حاملہ ہے۔"(۷۰)

شاہد صدیقی کا ناول "آدھے ادھورے خواب" انتہائی دلچسپ ہے جو معاشرے کی ترویج و ترقی کو تعلیم کے ذریعے فروغ دینا چاہتا ہے۔ناول کے تین کردار بڑے جاندار معلوم ہوتے ہیں پروفیسر سہارن رائے، تصور، امتثال آغا۔پوری کہانی میں محبت کا فلسفہ بھی نظر آتا ہے اور اپنے مقصد کے لیے جان قربان کرنے کا فلسفہ بھی۔ ناول شروع سے لے کر آخر تک قاری کو اپنے سحر میں لیے رکھتا ہے پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن لاہور کے چیئر مین "آدھے ادھورے خواب" کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"شاہد صدیقی کا یہ ناول حسنِ زبان کا مرقع ہے اور اسلوبِ بیاں کا سحر انگیز شاہکار بھی ۔یہ عام مروجہ روایتی محبتوں کی کہانی نہیں بلکہ ارفع مقاصد کے شعور سے عبارت ایک ایسی داستان ہے جو قاری کو نامحسوس انداز میں اپنی گرفت میں جکڑ لیتی ہے۔ پروفیسر سہارن رائے اور امتثال آغا کے فکری اشتراک کی بنیاد سماجی برابری، انصاف اور آزادی کے خواب ہیں، خواب جن کی تعبیر کی تلاش میں انسان کو بعض اوقات جاں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔"(۷۱)

فہیم اعظمی کا ناول "جنم کنڈلی" میں بیانیہ پیرائے کو ترک کر کے تلازمِ خیال، اررینشنل اور ایسبرڈ کو پیرایۂ اظہار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے چونکہ مصنف فلسفہ کا طالب علم ہے اور زندگی کے تلخ تجربات کی وجہ سے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ خالص بیانیہ پیرایۂ حقیقت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتا۔ناول کا موضوع بیسویں صدی کا آدمی ہے جو اپنے بلند و پست اور اندھیرے اجالے سے غم اور خوشی کے موسموں کا ادراک کرتا ہے۔ آدمی بے چارہ کرے تو کیا کرے اسے آخری سانس کے انتظار میں زندگی کے تمام کرب ناک پہلوؤں سے نبرد آزما ہونا ہی پڑتا ہے۔ناول کا مرکزی کردار خود کلامی میں اپنے وجود کی معنویت کا متلاشی ہے۔

ناول میں کشکول کا ذکر بھی معنی خیز ہے جس کا ذکر بیسویں صدی جو کہ اقدار کی مکمل نفی کی صدی ہے کے ساتھ دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔یہ ناول بیسویں صدی کے ایک ایسے آدمی کی جنم کنڈلی ہے جس کا مقدر مسلسل بھٹکتا ہے۔پروفیسر انجم اعظمی "جنم کنڈلی" کے بارے میں یوں رقم طراز کرتے ہیں:

"فہیم اعظمی نے اس ناول کے پیرایۂ اظہار میں بیانیہ کے عناصر کو بھی خاطر خواہ جگہ دی ہوتی تو ناول کی دلچسپی میں یقیناً اضافہ ہوتا لیکن اس عہد کے بنیادی سوالوں کو جس طرح اس ناول میں سمیٹا گیا ہے اس کی بنا پر بہر صورت ناول کی اہمیت پوری طرح اجاگر ہے۔ فہیم اعظمی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بیسویں صدی کے بساط کے سارے مہرے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور آپ چاہیں تو کشکول کے نہ بھرنے کے سلسلے میں اس ناول کو الٹی دعا سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔"(۷۲)

چاروں مصنفین کے ہاں ایک اُستاد کو معاشرے میں جو مقام حاصل ہے اس پر بحث مقصود ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ اُستاد کے معاشرتی مقام چاروں کے ہاں ہی الگ الگ ہے۔ بانو قدسیہ کے ناول "راجہ گدھ" میں موجود پروفیسر سہیل فلسفی تو نظر آتا ہے مگر اس کی شخصیت میں لا ابالی پن ہے جو کہ اس کی گفتگو میں صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ فہیم اعظمی کے ہاں ماسٹر کا کردار گو کہ ناول میں بیک اینڈ (Back End) پر ہے مگر یہ کردار انتہائی مضبوط ہے اور اس کا علم متعدد ادوار و شخصیات تک محیط ہے۔ شاہد صدیقی کے ہاں اُستاد کا فلسفیانہ رویہ کبھی کبھار کسی جارح مزاج انقلابی لیڈر کا روپ دھار لیتا ہے اور بسا اوقات زندگی کی حقیقتوں سے پردہ چاک کرتا ہوا کوئی انتہائی مدبّر انسان بھی اسی کردار میں دکھائی دیتا ہے۔ انیس ناگی کے ہاں جس چہرے میں اُستاد کو دکھایا گیا ہے وہ دکھانا انتہائی ضروری بھی تھا کیوں کہ ہمارے معاشرہ میں علم اور معلّم کا وہ احترام اور مقام ــــــ جو کہ ایک اُستاد کا ہونا چاہیے ــــــ نہیں دیا جاتا بلکہ اساتذہ کو بھی دولت اور مادی قیمت کے مترادف تصور کیا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ اُستاد جسے کبھی اپنے پیشے پر فخر تھا آج کے دور میں اپنے ہی پیشے پر منہ چھپاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

الغرض چاروں مصنفین نے انتہائی زیرک خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معاشرہ کے تاریک پہلوؤں کو موضوعِ اظہار بنایا ہے تاکہ ادراک کی منازل طے کرنے میں آسانی رہے اور قارئین کی شعور کی سطح پر جو کچھ جاننا از حد ضروری ہے، اس کا ابلاغ ہو۔

حوالہ جات

۱۔ شاہد مختار، افلاطون کے نظریات (مضمون)، روزنامہ دنیا، ۶ مئی ۲۰۱۸ء

۲۔ محمد عبداللہ خان، خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۴۵۹

۳۔ سیّد احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ (جلد سوم)، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۹۷۰

۴۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۲۱۳

۵۔ فیروز اللغات، اردو جامع، مرتبہ، الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۹۳۷

۶۔ اقبال خان، جدید تعلیمی فلسفہ (جان ڈیوی سے پاؤلو فریرے تک)، مترجم (مسعود اشعر) مشعل، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۹

۷۔ وردہ بلوچ، فلسفی اور ماہر تعلیم جان ڈیوی (مضمون)، روزنامہ دنیا، ۸ جولائی ۲۰۱۸ء

۸۔ ایضاً

۹۔ اقبال خان، جدید تعلیمی فلسفہ (جان ڈیوی سے پاؤلو فریرے تک)، ص ۳۴-۳۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۲-۴۳

۱۱۔ روح الامین، سیّد، اسلام کا فلسفہ تعلیم (مضمون)، نوائے وقت، ۱۷ دسمبر ۲۰۱۶ء

۱۲۔ اقبال خان، جدید تعلیمی فلسفہ (جان ڈیوی سے پاؤلو فریرے تک)، ص ۲۹۷

۱۳۔ محمد اقبال، علّامہ، کلیات اقبال، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی فروری ۱۹۸۱ء، ص ۴۸۰

۱۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، قبال سب کے لیے، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۳۲-۱۳۳

۱۵۔ طالب سیال، ڈاکٹر، اقبال کا فلسفہ علم اور ہمارا نظامِ تعلیم (مضمون)، روزنامہ نئی بات، ۸ نومبر ۲۰۱۸ء

۱۶۔ منیر نیازی، کلیات منیر، دوست پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۳۳۱

۱۷۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۳۷

۱۸۔ سیّد محمد سلیم، پروفیسر، مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۱۴

۱۹۔ فخر الدین محمد بن رازی، امام، فلسفہ مشرق (مباحث مشرقیہ)، ترجمہ از سید عبدالباقی شطاری، ہادی بکس، کراچی، ۲۰۱۹ء، ص ۲۸۳

۲۰۔ کامران اعظم سوہدروی، اسلام اور فلسفہ، بک ٹائم، کراچی، ۲۰۱۷، ص ۵

۲۱۔ محمد نواز کنول، ڈاکٹر، مولانا جلال الدین رومی ایک مطالعہ، خوشی محمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۷۰

۲۲۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۰

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۲

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۴

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۰۶

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۰۷

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۰۸

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۳۹

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۷۳-۲۷۴

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۷۵

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۷۵-۲۷۶

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۷۶

۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۷۶-۲۷۷

۳۶۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۵۳

۳۷۔ سعید انصاری، اکابر تعلیم، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دلّی، ۱۹۷۳ء، ص ۱۱

۳۸۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، ص ۵۲

۳۹۔ ایضاً، ص ۶۰-۶۱

۴۰۔ ایضاً، ص ۶۱

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ فہیم اعظمی، جنم کنڈلی، الباقریہ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص۲۶۸
۴۴۔ ایضاً، ص۲۵۸-۲۶۹
۴۵۔ ایضاً، ص۲۴۷-۲۴۸
۴۶۔ ایضاً، ص۱۳۸-۱۳۹
۴۷۔ ایضاً، ص۱۳۹
۴۸۔ اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر الہ آبادی، جلد اول، بزم اکبر، کراچی، ص۱۴۶-۱۴۷
۴۹۔ آشو مشرا، www.rekhta.com
۵۰۔ شاہد صدیقی، آدھے ادھورے خواب، جہانگیر بکس، فیصل آباد،، ۲۰۰۹ء، ص۱۵
۵۱۔ ایضاً، ص۱۹
۵۲۔ ایضاً، ص۱۹-۲۰
۵۳۔ ایضاً، ص۲۹-۳۰
۵۴۔ ایضاً، ص۴۱
۵۵۔ ایضاً، ص۴۱-۴۲
۵۶۔ ایضاً، ص۴۲
۵۷۔ ایضاً، ص۴۲-۴۳
۵۸۔ القرآن الحکیم، التغابن، آیت ۱۵
۵۹۔ شاہد صدیقی، آدھے ادھورے خواب، ص۶۴
۶۰۔ ایضاً، ص۷۱
۶۱۔ ایضاً، ص۱۱۹-۱۲۰
۶۲۔ ایضاً، ص۷۲
۶۳۔ ایضاً، ص۱۲۴-۱۲۵
۶۴۔ ایضاً، ص۱۲۵
۶۵۔ ایضاً، ص۱۲۶
۶۶۔ ایضاً، ص۱۲۶-۱۲۷

۶۷۔ www//:https-humsub-com-lubaba-najmi/19578/pk/

۶۷۔ ایضاً

۶۹۔ ایضاً

۷۰۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، ص ۱۹۱

۷۱۔ شاہد صدیقی، آدھے ادھورے خواب، بیک ٹائٹل

۷۲۔ فہیم اعظمی، جنم کنڈلی، ص ۱۴

باب سوم

منتخب ناولوں میں معلّم بطور قائد کی پیشکش کا مطالعہ

انسان دنیامیں کبھی تنہاوقت نہیں گزار سکتا،وہ کئی رشتوں ناتوں کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔ان میں سے کچھ رشتے اور تعلق،خون کے ہوتے ہیں جب کہ بہت سے رشتے اور تعلق روحانی،اخلاقی اور معاشرتی طور پر بنتے ہیں۔ ان میں ایک رشتہ اُستاد کا بھی ہے۔ اساتذہ کو معاشرے میں روحانی والدین کا درجہ حاصل ہے۔ اسلام میں اُستاد کارتبہ والدین کے رتبے کے برابر قرار دیا گیاہے کیونکہ دنیامیں والدین کے بعد اگر کسی پر بچے کی تربیت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو وہ ہمارے اُستاد ہیں کیونکہ اُستاد ہی ہیں جو دنیامیں جینااور رہنا سکھاتے ہیں اور کتابوں کا علم سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔اس لحاظ سے اُستاد واجب الاحترام شخصیت ہیں۔

اُستاد معمار قوم ہوتا ہے اس لیے واجب الاحترام اور لائق تعظیم ہے،ایک زمانہ تھاجب طالب علم حصول علم کی تلاش میں میلوں کا سفر پیدل طے کرتے تھے سالہاسال ملکوں ملکوں گھومتے گھر بار سے دور رہ کر اپنے علم کی پیاس کو پورا کرتے تھے۔ اُستاد کی سزاؤں کو جھیلتے تب جاکر نگینہ بنتے مگر اُس دور میں طالب علم باادب اور باتہذیب ہوتے تھے۔اُستاد کے قدموں میں بیٹھنا،ان کی باتوں کو خاموشی سے سننا،مذاق اڑاناتو دور کی بات نظر اٹھاکر بات کرنے سے بھی ڈرتے تھے۔

اسلام نے مسلمانوں پر علم فرض قرار دیاہے اور اسلام کی نظر میں اُستاد کو معزز رتبہ دیاہے تاکہ اس کی عظمت سے علم کاوقار بڑھ سکے۔علم کی قدر اُس وقت ممکن ہے جب معاشرے میں اُستاد کو عزت دی جائیگی اور ہمیشہ وہ طالب علم ہی کامیاب ہوتے ہیں جو اُستاد کا احترام کرتے اور ان کی عزت کرتے ہیں۔

وقت نے اپنی اڑان بھری تو انسان بھی کئی ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا گیااور اگر وقت بدلا تو تہذیب اور آداب کے انداز بھی ساتھ ساتھ بدلتے گئے۔کسی بھی تہذیب و تمدن کی خوبصورتی اس بات میں ہے کہ اس کو بطور حوالہ و مثال پیش کیا جاسکے۔ اوراق تاریخ اس امر کے شاہد ہیں کہ بھلائی اور سچائی پر عمل پیرا، اقوام اپنی تہذیب و تمدن کی شائستگی اور پختگی کے لیے درست سمتوں کی جانب بڑھتے بھی رہے اور نئی جہتوں کا تعین کرنے میں بھی تاک رہے۔اگر دیکھا جائے تو ترقی یافتہ،ترقی پذیر اور پسماندہ اقوام میں سے ہر ایک کو اپنی موجودہ ثقافت کو اگلی نسلوں تک منتقل کرنے میں دلچسپی رہی اور اس کے لیے وہ ہمیشہ سے ہی مضبوط اقدام

اٹھاتے رہے لیکن یہ کہنا بھی بے جا نہیں کہ روایات و افکار اور تہذیب و تمدن کی اگلی نسلوں تک منتقلی کا بیڑہ تعلیم نے اٹھایا اور ہر نسل کا اپنے اکابرین کی جدوجہد اور اوصاف سے روشناس ہونا دراصل تعلیم ہی کا مرہون منت ہے۔ یہاں پر یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اس سارے فلسفہ کے پس منظر میں علم کی ایک مکمل اور مجسم تصویر ہمیں اُستاد کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ اُستاد ہی وہ شخصیت ہے جس کے بدولت تعلیم کی بنیادیں مضبوط ہیں اور متعلم کے لیے سیکھنے (Learning) کا عمل دلچسپی کا باعث ہے۔

اُستاد کی تعلیمی لیاقت ،ذاتی اوصاف اور اس کو تربیت فراہم کرنے والے ادارے اور معاشرے میں پسندیدہ اقدار کے منتقلی میں ایک طاقتورذریعہ کا کردار انجام دیتے ہیں۔ اساتذہ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ طالب علموں کی پوشیدہ صلاحیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کو بہتر طریقے سے پروان چڑھاتے ہیں۔ اس پر مزید بحث سے پہلے ہم معلّم اور اُستاد کے معانی و مفاہیم کا جائزہ لیتے ہیں۔

معلّم کے متعلق " فرہنگ آصفیہ " کی جلد نمبر چار میں مولوی سیّد احمد دہلوی یوں قلم فرسائی کرتے ہیں:

"معلّم (ع) اِسم مذکر: علم سکھانے والا، اخوند، اُستاد، ادیب، گُرو، پاٹک، پنڈِت، پالما، مُلّا، مولوی، ٹیچر، مدرّس، میاں جی۔" (۱)

محمد عبد اللہ خان خویشگی نے بھی معلّم کے بارے میں "فرہنگ عامرہ" میں یوں رقم کیا ہے:

"معلّم۔ مُع۔لِم۔ آگاہ کرنے والا،" (۲)

"فرہنگ تلفظ" میں اُستاد کے معنی کچھ یوں درج ہیں:

"پڑھانے والا، معلّم، مؤدب، کسی فن کا ماہر، چالاک، عیار آدمی۔" (۳)

"فرہنگ تلفظ" میں معلّم کے معنی یوں بیان کیے گئے ہیں:

"پڑھانے والا، اُستاد" (۴)

"اظہر اللغات" میں معلّم کے بارے میں یوں لکھا گیا ہے:

"سکھانے والا، اُستاد، ماسٹر، مکہ و مدینہ میں دعائیں پڑھانے والا" (۵)

اُستاد کی عظمت کے بیان کے لیے اس سے بڑی بات کیا ہوسکتی ہے کہ تمام انبیاؑء بشمول حضرت محمدّ ﷺ کو معلّم بنا کر بھیجا گیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا" جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھایا، مَیں اُس کا غلام ہوں، وہ چاہے مجھے بیچے، آزاد کرے یا غلام بنائے رکھے"۔ تو ذرا سوچیے کہ وہ انسان، جو ہمیں شعور و آگہی

اور تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتا ہے، معاشرے میں اُٹھنے بیٹھنے کے قابل بناتا ہے، مہذّب دنیا کے طور طریقے سکھاتا ہے اور سب سے بڑھ کر ہماری کامیابیوں پر ہم سے زیادہ خوش ہوتا ہے، اُس اُستاد کا مقام و مرتبہ کتنا بلند ہو گا۔

ہمارے مذہب میں اساتذہ کو" روحانی والدین" کا درجہ دیا گیا ہے۔ اُستاد کا ادب و احترام ہر طالبِ علم پر لازم ہے کیونکہ وہ اپنے شاگردوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتا، اُن کی انفرادی، اجتماعی اور اخلاقی تربیت کر کے انہیں ایک اعلیٰ مقام تک پہنچاتا ہے، جو گمان کو یقین میں ڈھالتا اور پتھروں سے ہیرے تراشتا ہے۔ والدین کے بعد دنیا میں جتنے بھی رشتے ہیں، اُن میں سب سے پاکیزہ اور مقدّس رشتہ اُستاد اور شاگرد ہی کا مانا جاتا ہے۔ ایک اچھا اُستاد اپنے شیریں اندازِ گفتگو، توجّہ، محنت اور مشفقانہ رویّے سے شاگردوں کو اپنا گرویدہ کر لیتا ہے۔ وہ علم کا سرچشمہ ہوتا ہے، تب ہی تو قوموں کی تعمیر و ترقی میں اساتذہ کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ تعمیرِ انسانیت اور علمی ارتقاء میں اُستاد کے کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدائے آفرینش سے نظامِ تعلیم میں اُستاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

الف) اُستاد بطور قائد کی مثالی خصوصیات

معاشرے کی فلاح و بہبود، جذبہٗ انسانیت کی نشوونما اور افراد کی تربیت سازی کی وجہ سے استاد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کی تربیت میں اس طرح مگن رہتا ہے، جیسے ایک باغبان اپنے پیڑ، پودوں کی نگہداشت میں۔ تدریس وہ پیشہ ہے، جسے صرف دینِ اسلام ہی میں نہیں دنیا کے ہر مذہب اور معاشرے میں نمایاں مقام حاصل ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اُستاد کی اصل قدر و منزلت جس طرح اسلام میں اجاگر کی گئی، کسی اور مذہب میں نہیں۔ اللہ ربّ العزّت نے قرآن پاک میں نبی اکرم ﷺ کی شان بحیثیت معلّم بھی بیان کی ہے۔

سب محنتوں سے اعلیٰ درجے کی محنت اور کارگزاریوں میں سب سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری معلّمین کی ہے۔" اساتذہ عظمت و اہمیت کے عکّاس ہیں، اُستاد کے ادب و احترام اور عظمت کے حوالے سے اکابرین کے بیان کردہ متعدد واقعات اِس بات کا ثبوت ہیں کہ اساتذہ کی عزّت اور ادب و آداب کے بغیر انسان کبھی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔

ادنی واعلیٰ خصوصیات کے حامل طلبہ کے ساتھ عادلانہ و مساویانہ تعلیمی منصوبہ بندی اور عمل پیرائی ایک اچھے اُستاد کا جوہر خاص ہوتا ہے۔انسانیت کے چراغوں کو روشن و منور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ طلبہ کے فطری محرکات ،خواہشات اور رویوں کو شائستہ بنانے کے ساتھ انھیں صحیح سمت پر گامزن کریں۔طلبہ میں یقین و خود اعتمادی کے فروغ کے علاوہ ایک اُستاد کا فرض اولین ہوتا ہے کہ وہ طلبہ میں تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارنے کے ساتھ ساتھ ان کی تر قی کی راہوں کو متعین کر یں اورانھیں مسلسل نئے تعلیمی طریقوں و رجحانات سے روشناس کرتا ر ہے۔اساتذہ کے مطلوبہ اوصاف میں علمیت ،حس مزاح، باہمی اشتراک ،جذبہ خدمت ، پیشہ سے دیانت ، شخصی جاذبیت، کھلاذہن، توجیہ و استدلال ،قوت ارادی ،استقلال ،غیر جانبداری ،مہذب انداز اور عزت نفس جیسے اوصاف کا پایا جانا نہایت اہم تصور کیا جا تاہے کیونکہ طلبہ پر گہرا اور دیر پا اثر کا ذریعہ ایک کامیا ب اُستاد کی شخصیت ہی ہوتی ہے۔ان امور کے علاوہ حقیقت شناسی ،نئے تجربات کو کھلے ذہن سے قبول کر نا ،نئے تجربات و رجحانات اور اطلاعات کے ذریعے طلبہ کےتعلقات میں ہم آہنگی ،اخلاقی اقدار پر منحصر رویے کے ذریعے طلبہ کی کردار سازی اہم ہے۔

اساتذہ کا شمار قوم کے سب سے زیادہ ذہین اور باشعور طبقے میں ہوتا ہے اساتذہ کے فرائض منصبی میں تعمیر قوم ،کردار سازی ،ترکیہ نفس ،قیادت کی تیاری ،قیادت کو اعلی نظریات سے متصف کرنا ،حق و باطل ،جائز و نا جائز اور حلال و حرام کا شعور بیدار کر نا بھی شامل ہیں۔زندہ قومیں اپنا نظام تعلیم اپنے عقائد ،افکار اور اپنی تہذیب و کلچر کی روشنی میں تر تیب دیتی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ و علیہ و سلم کوبنی نوع انسان کے لئے رہبر ،ہادی ،رہنما اور معلّم اعظم بنا کر بھیجا گیا۔دنیا میں آپ کی بعثت کا مقصد علم و حکمت کی تعلیم و اشاعت تھا۔آپ کو علم و حکمت کی تعلیم خود رب ذوالجلال نے دی اور تمام انسانیت کے لئے معلّم بنایا۔آپ کی حیات مبارکہ زندگی کے ہر شعبے میں اعلیٰ اور رہنماہے اسی لئے قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے :

"لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوہ حسنہ، لمن کان یرجو اللہ
والیوم الآخر"[۶]

"ترجمہ:بے شک تمھارے لیے اللہ کے رسول(ﷺ) میں بہترین نمونہ ہے،
یہ اس(شخص)کے لیے ہے جو اللہ سے ملاقات کا متمنی ہے اور آخرت کے دن کا"

سیرت طیبہ ﷺ کے مطالعے سے ایسے اوصاف کا ہم کو پتہ چلتاہے جس کے ذریعے ایک کامیاب ، مثالی اور متناسب اُستاد کا وجود ابھر کر سامنے آتاہے جوسیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں طلبہ کی علمی تشنگی کو دور کرنے کا سامان فراہم کر تا ہے۔ سیرت رسول ﷺ کے مطالعے سے یہ خوش گوار انکشاف ہو تا ہے کہ یہ سب کے سب رسول ﷺ کے نظریہ تعلیم و تعلّم کے خوشہ چیں ہیں۔اکتسابِ عمل میں اُستاد کا نرم و شیریں لہجہ اور مشفق رویہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔نبی کریم ﷺ جب بھی تکلّم فرماتے تو آپ ﷺ کا لہجہ نہایت ہی شیریں اور ملائم ہو تا اور آپ ﷺ کی تعلیم سامعین کی دلوں پر براہ راست اثر کرتی تھی۔ آج کا سائنسی طریقہ تعلیم بھی اسی بصیرت افروز نکتہ کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ ایک معلّم مشکل سے آسان کی طرف پیش قدمی کرے۔

ایک کامیاب اور مثالی اُستاد کے لئے لازمی ہے کہ وہ زبان کی فنی باریکیوں اور اس کی بنیادی مبادیات سے واقف ہو تاکہ وہ طلبہ کو فوری اکتساب کے عمل کی جانب راغب کر سکے۔یہ ایک ابدی حقیقت ہے کہ علم عمل کے بغیر بیکار ہے اعمال صالحہ کے بغیر ایمان موثر نہیں ہو تا ہے، اسی لئے ایک اُستاد کو چاہئے کہ وہ طلبہ کے سامنے عملی نمونہ پیش کریں اور جو بھی پند و نصیحت کرے اس پر پہلے خود عمل کرے تاکہ نصیحت تاثیر سے خالی نہ ہو۔

علم و عمل اور قول و فعل کا تضاد انسان کے لئے بڑی تباہی کا باعث ہو تا ہے آج دنیا اسی کی وجہ سے تخریب اور تباہی کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔انسان نے جدید علوم کے سہارے آسانوں میں پرندوں کی طرح اڑنا اور سمندروں میں مچھلیوں کی طرح تیرنا تو سیکھ لیا ہے لیکن ایک انسان کی طرح بامروّت اور اخلاقی زندگی گزارنے سے عاجز ہے۔

سیرت طیبہ ﷺ اساتذہ سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ عملی نمونہ کی اعلی مثال پیش کریں۔عفو درگزر سے کام لیں،طلبہ میں اولعزمی اور حوصلہ مندی کو پروان چڑھائیں،عجز و انکساری سے کام لیں اور اس کی تعلیم دیں،درس و تدریس کو مخصوص نہ کریں بلکہ اس کے فیوض کو عام کرے۔طلبہ میں ڈر ،خوف اور گھٹن کی کیفیت کا سد باب کریں۔طلبہ کے سوالات کے اطمینان بخش جواب دیں۔سیرت طیبہ ﷺ کے ان معلّمانہ اوصاف حمیدہ سے اساتذہ متصف ہو کر نہ صرف اپنے فن میں کمال پیدا کر سکتے ہیں بلکہ مجروح انسانیت کے غموں کا مداوا بھی کر سکتے ہیں۔

اساتذہ طالب علموں کے لیے نمونہ ہوتے ہیں لیکن ہر اُستاد طالب علموں کے لیے مثالی نہیں ہو سکتا۔ ایک طالب علم کی نظر میں بعض اساتذہ کی مثبت تصویر ہوتی ہے اور بعض کی منفی۔ ایک اچھے اُستاد کو پڑھانے کا شوق ہوتا ہے اسے ناصرف اپنی بات کی سمجھ ہوتی ہے بلکہ اپنی بات کو سمجھانا بھی جانتا ہے۔ایک اُستاد کی تربیت طالب علم کی زندگی کی تبدیلی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ہر کامیاب شخص کے پیچھے بالعموم کسی اُستاد کا ہاتھ ہوتا ہے جتنے بھی کامیاب لوگ ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی سے متاثر ضرور ہوتے ہیں ۔ انسان پر کسی کی اتنی نصیحتیں اثر نہیں کرتیں جتنا رویہ اثر کرتا ہے۔ تاریخ میں بڑی بڑی تبدیلیاں اساتذہ کی وجہ سے آئی ہیں یہ ان کے کردار ہی تھے جو تبدیلیوں کے باعث بنے۔ ایک متاثر کن شخصیت میں اخلاقیات ، برداشت علم ، اپنے مضامین پر عبور ہوتا ہے، اس کو انسانی نفسیات کا اور انتھرا پالوجی کا علم ہوتا ہے،وہ انسانی مزاج سے واقف ہوتا ہے،اسے علم ہوتا ہے کہ کن طالب علموں کو دیکھنے سے سمجھ آتی ہے کن کو سننے سے سمجھ آتی ہے اور کن کو محسوس کرنے سے سمجھ آتی ہے۔ اس کی شخصیت سے لوگوں کو فائدہ ملتا ہے ۔

ایک اُستاد معاشرے کے لیے نمونہ (Roll Model) ہوتا ہے اپنے طلبہ کے لیے تو ضرور، کیوں کہ جو ذہن سازی ایک اُستاد کر سکتا ہے وہ کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔ اُستاد کو باقاعدہ طور پر ایک لیڈر کی حیثیت سے خود کو منوانا پڑتا ہے کیوں کہ معاشرہ کی اونچ نیچ اور اتار چڑھاؤ کو وہ دوسرے لوگوں سے اُستاد بہتر طریقے سے جانتا ہے اور پھر وہ اپنے طلبہ کی تربیت اسی انداز میں کرتا ہے۔ ایک اُستاد اگر واقعی خود کو ایک قائد کی حیثیت سے منوانا چاہتا ہے تو اس کیلئے چند مخصوص چیزوں پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جو بچہ آپ کے پاس پڑھنے کے لیے آیا ہے قرآن وحدیث کے مطابق اس کی تربیت کریں یہ آپ کی منزل ہے۔

دوسری بات یہ کہ ہر کلاس میں ایسے بچے ضرور ہو ں گے جو اتنے پڑھنے والے نہیں ہوں گے ، کچھ ایسے ہوں گے جن کے گھر کا ماحول ایسا نہیں ہو گا ، کچھ کو غصہ بہت آتا ہو گا۔ان سب کو ساتھ لے کر چلنا ایک استاد کی اعلیٰ خوبی ہے۔ اگر استاد میں اس طرح کی خصوصیات نہیں ہو نگی تو گویا وہ اعلیٰ درجہ کی صفات سے خالی ہے۔

ایک بڑی اہم بات جو ایک مثالی استاد میں ہونا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ استاد کو ہمیشہ شفقت، مہربانی اور رحمدلی کے جذبات سے آراستہ ہونا چاہئے۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ کو جب ہم بطور معلم کے دیکھتے ہیں تو سب سے بڑی خوبی یہی نظر آتی ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر موقع پر رحمدلی کے جذبات کا نمونہ ہیں۔ آپ کی زندگی رحمدلی کے جذبات سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ ہماری عملی زندگی میں بھی ایک استاد کی مثالی خصوصیات میں سے اہم صفت رحمدلی ہی ہے۔ ہم اپنے مشرقی معاشرے اور مغربی تمدن کا جب موازنہ کرتے ہیں تو بڑا فرق اسی خوبی کا نظر آتا ہے کیونکہ اساتذہ کا شمار معاشرے کے اس طبقے میں ہوتا ہے جو زمانے کی قدروں کو بدل دینے کی قدرت رکھتے ہیں اور ہمیشہ زمین کی پستیوں سے اٹھا کر اپنی قوم اور معاشرے کو آسمان کی بلندیوں سے روشناس کرا دیتے ہیں کیونکہ وہ قوت عشق سے دہر میں تبدیلی کے گُر جانتے ہیں۔ آج ہم اپنے معاشرے کو مغربی معاشرے سے کمتر جانتے ہیں کیونکہ آج کے معلمین اپنی تحقیق و ترقی کو مغربی آئینے میں دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس خرابی کی وجہ اپنی مسلم معاشرت اور تہذیب سے دوری ہے لیکن اگر آج بھی رویوں میں تبدیلی آجائے تو معاشرہ بھی تبدیل ہو جائے گا۔ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ استاد آج بھی تبدیلی کا باعث بن سکتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے اور معاشی ضرورتوں کی وجہ سے معلم ایک عام شہری کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جو کہ معاشرے کی بُری قدروں کی نشاندہی ہے۔ اگر آج بھی ہم تبدیلی چاہتے ہیں تو ان صفات کو اپنانا ہو گا۔

ایک خوبی متعین شدہ راستے پر چلنا ہے۔ زندگی میں جو کرنا ہے اس کی پہلے منصوبہ بندی کریں اگر آپ چاہتے ہیں تو اسے آج ہی لکھ لیں۔ اگر آپ نے دس سال بعد کوئی چیز حاصل کرنی ہے تو اس کی منصوبہ بندی ہونی چاہیے ورنہ یہ دس سال ضائع ہو جائیں گے ۔ آپ دنیا میں چلے جائیں اس سے بڑی خوبصورتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ پانچ بار کہا جاتا ہے ”فلاح کی طرف آؤ“ آپ کا تو راستہ ہی کامیابی کا راستہ ہے ۔ ایک خوبی انسان کی خودداری ہے۔ خودداری کا مطلب ہے کہ کسی کا محتا ج نہ ہونا، آزاد ہونا ،ویسے تو انسان اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے لیکن سوائے اللہ کے کسی کے سامنے اپنی حاجت روائی کی ضرورت محسوس نہ کرے۔

ایک اُستاد دراصل جوہر تراش ہے جو کسی پتھر کی اوٹ میں چھپا ہوا نگینہ پہچان سکتا ہے اور کسی سیپ میں چھپا ہوا موتی۔ اگر واقعتاً اس میں قائدانہ خصوصیات پائی جائیں تو کچھ مشکل نہیں کہ ایک سنجیدہ اور مضبوط

قوم ابھر کر سامنے آجائے۔ یہ اُستاد کا ہی فیضان نظر ہوتا ہے کہ مکتب کی کرامت جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اسی لئے علامہ اقبال نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ

یہ فیضان نظر تھا کہ مکتب کی کرامت تھی

سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

(۷)

یہ ایک کامل اُستاد کا ہنر ہے کہ اپنے شاگردوں میں چھپی ہوئی خوبیاں تلاش کرے اور پھر اپنی محنت سے اس ہنر کو اجاگر کرے جو کہ اس کے طلبہ میں پوشیدہ ہوں۔ اُستاد میں قیادت کا جذبہ ہو تو سب سے پہلے اس کے نقش قدم پر چلنے والے اس کے طلبہ ہوتے ہیں جو اپنے اُستاد کے تمام افعال کو لباس کی طرح اوڑھنے میں بھی دقت محسوس نہیں کرتے ہیں مگر اُستاد پر لازم ہے کہ وہ اپنے سامنے موجود طلبہ کی ذہنی استعداد کو مد نظر رکھتے ہوئے محنت کرے اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے ہوئے اپنے طلبہ میں اپنے ہنر بھر دے۔

اُستاد اس کائنات کا سب سے عظیم شخص، اس روئے زمین کی سب سے بلند ہستی اور ہماری زندگی کا سب سے اہم جزو ہے۔ اس دنیا میں جتنے بھی لوگ خوبصورت طریقے سے اپنی ذمہ داری نبھا رہے ہیں، وہ صرف ایک اُستاد کی تربیت کا ہی نتیجہ ہیں۔ والدین بچے کو جنم دیتے ہیں، پرورش کرتے ہیں مگر اس کے کردار اور اس کی ذات کی تعمیر میں اُستاد ہی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انسان چونکہ اشرف المخلوق ہے اسے دوسری تمام کائنات پر فوقیت حاصل ہے اور اس فوقیت کی بنیادی وجہ اس کی سمجھ اور شعور ہے، انسان جب بھی گمراہی کی دلدل میں پھنسنے لگتا ہے تو وہ شعور اور آگاہی کی مدد سے ہی زوال سے نکل کر بلندی کا سفر طے کر لیتا ہے۔انسان کو اس کی ذات سے آگہی ایک اُستاد ہی کراتا ہے۔ خدا کی ذات کا انکشاف بھی اُستاد ہی کراتا ہے۔ ایک بہترین اُستاد وہی ہوتا ہے جو صرف کتابوں کا علم ہی نہیں دیتا ہے بلکہ کردار سازی اور شخصیت سازی بھی اسی کی ذمے داری ہے۔کیونکہ ایک معلم اور استاد ہی معاشرے کی ترقی کا ضامن ہے۔ جیسے جیسے معاشرہ ترقی کرے گا ویسے ویسے ایک استاد کا درجہ بھی برتر ہوتا جائے گا کیونکہ حیاتِ انسانی اور بقائے انسانی کا سبق استاد ہی کے ذمہ ہے۔

ملک اشفاق نے اپنی کتاب ''ارسطو، حیات، فلسفہ اور نظریات'' میں بچے کی خوبیوں اور خامیوں کو جانچنے کے بارے میں ارسطو کا قول یوں نقل کیا ہے کہ:

''ارسطو انسانی خوبی پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جیسے دو بچے ہوں اور دونوں قصور وار ہوں تو ان کے درمیان ایسا معاملہ ہو کہ ان میں اصل خرابی کی وجہ کون ہے تو پھر خوبیوں کے متعلق وضع کیے گئے اصولوں کو اپنانا ہو گا اور اس بات کو اس اصول سے ثابت کرنا ہو گا۔۔۔ ایک اعلیٰ خوبی ہے اور بزدلی خوبی نہیں ہے۔ خود اعتمادی اور آزادی بھی خوبیوں میں شمار ہوتی ہے۔ تشدد ایک برائی ہے۔ انسان دوستی بھی اعلیٰ خوبی کا درجہ رکھتی ہیے۔ ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک بچے کو اعلیٰ خوبیوں کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔''(۸)

اس دنیا میں عظمت کی جتنی داستانیں ملتی ہیں وہ ایک استاد ہی کی بدولت ہیں۔ عظیم لوگ استاد کی عظمت کا ہی نتیجہ ہیں، کسی نے اگر خاک سے اٹھ کر آسمان کی بلندیوں پر پرواز کی ہے، تو یہ ایک استاد کی راہنمائی اور حوصلہ افزائی سے ہی ممکن ہوا ہے۔ کوئی بھی قوم اور معاشرہ تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ استاد ہی قوم کے معمار ہیں اور وہی قوم کی ترقی میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

قومیں جب بھی عروج حاصل کرتی ہیں، تو اپنے اُستاد کی تکریم کی بدولت ہی کرتی ہیں۔ اُستاد کی اہمیت اور ان کا مقام و مرتبے کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے، کہ وہ ہماری شخصیت سازی اور کردار سازی میں معاون و مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔ ایک اُستاد کسی انسان کے اندر اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایسی تبدیلیاں رونما کر سکتا ہے کہ وہ سب تبدیلیاں اس انسان کے لیے فطری حیثیت اختیار کر جائیں۔ ایک نسل کے خصائل تبدیل کرنے کا مطلب ایک قوم کا رخ بدلنے کے برابر ہے کیوں کہ آنے والی نسلوں میں بالعموم وہی اوصاف پیدائشی واقع ہوتے ہیں ہاں لیکن بہت کچھ ایسا ہے جو جو ہم اپنی عادات کے ساتھ ہی چلاتے ہیں۔ ملک اشفاق اپنی تصنیف ''ارسطو، حیات، فلسفہ اور نظریات'' میں اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہیں:

''اخلاقی فضائل عادات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ اس کے معنی خلقی نہیں ہوتے کہ یہ اوصاف قدرت ہمارے ساتھ پیدا کرتی ہے کیوں کہ عادات کسی قدرتی وصف کو بدل نہیں سکتی مثلاً پتھر قدرتاً زمین پر گرتا ہے۔۔۔ عقل دیدہ و دانستہ ایک سوچ

ہوئے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔اس لیے ظاہر ہے کہ اس قسم کے
افعال کسی ایسی شے کے لیے ہونے چاہییں جو اچھی ہو کیوں کہ عقل ہمیشہ عمدہ غایتوں
کے حصول کو مقصد بناتی ہے۔"(۹)

اُستاد علم کے حصول کا براہ راست ایک ذریعہ ہے، اس لیے ان کی تکریم اور ان کے احترام کا حکم دیا گیا ہے۔اُستاد کا احترام اسلامی نقطہ نظر سے دو اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے :

۱۔ ایک تو وہ منبع علم ہونے کے ناتے ہمارے روحانی باپ ہوتے ہیں۔ ہماری اخلاقی اور روحانی اصلاح کے لئے اپنی زندگی وقف کردیتے ہیں

۲۔ اسلامی تعلیم میں اُستاد کی تکریم کا جا بجا حکم ملتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کہنا "انما بعثت معلّما" کہ مجھے ایک معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے اس بات کی بیّن اور واضح دلیل ہے کہ اُستاد کا مقام و مرتبہ نہایت بلند و بالا ہے۔

یہ اُستاد ہی ہوتا ہے جو طالب علم کو زندگی کا سلیقہ سکھاتا ہے، سوچ اور فکر کی راہیں متعین کرواتا ہے، ساتھ ہی ساتھ خود پر یقین اور اعتماد کرنا بھی سکھاتا ہے، کائنات کی گتھیاں سلجھانے کے گُر بھی وہی بتاتا ہے۔ محبتوں کے ساتھ پہلا سبق اس وقت پڑھاتا ہے، جب ایک بچہ خالی صفحہ کی طرح کورا ہوتا ہے۔ اپنی ساری صلاحیتیں اپنے طالب علم پر صرف کر کے اس کی ذات کی مثبت تعمیر کرتا ہے۔ اسے اس کی ذات سے آگہی فراہم کراتا ہے۔ اس کی شناخت اس پر واضح کرتا ہے، اور یہ احساس دلاتا ہے کہ تم کیا ہو؟ کس مقصد کے تحت اس دنیا میں آئے ہو؟ اور تمہیں معاشرے میں کیا کردار نبھانا ہے؟

تدریس کے لیے سب سے پہلی شرط کتاب ہے۔ جو علم بھی آپ متعلم تک پہنچانا چاہتے ہیں، اس کتاب یا نصاب سے اُستاد کی گہری وابستگی اور واقفیت ضروری ہے۔ اچھے اُستاد کی ایک اہم صفت غور و فکر ہے۔ اُستاد کے لیے استقامت و استحکام کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اچھے اُستاد کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ وقت کا بہترین استعمال کرتا ہے۔اچھا اُستاد مردم شناس بھی ہوتا ہے، وہ شخصیت کی نشوونما میں رکاوٹیں پیدا نہیں کرتا اور منفی فکر کا حامل نہیں ہوتا۔اُستاد خود اعتمادی کو کامیابی کی کنجی سمجھتا ہے۔ خود اعتماد اُستاد ہی طلبہ میں سوال کرنے کی جرأت پیدا کر سکتا ہے۔ اچھا اُستاد ہمیشہ اچھا طالب علم رہتا ہے وہ ہمیشہ نئے علم اور نئی روشنی کو اپنانے والا ہوتا ہے۔

ایسا علم جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے در حقیقت ایک صدقہ جاریہ کی حیثیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ علم حاصل کرنا ایک مکمل عبادت ہے تو یہ بھی ماننا لازم ہو گا کہ حصول علم کے سفر میں دیگر عبادات کی طرح یہاں بھی خاموشی اختیار کرتے ہوئے اکتساب کرنا ضروری ہے۔ دوران عبادت بھوک پیاس، دھوپ چھاؤں اور دن رات کا امتیاز بھول کر جہاں سے ممکن ہو اس عبادت کو مکمل کیا جانا ہی اس کی حقیقت ہے۔ پروفیسر اکرام احسان اپنی کتاب ''محبتوں کے سلسلے'' میں اس بارے میں یوں گویا ہیں کہ:

> ''علم کا حصول عبادت ہے، عبادت میں خاموش رہنا پڑتا ہے۔ خاموشی سے علم حاصل کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ وقت کم صرف ہوتا ہے۔
> علم اور بھوک کا گہرا رشتہ ہے۔۔۔۔
> عموماً وہ طالب علم زیادہ نمبر لے کر کامیاب ہوتے ہیں جو کئی کئی گھنٹہ بھوک پر قابو پا کر علم حاصل کرتے ہیں۔ بھوک کی وجہ سے نیند بھی کم آتی ہے۔ دل، دماغ عام طور پر آرام محسوس کرتے ہیں''(۱۰)

ہم تب ہی ترقّی کر سکتے ہیں، جب معاشرے میں اساتذہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے، ورنہ یوں ہی جگہ جگہ خوار ہوتے رہیں گے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہمیشہ وہی طالب علم اپنی منزلِ مقصود پر پہنچے ہیں، جنہوں نے اُستاد کی عزت کی۔ مولانا الطاف حُسین حالی نے اساتذہ کی عظمت کے اعتراف میں کیا خُوب کہا ہے کہ:

ماں باپ اور اُستاد سب ہیں خدا کی رحمت
ہے روک ٹوک اُن کی، حق میں تمہارے نعمت (۱۱)

ب) منتخب ناولوں کے کرداروں کا تجزیہ

i۔ پروفیسر سہیل بطور قائد (راجہ گدھ)

اس کائنات میں اللہ تعالی نے جتنے بھی انبیاء علیہ السلام کو بھیجا وہ سب کے سب معلّم تھے۔ معلّم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اللہ تعالی کے پیغمبر بھی تھے یوں انہوں نے اللہ تعالی کی تعلیمات کو اس کے بندوں تک پہچانے کے لیے بہت سی تکالیف بھی برداشت کیں۔ تمام انبیاء علیہ السلام نے توحید کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ باقی احکامات کو بھی امت تک پہنچایا۔ معلّم کا پیشہ انبیاءؑ والا پیشہ ہے یہ ایک ایسا مقدس پیشہ ہے کہ اس پر اللہ

تعالی کی خاص رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ یہ پیشہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کے بعد آج کے موجودہ دور میں بھی موجود ہے پوری دنیا میں اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اسلام میں اس کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جو لوگ اپنی روایات واقدار اور پس منظر سے کنارہ کر بیٹھتے ہیں وہ لوگ ناکامیوں اور گمنامیوں کی دلدلوں میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ اور ہم سوچوں کے دائرے وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جائیں تو ہم اپنی تہذیب کے کناروں تک جا پہنچتے ہیں جہاں پر ہمیں لاشعوری طور پر سکھایا جارہا ہوتا ہے کہ بڑوں کا احترام ہم پر واجب ہے، چھوٹوں پر رحم کرنا ضروری ہے، عورت کالحاظ ضروری ہے، راستے سے رکاوٹ ہٹانا ضروری ہے، اساتذہ کا ادب ضروری ہے۔ وہ اقوام___ جو اپنی تہذیب کو اہمیت نہیں دیتیں___ کبھی ترقی و کامیابی کے زینے طے نہیں کر سکتیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس بارے میں خوب لکھتے ہیں کہ:

”وہ تہذیب جو تغیر سے نا آشنا ہو، تاریخ سے بھی نا آشنا رہتی ہے، مگر تاریخ صرف واقعات کا ڈھیر نہیں بلکہ ان کے پیچھے ایک ایسے تناظر کا ہونا بھی لازمی ہے جس کی نسبت سے ان کی پہچان ہو سکے“ (۱۲)

ہماری زندگیوں میں لگاتار رونما ہونے والی تبدیلیوں میں بھی کسی اُستاد کا ہاتھ ہوتا ہے وہ چاہے باقاعدہ اُستاد ہو یا پھر ہمیں غیر محسوس انداز میں معاشرہ ہی سکھا رہا ہو۔ بالعموم ہم اپنے اساتذہ سے بہت کچھ اخذ کرتے ہیں جیسے کہ زیر بحث ناول (راجہ گدھ) کے حوالے سے پروفیسر سہیل عمرانیات کی کلاس میں جاتا ہے اور اپنے طلبہ کے لیے ایک راہنما کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ کردار کی تعمیر کے لیے معلّم سمعی اور بصری دونوں صورتوں کو استعمال میں لاتا ہے معلّم کا سب سے بڑا منصب تدریس ہے کیوں کہ اسے کتاب کی علمی تشریح اور حکمت سکھانا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے طالب علموں کے ساتھ گھل مل کر ان کے ذاتی مسائل کو بہتر طریقے سے حل کرتا ہے۔ ایک اُستاد اور شاگرد کے درمیان جب اچھی بے تکلفی ہو جاتی ہے تو سیکھنے اور سیکھانے کا عمل اور تیز ہو جاتا ہے۔ پروفیسر سہیل اور قیوم کے درمیان بے تکلفی ہو جاتی ہے اور قیوم اپنے دل و دماغ کے تمام پرت کھول کر اپنے اُستاد پروفیسر سہیل کے سامنے رکھ دیتا ہے اور پروفیسر سہیل چابکدستی سے راہنما کا کردار ادا کرتے ہوئے اپنے طالب علم کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بانو قدسیہ نے پروفیسر سہیل سے روایتی اُستاد کے ساتھ ساتھ راہنما اُستاد کا کردار بھی بخوبی سرانجام کروایا ہے۔ بانو قدسیہ کا کرداروں کو صحیح جگہ پر مکمل خوبیوں کے ساتھ استعمال کرنا ہی انہیں دوسرے ناول

نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ انہوں نے پروفیسر سہیل سے ایک رہنما اُستاد کا کردار بڑی خوبی کے ساتھ ادا کروایا ہے۔ قیوم ریڈیو اسٹیشن پر انٹرویو دینے کے بعد میں سیدھا یونیورسٹی پروفیسر سہیل کے پاس چلا جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ جس وقت پروفیسر سہیل اپنی کلاس سے فارغ ہو کر باہر نکلے گا تو کچھ دیر کے لیے ہم کیفے ٹیریا میں بیٹھیں گے۔ وہاں ہماری باتیں بالکل زمینی ہوتی ہیں۔ پروفیسر قیوم سے پوچھتا ہے کہ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یونیورسٹی میں ہوں۔ تو قیوم کہتا ہے کہ کالج سے پتہ کر لیا تھا۔ اس پر پروفیسر سہیل کہتا ہے کہ مَیں نے تو ملنے سے منع کیا تھا! لیکن چوں کہ قیوم کی پروفیسر سہیل کے ساتھ بے تکلفی ہو گئی تھی جو دوستوں میں ہوتی ہے تو قیوم اپنے انٹرویو کے بارے میں سب سے پہلے پروفیسر سہیل کو بتانا چاہتا ہے۔ اس پر انٹرویو کے بارے میں باتیں شروع ہو جاتی ہیں اور پروفیسر ایک راہنما کی طرح قیوم کو راہنمائی دیتے ہیں۔ قیوم اپنی زندگی میں بہت پریشان ہوتا ہے اور پروفیسر سہیل اس بات سے بخوبی واقف ہے اور قیوم یہ سب باتیں پروفیسر سہیل کو بتانے کے بعد پُرسکون ہو جاتا ہے اور پروفیسر سہیل باتیں سننے کے بعد اس کی تشفی یوں کرتے ہیں:

> " اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ہم نہر کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے دور نکل گئے پاپولر کے درخت نہر کے ساکن گدلے پانیوں میں پڑ رہے تھے بڑی خاموشی تھی کبھی کبھار کوئی کار ادھر سے گزر جاتی ہے تو اچانک متمدن دنیا کا خیال آتا۔۔۔ جھولی میں وسعت ہوتی۔ میں نے ایک ایک کر کے سیمی کی کتاب کے تمام صفحے اس کے سامنے پڑھ ڈالے۔
>
> " یوگا کرتے ہو باقاعدگی سے؟"" (۱۴)

پروفیسر سہیل، قیوم کے تمام حالات جان لینے کے بعد مکمل قائدانہ صلاحیتوں سے لیس ہو کر سامنے آتے ہیں اور اس کے مسائل کو بذریعہ "یوگا" ختم کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ قیوم کو اب یوگا سے بھی فائدہ نہیں مل رہا ہوتا کیونکہ وہ مکمل طور پر مایوس ہو چکا ہے۔ پروفیسر سہیل اب پھر سے یوگا کرنے کا مشورہ دیتے ہیں کہتے ہیں یہ یوگا کی کئی قسمیں ہوتی ہیں تم یوگا بدل لو اور اسے مسلسل کرتے رہو ضرور ٹھیک ہو جاؤ گے اور کہتے ہیں کہ یوگا کرتے رہتے تو اب تک تمہاری حالت بدل چکی ہوتی۔ پروفیسر سہیل نے یوگا کرتے رہنے سے خیالات سے پیچھا چھوٹ جانے کا بولا اور پھر یوگا کے فائدے گنوائے۔ کرم یوگا تمام تر تیاگ ہے اس میں اپنے کسی فعل کا مثبت یا منفی اثر طبیعت پر نہیں پڑتا۔ شاید اس سطح پر تمہارے لیے یہ تسلی بخش نہ ہو۔ اس کے بعد پھر ہاتھا یوگا کے متعلق بتانے لگ جاتے ہیں۔ ہاتھا یوگا روایتی طریقہ ہے اس پر عمل کر کے انسان اپنے

reflexes پر قابو پالیتا ہے۔ دل کا بند کرنا انتڑیوں کا ہلنا، سانس کا کنٹرول جب انسان کے بس میں ہو جاتا ہے تو اس کے ثمرات بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر ایسے یوگی کو سمادھی کی حالت میں زندہ دفن بھی کر دیا جائے تو ذہن کو جسم پر سبقت حاصل ہوتی ہے۔ اس پر چونک کر قیوم کہتا ہے کہ سر جادو گری والی باتیں نہ کریں، مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیے۔

پروفیسر سہیل قیوم کا جواب سننے کے بعد اک نئے روپ میں سامنے آتے ہیں اور اسے تنترا کرنے کا کہتے ہیں۔ اس پر قیوم نے لمحہ بھر کو اس کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ کس کے ساتھ؟ اب پھر یہاں پروفیسر کا منفرد انداز دیکھا جا سکتا ہے وہ کہتے ہیں کہ کوئی ایسی عورت تلاش کرو جو تمہارے ساتھ تنترا یوگا کرنے کو تیار ہو۔ شادی شدہ ہو اور تم سے دائمی تعلق کی آرزومند ہو۔ ایسی عورت کی تلاش اب قیوم کے لیے کافی مشکل تھی لیکن وہ کہتا ہے کہ جو عورت اس کے ساتھ تنترا کر سکتی تھی وہ مر چکی ہے۔

پروفیسر سہیل ایک راہنما کی طرح اس کے لیے نئے نئے راستے کھول کر اس کے سامنے رکھ رہے تھے تاکہ اس کی زندگی کی مشکلات کو ختم کیا جا سکے اور جینے کا حوصلہ پیدا کیا جا سکے۔ وہ قیوم کو کہتے ہیں کہ دراصل تمہیں اس وقت شکتی کی ضرورت ہے جو تم میں امید کو زندہ کرے، جستجو میں اگر امید کا عنصر شامل نہ ہو تو انسان کسی مثبت نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ اور تنترا یوگا میں سادھکا میں اس قدر امید پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کبھی کبھی موت پر بھی حاوی ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد تنترا کے متعلق غلط فہمیوں کے بارے میں بھی آگاہ کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یوگا کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں ہیں، لیکن جو پرانے سیانے تھے وہ جانتے تھے کہ انسانی ارتقاء ہمیشہ polarities سے پیدا ہوتا ہے۔ شوجی مہاراج اور شکتی کے میل سے کائنات وجود میں آئی ہے۔ پرانے آریائی لوگ اور تبت کے باسی تنترا یوگا سے وہ طاقت حاصل کرتے تھے elan vital کہنا چاہیئے۔ اگر مرد جسمانی سنجوگ کے وقت اپنے اوپر مکمل کنٹرول رکھے تو عورت کی شکتی کو اپنے اندر ضبط کر سکتا ہے جیسے پانی اونچی سطح سے نیچے کی سطح کی طرف اس وقت تک بہتا رہتا ہے جب تک دونوں پانیوں کی سطح برابر نہ ہو جائے۔ مرد اور عورت کے جسمانی سنجوگ کا بھی یہی حال ہے قوت دونوں میں سے اس وقت تک release ہوتی ہے جب تک دونوں کی سطح برابر نہ ہو جائے۔ لیکن قیوم کو عورت کے ساتھ کسی قسم کے سنجوگ کی آرزو نہ تھی وہ اب سمجھنے لگا تھا کہ عورت کا وجود سوائے الجھاؤ کے اور کچھ نہیں دے سکتا۔ قیوم کی زندگی معاشرے کی رونقوں سے عاری ہو چکی تھی۔ وہ معاشرے کے جبر اور بے حسی کے سامنے اپنے ہتھیار گرا چکا تھا اور اسے یقین ہے کہ اس کی زندگی اس کے لئے سکون کے کوئی لوازم بھی مہیا نہیں کر سکتی۔ لہٰذا قیوم کو عورتوں سے

کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا وہ اب سکون کی تلاش میں تھا اور پروفیسر سہیل نے قیوم کی رہنمائی ایک راہنما کی طرح کی ہے اسے تمام باتیں سمجھانے کے بعد زندگی کو خوب صورت بنانے کے بارے میں بتاتا ہے کہ:

> ”دو طرح سے آدمی کی روح آزاد ہو سکتی ہے وہ مکمل طور پر تیاگ کرے یا مکمل طور پر اپنی حسیات میں ڈوب کر آزادی حاصل کرے۔ رنگ، خوشبو، ذائقہ، لمس، آواز سب تمہاری آزادی کا باعث ہو سکتے ہیں۔“(۱۴)

بانو قدسیہ نے اُستاد اور شاگرد کے درمیان تعلقات کو انتہائی مضبوط کر دیا ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے اُستاد اور شاگرد کے درمیان جتنی زیادہ انسیت ہوگی اتنا ہی ماحول خوشگوار ہو گا ادب والا، عزت و تکریم والا رشتہ ہو گا تو سیکھنے سکھانے کے عمل میں اتنی ہی تیزی سے بہتری اور مثبت اثرات ہوں گے۔ پروفیسر سہیل کی اپنے طالب علم سے جب دوبارہ ملاقات ہوتی ہے تو وہ پھر اس سے یوگا کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ کیا تم باقاعدگی سے یوگا کرتے ہو اس کے نفی میں سر ہلانے پر پروفیسر سہیل ایک قائد کی طرح سامنے آتے ہیں اور مشفق دوست کی طرح اپنے شاگرد کے ساتھ چائے پیتے ہیں اور پھر باتوں ہی باتوں میں اپنے لیکچر کا آغاز کرتے ہیں اپنے طالب علم کی زندگی کو بہتر بنانے کی تگ و دو میں مصروف ہو جاتے ہیں قیوم کی توجہ قائم کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں زندگی میں کوئی مشن بنانے کے لیے انبیاء کی مثال دیتے ہیں اور کامیاب لوگوں کی۔

زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہمیں منزل کا تعین کرنا پڑتا ہے جب ہمیں اپنی منزل کا پتہ ہو تو ہم اس منزل تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں، ثابت قدمی سے منزل کے حصول میں آسانی ہوتی ہے پروفیسر سہیل اپنے شاگرد کی توجہ اسی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

اچانک ریڈیو سٹیشن میں ملاقات ہونے پر پروفیسر سہیل قیوم کے ساتھ مسکراہٹ کے تبادلے کے بعد اس کی شخصیت کو درست سمت دینے کے لئے کوشاں ہو جاتے ہیں۔ اس سے پوچھتے ہیں کی تم یہاں کیا کرتے ہو؟ قیوم بتاتا ہے کہ وہ ریڈیو سٹیشن میں ملازم ہے۔ قیوم جب اپنے اُستاد کو وہاں اپنے آفس میں دیکھتا ہے تو چائے کے لیے چپڑاسی سے کہتا ہے۔ اُستاد شاگرد میں باتیں شروع ہوتی ہیں تو پروفیسر سہیل ایک قائد کی طرح سب سے پہلے قیوم کی زندگی کے سب سے بڑے مسئلے سے بات شروع کرتا ہے۔ اپنے شاگرد سے پوچھتا ہے کہ السر کا کیا حال ہے؟ ٹھیک ہو گیا کہ ابھی تک anxiety کے شکار ہو؟ قیوم بتاتا ہے کہ ابھی تک تو ویسا ہی ہے۔ اس پر پروفیسر سہیل کہتا ہے کہ تم نے میرے خیال سے ٹھیک طرح سے یوگا نہیں کیا ورنہ افاقہ

ہو تا۔اس پر قیوم کہتا ہے کہ میں اپنی کوئی سمت نہیں مقرر کر سکا۔اور بتا تا ہے کہ میں آج کل ٹی ایم کر تا ہوں۔اسے بہت آرام ملتا ہے۔ Meditation سے سکون ہو تا ہے۔اسی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے وہ اپنے اندر کی باتیں پروفیسر سہیل کو بتانے لگتا ہے کہتا ہے کہ میں اندر سے اس قدر پراگندہ ہوں کہ Concentrate نہیں کر سکتا۔دراصل مجھے خود معلوم نہیں کہ مجھے کیا چاہیے۔میں کس لئے پریشان ہوں میں ہر وقت سوچتا رہتا ہوں کہ کسی وقت غبار اترے تو میں اصلی پریشانی کو برہنہ دیکھوں۔قیوم کی باتیں سننے کے بعد پروفیسر سہیل اس کی پریشانی کو ختم کرنے کے لیے ایک قائد کے روپ میں سامنا آتا ہے۔ملاحظہ ہو:

”کوئی آدمی زیادہ دیر بے سمت ہو کر پریشان رہے تو وہ دائمی پریشان ہو جاتا ہے اگر غم، دکھ اور ہیجان کی ایک نقلی سی وجہ بھی ہو تو وہ اس پر قابو پالیتا ہے۔تم کو پتہ ہونا چاہئے کہ آخر اس پراگندگی اس anxiety اس تذبذب کی اصلی بنیادی وجہ کیا ہے؟___اگر معلوم نہیں تو ایجاد کر لو آرام میں رہو گے۔“(۱۵)

اس پر قیوم کہتا ہے کہ میں سوچتا ہوں، سوچتا رہتا ہوں، لیکن کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔اس پر پروفیسر سہیل کہتا ہے کہ میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں فری۔سہیل نے مسکرا کر کہا۔قیوم کی حیرانی میں اضافہ ہو تا ہے اور وہ پروفیسر سہیل کو کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر کہتا ہے کہ ضرور دیں سر سو مشورے دیں۔پروفیسر سہیل اپنے شاگرد کی زندگی میں بہتری کے لیے ایک قائد کی طرح اسے مشورہ دیتے ہوئے یوں کہتا ہے کہ:

”تم کو اپنے آپ کو کوئی سمت دینی ہو گی کوئی مشن بنانا پڑے گا کوئی Goal، کوئی منزل_______کبھی بحر قلزم میں، کبھی بحیرۂ عرب میں۔“(۱۶)

پروفیسر سہیل کے منہ کو تکتے ہوئے قیوم انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔قیوم کہتا ہے کہ اس قابل نہیں ہوں۔میں کوئی مشن اختیار نہیں سکتا، نو تھینک یو۔قیوم کے اندرونی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ کو ختم کرنے کے لیے پروفیسر نئے نئے حربے آزماتا ہے اور اسے کامیاب لوگوں کی باتیں بتاتا ہے۔مثلاً:

”اپنے ارد گرد دیکھ___جو لوگ زندگی میں کوئی مشن بنالیتے ہیں، چاہے چھوٹے سے چھوٹا کیوں نہ ہو، وہ السر کا شکار نہیں ہوتے___پیغمبروں کی زندگی غور سے دیکھو۔وہ بڑی سے بڑی ذاتی قربانی دے کر بھی السر کا شکار نہیں ہوتے___کوئی ٹریجڈی انہیں ہلا نہیں سکتی__بے نام جستجو، بے مصرف تلاش نہ ہو___زندگی میں ایک مشن ہو، چاہے بالکل چھوٹا مثلاً بہتر کینو کا باغ لگانا____پاکستان کے لیے نئی قسم

کی گندم بونا____پلاسٹک کی ڈوری سے قالین بُننا____کسی بچے کو سی ایس پی کرانا۔"(۱۷)

بانو قدسیہ نے کہانی کو بڑھانے کے لیے کرداروں کے درمیان جو مکالمہ کروایا ہے اس میں انھوں نے معاشرے میں ایسے مسائل کی نشاندہی کی ہے جو تقریباً ہر فرد کے ساتھ لپٹے ہوئے ہیں۔ بانو قدسیہ نے قیوم کے مسائل کو پروفیسر سہیل سے حل کروانے کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ اپنے اساتذہ کو یاد رکھنا چاہیے ان سے ملاقات کرتے رہنا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ ملاقات روز ہو سال میں دو چار دفعہ ہو جائے کم از کم۔ پروفیسر سہیل قیوم کی دیوانگی کو ختم کرنے کے لیے اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے کہانی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ پروفیسر سہیل مختلف حربے استعمال کرتا ہے کہ کسی طرح قیوم بے سمت زندگی سے نکل آئے اور کسی مقصد کے تحت زندگی گزارے۔ قیوم کو یوگا کروانے کا بھی یہی مقصد تھا لیکن قیوم یوگا پوری توجہ سے نہیں کر سکا۔ شاید اس میں دیوانگی کی جڑیں زیادہ مضبوط تھیں جنہیں یوگا بھی ہلا نہ سکا۔ پروفیسر یوگا بدلنے کا مشورہ دیتے ہیں اور وضاحت کے لیے مختلف مثالیں بھی دیتے ہیں۔ قیوم پوچھتا ہے کہ سر آپ کا کوئی مشن ہے؟ تو اس پر قیوم کو بتاتا ہے کہ میں انیسویں گریڈ کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور پھر اس کے بعد پروفیسر بننا میرا مشن ہے۔

پروفیسر سہیل کی باتیں سننے کے بعد بھی قیوم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس پر پروفیسر سہیل مزید کہتا ہے کہ کیا کبھی غریب لوگوں کو دیکھ کر تمھیں ترس آیا یا کبھی پرانے چیتھڑے جمع کرتی عورت کو دیکھ کر تمھارا دل پگھلا؟ اس کے جواب میں قیوم کہتا ہے کہ میں نے کبھی غریبی کی طرف توجہ نہیں دی اور میں تو خود بے قدری کی زندگی بسر کرتا ہوں۔ پروفیسر سہیل فنونِ لطیفہ کے بارے میں پوچھتا ہے اس پر بھی وہ کہتا ہے کہ میں آرٹسٹ نہیں ہوں۔ پروفیسر سہیل کے تمام حربے ناکام ہو جاتے ہیں پھر بھی وہ ایک قائد کی طرح ہمت نہیں ہارتا اور قیوم کی بہتری کے متعلق مزید سوچتا ہے، اس کی راہنمائی کرتا ہے، اگر اُستاد ہمت ہار جائے، تو اس کے شاگرد کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کامیاب اُستاد میں قائدانہ صلاحتیں ہوتی ہیں وہ کبھی ہمت نہیں ہارتا اور نہ اپنے طلبہ کو ہمت ہارنے دیتا ہے۔ ایک راستہ بند ہو تو ہمت نہیں ہارتا بلکہ نئے راستے کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پروفیسر سہیل نے قائد کا روپ دھار کر اپنے شاگرد قیوم کی زندگی کو ٹھیک کرنے کے لیے بہت سے حربے استعمال کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"یہ بتاؤ عشق کر سکتے ہو راہ مولا ____ لاحاصل قسم کا ____ بغیر حصول کی آرزو
کے ____ وہ تمہارا سارا وجود، سارا تخیل ساری انا کو جذب کرلے گا۔۔۔
"ہاں میں دیکھ چکا ہوں۔ اگر تم میں وہ جو ہر ہوتا تو یوگا کرنے سے ضرور
چمکتا ____ بچوں سے دلچسپی ہے؟ چھوٹے بچوں کو دیکھ کر ان کی جوتیاں سیدھی کرنے
کو دل چاہتا ہے؟"
"بھائی کے دو جڑواں بچے ہیں۔ کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔"(۱۸)

پروفیسر سہیل نے کافی ٹٹولنے کی کوشش کی کہ کسی طرح کوئی طریقہ ملے جس کے ذریعے وہ اپنے شاگرد کے اندر سے مایوسی کو ختم کرے اور اسے زندگی جینے کی راہ پر ڈال دے۔ قیوم کے ہر انکار کے بعد پروفیسر سہیل ایک نیا سوال اٹھا دیتے اور قیوم کو سوچنے پر مجبور کرتے کہ وہ ہر نئے سوال کا جواب دیتے ہوئے کوئی ایسی بات کرے جس سے اس کی اصلاح کا پہلو نمایاں طور پر نظر آئے اور اسی طرح قیوم کو شادی کا مشورہ دیتا ہے تو آگے قیوم کا جواب عجیب سی صورت حال پیدا کر دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے کبھی نہیں سوچا سنجیدگی کے ساتھ شادی کے متعلق سر میرا کیس بالکل بگڑا ہوا ہے۔ یہ کہنا تھا کہ پروفیسر سہیل کہتا ہے کہ پھر تو مشکل ہے میں سمجھتا تھا کہ شادی کرواکے تم اپنی زندگی کے منھ زور گھوڑے پر کاٹھی ڈال سکتے ہو۔ پروفیسر نے پیار سے قیوم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا قیوم! میں نے کئی سال تمہاری طرح گزارے ہیں، میرا خیال تھا کہ E.S.P پر کتابیں پڑھنے سے Telepathy Hypnosis اور Clairvoyance کے متعلق پڑھتے رہنے سے مجھے افاقہ ہوگا ۔ میں Astral travel کے پیچھے لگا رہا۔ دھرم ایمان نروان کے دروازے کھٹکھٹائے لیکن اب میری سمجھ میں ایک بات آگئی ہے۔ قیوم کی ساری کیفیات سمجھنے کے بعد اب پروفیسر اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ساری باتیں قیوم کی سمجھ میں نہیں آرہی وہ اب قیوم کو ایک نئے طریقے سے زندگی کی امید دلاتا ہے حلال و حرام کی تھیوری کے بارے میں بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ:

" پانچ کینڈل پاور کا بلب ____ لاکھ ایمپیئر بڑھا دو ہمیشہ پانچ کینڈل پاور کی روشنی دیتا
ہے۔۔۔
"وہاں چھ مہینے لیکچر دوں گا۔ امریکہ روحانی طور پر اس وقت بنجر ہے۔ پانی چاہتا ہے
میں اپنی بالٹی لے جاؤں گا۔ ایسے چھینٹے اڑاؤں گا کہ بارش کا گمان ہو گا ____ حرام و
حلال کی تھیوری بیان کروں گا سب سے ____ میرے لیے یہ بہت ہے"(۱۹)

پروفیسر سہیل نے قیوم کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ ان دونوں میں اب اُستاد شاگرد سے زیادہ دوستانہ ماحول بن چکا تھا۔ اور پروفیسر سہیل دوست بن کر بھی اپنے شاگرد کو اس کی پریشانیوں سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے وہ اسے ایک عامل کے پاس لے کر جاتا ہے۔ ارواح سے ملاقاتیں بھی کرواتا ہے۔ اپنے عشق لاحاصل کے بارے میں بھی اگاہی دیتا ہے کہانی میں سیمی شاہ ایک ایسی لڑکی ہے جو خود دیوانگی کی حدوں سے گزر چکی ہے اس کے لیے سب کچھ آفتاب ہی ہے لیکن آفتاب کو پروفیسر سہیل گمراہ کرتا ہے کیوں کہ یہ سیمی سے عشق کرتا ہے۔ قیوم بھی سیمی سے محبت کرتا ہے۔ اس کے برعکس سیمی سوائے آفتاب کے کسی کی طرف نہیں دیکھتی۔ سب پر دیوانگی چھاجاتی ہے اور وہ اپنی اپنی زندگی میں تکلیف سے دوچار ہیں۔

پروفیسر سہیل نے قیوم کی زندگی کو ٹھیک کرنے کے لیے بہت حربے آزمائے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ دونوں ایک عامل کے پاس جاتے ہیں۔ جو قبر میں بیٹھ کر اپنے وظائف کرتا ہے۔ قیوم کی اس کے ساتھ کافی ملاقاتیں ہوتی ہیں لیکن ابھی کسی منزل پر نہیں پہنچتا۔ قیوم صرف اپنی پریشانیوں کا حل چاہتا ہے۔ قیوم اس عامل کے پاس جاکر بھی صرف اور صرف اپنی پریشانیوں کا حل چاہتا ہے اس کے لیے چاہے وہ موت کا حجاب اٹھا کر ادھر کی دنیا کا رخ دکھادے۔

''راجہ گدھ'' کے اہم کردار قیوم کو کسی بات سے ڈر نہیں لگتا وہ قبر میں بھی جانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ پروفیسر سہیل نے قیوم کو کہا کہ تمہاری پریشانی کا حل کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں بھی سمجھتا تھا کہ مجھے کتابوں سے کوئی راستہ مل سکتا ہے لیکن جب تک میں سائیں جی کے ڈیرے پر نہیں پہنچا میری پریشانیوں کا حل نہیں ملا۔ یہ کہنا تھا کہ فوراً قیوم نے کہا کہ کیا اب آپ Anxiety سے آزاد ہو چکے ہیں سر؟ اس پر پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا تو قیوم نے کہا کہ پھر کیا حاصل؟ ان باتوں سے پروفیسر سہیل اب اسے موت کی طرف متوجہ کرتا ہے اور زندگی کی ناپائیداری کا بتاتے ہوئے اس میں مایوسی کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے کہتا ہے کہ:

> ''انسان کو دنیا میں ایک سب سے بڑی پریشانی ہے قیوم ____ وہ پائیدار ہونا چاہتا ہے اور موت کے ہوتے ہوئے وہ کبھی مستقل نہیں ہو سکتا۔ انسان کی ہر پریشانی کا تجزیہ کرو اصل میں پریشانی موت سے پیدا ہوتی ہے ____ آرزو کی موت راحت و خوشی۔۔۔۔ جنت وہ جنت ہے جہاں خوشیوں کو موت نہیں آرزوؤں کی مرگ

نہیں ___ موت نہ ہوتی موت کا شعور نہ ہوتا تو آدمی کبھی غم سے آشنا نہ
ہوتا ___ دیوانہ نہ ہوتا!“[۲۰]

انسان موت کے بعد زندہ رہتا ہے اور یہ حقیقت انسان پر موت کے بعد کھلتی ہے زندگی میں نوکِ قلم کے نیچے جنم لیتے نظریات عموماً پروان ضرور چڑھتے ہیں مگر کچھ زمانی قیود کا احترام قلم پر واجب رہتا ہے سوچ کے پردہ پر نقش ہر تصویر کا ایک پس منظر ہوتا ہے جو اس تصور کے نقوش گہرے کرنے میں ممدو معاون ہوتا ہے۔ بانو قدسیہ کے شعور پر ایک زمانے کے نقوش ثبت تھے جن کو انھوں نے انتہائی خوبصورتی سے احاطہ تحریر میں لا کر وقت کے آنگن میں موجود ہر کردار کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہی خصوصیت ان کو دوسرے ہم عصر ناول نگاروں سے نمایاں کرتی ہے۔

بانو قدسیہ نے ”راجہ گدھ“ میں ہارے ہوئے کمزور ذہنیت کے پسماندہ معاشروں کی عکاسی بھی خوب کی اور گزرے وقت کے ساتھ ساتھ ماڈرن ازم کی جانب گامزن اشرف المخلوقات کو بھی پہلو بہ پہلو زینت قرطاس بنایا۔ قیوم کی پسماندگی اور سیمی کی ماڈرن زندگی جو کالج کے شروع کے دنوں میں تھی کو خوب صورت انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے تمام کرداروں کو بالکل صحیح جگہ اور درست وقت پر استعمال کیا ہے۔

”راجہ گدھ“ میں انسانی زندگی کے متعدد پہلوؤں پر قلم کشائی کی گئی ہے جن میں سے کچھ نمایاں خصوصیات کسی ایک ہی کردار میں پائی جاتی ہیں۔ پروفیسر سہیل کا کردار اس ضمن میں ایک زندہ مثال کے طور پر موجود ہے جو کہ سارے منظر نامے کی نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے دکھائی دیتا ہے کہیں پر ایک باقاعدہ ماہر عمرانیات نظر آتا ہے تو کہیں اپنے طلبہ کے جذبات اور دھڑکنوں کا نباض محسوس ہوتا ہے کہیں ایک شفیق دوست کا روپ دھار لیتا ہے تو کہیں مکمل عشق کی داستان رقم کرتا ہوا کوئی مجنوں بن جاتا ہے کبھی آپ کو وہی ایک چہرہ ایک بہترین قائد کے حلیہ میں نظر آتا ہے جو کہ سامنے بیٹھے ہوئے ہر کردار کے چہرے کے تاثرات اور گفتگو سے اس کی اندرونی کیفیات کو پرکھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کا کوئی مکمل حل پیش کر سکے۔ اس بات کا اظہار دیگر کرداروں کی زبان سے کروانا بانو قدسیہ کے فن کا مظہر ہے اور انھوں نے اپنے اس فن سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

پروفیسر سہیل سے ملاقات دیگر کرداروں کے لیے دلچسپ بھی ہوتی ہے اور پر تاثیر بھی۔ اس سے کی جانیوالی ہر ملاقات اپنا اثر ضرور چھوڑتی ہے جس کا اظہار دیگر کردار اس کی غیر موجودگی میں بھی کرتے ہیں اور اپنے ذہن میں بھی سوچتے ہیں جیسا کہ ''راجہ گدھ'' میں جابجا نظر آتا ہے۔

''کچھ ہوٹل کا ماحول تھا، کچھ پروفیسر سہیل کا مخصوص طریق گفتگو_____ بہت سنجیدہ لیکچر کے دوران وہ مزے دار لطیفے سنانے کا عادی تھا۔ مسائل کو شدید شکل دے کر فوراً ان کا یک آسان سا حل پیش کر دینا اس کی عادت تھی۔ یہاں پہلی بار اس کی صحبت میں مجھے ایسے احساس ہوا۔۔۔۔ پروفیسر سہیل توجہ دینے کا طریقہ جانتا تھا کہ اسے انسان کو سکھ دینے کا طریقہ آتا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے اپنے نارمل ہونے کا قوی شبہ ہونے لگا۔''(۲۱)

بانو قدسیہ کا ناول ''راجہ گدھ'' بلاشک و شبہ شہرہ آفاق حیثیت کا حامل ہے اس ناول میں اچھائی اور برائی کے تصور کو حرام و حلال رزق سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے اور بہت خوبصورتی سے مغربی کلچر کی خامیوں کو بھی زیر بحث لانے کی سعی کی گئی ہے اس ناول میں کرداری پیچیدگیاں معیوب نہیں محسوس ہوتیں بلکہ کہانی کی روانی میں آسانی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ قاری کے لیے دلچسپی کا باعث بنتی ہیں۔ کہانی کے کرداروں کا آپس میں ربط قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے اور قاری پورے ناول کو پڑھتے ہوئے بوریت کا شکار نہیں ہوتا۔

''راجہ گدھ'' کے پروفیسر سہیل کا چال چلن ہی کافی دلچسپ ہے جو پورے ناول کی راہنمائی کرتا دکھائی دیتا ہے مصنفہ نے اس کردار کے ذریعے معاشرے میں موجود بہت سے منفی رویوں کا پردہ چاک کیا ہے اور معاشرے کی رہبری کرنے کی کوشش کی ہے۔

''راجہ گدھ'' کا کردار پروفیسر سہیل اصل میں مصنفہ کی سوچ کا عکاس ہے۔ بانو قدسیہ کو معلوم ہے کہ ایک قائد کے لیے کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری، لیکن وہ یہ سب واضح کرنے کے لیے کسی نئے کردار کا سہارا لینے کی بجائے پروفیسر سہیل میں ہی قائدانہ صلاحیتوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ گو کہ اس سے ایک باقاعدہ کردار کی اصل شخصیت میں نمایاں پیچیدگی رونما ہوتی ہے مگر یہی تو اس ناول کا خاصہ ہے کہ اس میں کرداروں کا الجھاؤ اور ہر کردار کے عمومی زاویوں میں تضاد اس ساری کہانی کو دلچسپ بناتا ہے۔

پروفیسر سہیل کی قائدانہ صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بہت کچھ ایسا وارد ہوا ہے جو کرنے کا حکم دینے کی بجائے خود اس پر عمل پیرا ہو کر دکھاتا ہے تاکہ جس سے وہ عمل کروانا مقصود ہو اسے گرانی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور یہی ایک اچھے قائد کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ خود عملی طور پر اپنے نظریات و افکار میں موجود دکھائی دیتا ہے۔''راجہ گدھ'' میں اگر دیکھا جائے تو یوگا کی تلقین قیوم کو کرتے ہوئے پروفیسر سہیل خود اس کے سامنے یوگا میں مصروف ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اس بات کا خیال بھی نہیں کرتا کہ یہ ہوٹل ہے یہاں پر لوگ دیکھ کر کیا کہیں گے۔''راجہ گدھ'' کے کردار پروفیسر سہیل کی زبان سے اس سارے عمل کو یوں کیا گیا ہے کہ :

> ''یکدم پروفیسر اپنی کرسی سے اٹھا دو چار کرسیاں ادھر ادھر کیں اور سر کے بل دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا، پھر اس نے اسی حالت میں چوکڑی لگالی۔۔۔۔ ہوٹل میں رش نہیں تھا، لیکن جو بھی موجود تھا اس طرف متوجہ ہو گئے۔
>
> ''تم چاہو تو میں ناک کے راستے ایک گز دھاگہ پیٹ میں ڈال سکتا ہوں۔''
>
> ''ادھر آجائیے سر، سب دیکھ رہے ہیں۔''(۲۲)

پروفیسر کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ کوئی کیا کہے گا اسے صرف اور صرف اپنے شاگرد کی پرواہ تھی اسی لیے وہ اطمینان سے اٹھا پتلون میں قمیض ڈالی اور قیوم کے پاس بیٹھ کر پائپ سلگانے لگا۔ ارد گرد کے لوگوں کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے پروفیسر سہیل قیوم کو کافی دیر تک سادہ سادہ ورزشیں سمجھاتا رہا۔ جن میں جمائی لینے، سیدھا تختے کی مانند جسم ڈھیلا چھوڑنے، پیٹ، چھاتی اور کندھوں کو بیٹھتے وقت چھوڑ دینے کی ہدایات شامل ہیں۔اس کے بعد وہ قیوم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ:

> '' سنو جلد باز آدمی یوگا کے مطلب ہیں کہ relaxation تمام ورزشیں ، slow motion میں ہوں گی۔ آہستہ بہت آہستہ۔''
>
> اس کے بعد وہ دیر تک مجھے سانس لینے کا طریقے سمجھاتا رہا۔۔۔۔۔ دھونکنی پوری چلنے لگے گی تو یہ السر وغیرہ سب ختم ہو جائے گا ان شاء اللہ۔ جب سانس لو تو تمام تر توجہ سانس پر دو۔ کوئی لڑکی وڑکی کا نہ سوچو_____۔''(۲۳)

آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ''راجہ گدھ'' ہمارے معاشرے کے اتار چڑھاؤ اور اونچ نیچ کا عکاس ہے۔ اس ناول میں انتہائی سادگی سے ان موضوعات کو یکجا کر دیا گیا ہے جن پر بحث بہت ضروری بھی تھی اور

ان باتوں یا موضوعات کا ابلاغ عمومی ہونا بھی لازم تھا۔ بانو قدسیہ نے پروفیسر سہیل کی شخصیت میں ہی اتنے کرداروں کو سمو دیا ہے کہ اس کے ہر انداز سے قائدانہ انداز ابھرتے نظر آتے ہیں اور ان کے ہنر کی تحسین بھی واجب ہے۔ پروفیسر سہیل ایک بہترین قائد کے روپ میں سامنے آکر معاشرے میں ہونے والی برائیوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ پروفیسر سہیل کی شخصیت پورے ناول میں مرکزی کردار کے طور مختلف کام سرانجام دیتی نظر آتی ہے۔ اس میں قائدانہ صلاحتیں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

ii۔ پروفیسر بطور قائد (دیوار کے پیچھے)

تدریس کو مقدس ترین پیشہ اور شیوہ پیغمبری کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اسلامی معاشرے کے معمار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اسی طرح ہر معاشرہ اور ریاست کا معمار ہوتا ہے۔ وہ قوم کو تہذیب و تمدن اخلاقیات اور معاشرتی اتار چڑھاؤ سے واقف کرواتا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ اُستاد کا مقام کسی بھی معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ کسی بھی قوم کا مستقبل اس قوم کے اُستاد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ موجودہ دور کی ستم ظریفی یہ ہے کہ آج اُستاد کو معمولی نوکر سمجھ کر کرسی تھما دی جاتی ہے۔ ان کے حقوق کی پامالی اور ان کے منصب کی رسوائی بازاروں کی زینت بن چکی ہے صاحب اقتدار اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ معاشرے کے عروج و زوال میں اساتذہ کرام کا ہاتھ ہوتا ہے۔

اساتذہ بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں کچھ اُستاد تو ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے طلبہ اور اپنے ملنے والوں میں زندگی کی نئی روح پھونک دیتے ہیں زندگی کا مقصد سمجھا دیتے ہیں زندگی گزارنے کے اصول وضوابط کا پابند بنا دیتے ہیں یہ وہی اساتذہ ہیں جو ہمیشہ اپنے طلبہ میں موضوع گفتگو بنے رہتے ہیں طلباء ان کے اسٹائل کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ اساتذہ کے قول و عمل سے متاثر ہو کر اسے اپنی زندگی کا حصہ بنا لیتے ہیں۔

اساتذہ فرد کی ترقی کے ساتھ ساتھ اجتماعی ترقی کے بھی ضامن ہیں۔ معاشرے کی کایاپلٹ دیتے ہیں دنیا میں ان کے نام کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں ایک آفاقی سچائی پیش خدمت ہے کہ:

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا (۲۴)

اساتذہ کی ایک اور قسم اوسط درجے کے اساتذہ کی ہے جو معاشرے میں اپنا مقام پیدا نہیں کر پاتے اور کسمپرسی کی زندگی گزار کر زمین میں چھپ جاتے ہیں اور کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا، اس قسم کے اساتذہ بڑے انوکھے قسم کے ہوتے ہیں انہوں نے کتابیں تو بہت پڑھی ہوتی ہیں اور وہ کتابوں سے ہی دوستی رکھتے ہیں۔ پاکٹ منی سے کتابیں خریدنا ان کا بچپن سے شغل ہوتا ہے اور جوانی تک پہنچتے پہنچتے اور پھر شعور کی سطح پر پہنچ کر معاشرے اور کتابوں میں ہم آہنگی تلاش کرتے ہیں معاشرے میں اس سے الٹ جب انہیں ہر طرف دیکھنے کو ملتا ہے تو وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں، ایسے اساتذہ اپنی ذات میں بہت ہی بے باک اور سچے ہوتے ہیں۔ ہر بات صاف صاف کرنے کے عادی ہوتے ہیں نہ کسی کا کوئی نقصان کرتے ہیں اور نہ کبھی نقصان کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں اپنی ہی دھن میں مگن وہاں زندگی کی مسافت طے کرتے چلے جاتے ہیں۔

انیس ناگی اپنے ناول ''دیوار کے پیچھے'' میں ایک ایسے اُستاد کو پیش کرتے ہیں جو آمریت کا نشانہ بن کر اپنی نوکری یعنی لیکچر ارشپ سے فارغ کر دیا جاتا ہے ۔ اس کے پیچھے کچھ اس کا اپنا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے کالج سے واپسی پر وہ ناول لے کر ریسٹورنٹ میں جاتا ہے ،وہاں کے ماحول میں ویسا روپ دھار لیتا ہے، وہسکی پیتا ہے ،ان کو فارغ کرنے کا واقعہ کچھ یوں پیش آتا ہے:

> ''حسب معمول جلدی جلدی تیار ہو کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسٹاف روم میں داخل ہونے لگا تھا کہ مجھے ایک اشارے سے پرنسپل کے کمرے میں طلب کیا گیا وہ مجھے دیکھتے ہی چیخنے لگا یہ لو اپنا اعمال نامہ، کاغذ پر لکھے ہوئے اس حکم کو پڑھ لو، تمہیں نوٹس کے بغیر ہی فارغ۔۔۔۔ ایک محشر ذہن میں اور ایک رگوں میں لیے پھر رہا ہوں لیکن شہر کی وسعت نے میرا حوصلہ پست کر دیا ہے، صبح سے ذہن اور قدم اس عائد کردہ الزام یا جرم کی نوعیت کی کھوج میں ہیں۔''(۲۵)

انسانی تاریخ جتنی پرانی ہے اتنی ہی معلّم کی تاریخ۔ جب سے انسانی زندگی کا وجود اس کائنات میں ظاہر ہوا ہے تو اسی وقت سے آدم کو سیکھنے سکھانے کا عمل شروع ہو گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آدم کی اصلاح اور ترقی کے لئے اللہ تعالیٰ نے تواتر کے ساتھ اپنے پیغمبروں کا سلسلہ جاری رکھا جس سے اس کائنات اور معاشرے کی ترقی اور بہتری کا سفر بھی جاری رہا۔ آج انسان نے جتنی بھرپور انداز سے ترقی کی ہے یہ معلم ہی کی بدولت ہے، کیونکہ استاد ایک باشعور طبقہ ہے اس لئے اسکی سوچ کے دائرے بھی انسانی ترقی اور معاشرے کی بہتری پر ہی مکمل ہوتے ہیں۔

معاشرتی تقاضے ابتدائے دنیا سے انسان کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں انسان تقاضوں کے ساتھ آغاز سے انجام کی طرف یعنی پیدائش سے موت کی طرف پیش قدمی جاری رکھتا ہے اور یہ تقاضے بھی اسی کے ساتھ سفر در سفر چلتے رہتے ہیں۔ انسان اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک ہی وقت میں مختلف انداز اپنی زندگی میں اختیار کرتا ہے۔ زندگی میں ضرورتوں کو پورا کرنا ایک بہترین زندگی گزارنے کے لئے نہایت ضروری ہے اور یہی تقاضا انسان سے بہت کچھ کروا دیتا ہیں اور اسی کی سزا بھگتتے بھگتتے انسان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

انیس ناگی نے اپنے ناول میں معلّم کے ایسے کردار کو پیش کیا ہے جو زمانے کے جبر و ستم سے لاچار ہو جاتا ہے وہ اپنی ذات میں صاف گو ہے لیکن حالات اسے جھوٹا گواہ بننے پر مجبور کر دیتے ہیں جب کوئی اسے پروفیسر کہتا ہے تو وہ اس لفظ کے ساتھ ساتھ خود سے بھی گھن محسوس کرتا ہے احمد کے ساتھ کام پر جانے لگتا ہے اور وہاں پر درخواستیں لکھتا ہے، جھوٹی گواہی دیتا ہے، اپنے گھر کا چولہا جلانے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے جائز ناجائز کام کرتا ہے۔ ایک پروفیسر جب بطور گواہ یعنی جھوٹا گواہ کے طور پر عدالت میں پیش ہوتا ہے وہ کچھ یوں ہے:

> ”جو کہو گے ایمان سے سچ کہو گے، محافظ نے پھر چیخ کر کہا ہے! لیکن میں بے عقیدہ ہو کس ایمان کا حلف اٹھاؤں؟ یہ دہریہ ہے یہ کمیونسٹ ہے، یہ ایجنٹ ہے، یہ گواہ نہیں خود ملزم ہے۔۔۔ چلانے والا اختیار تو مجھے سمجھا گیا ہے، بائیں جانب بیٹھے شخص نے اپنی توند کو کھجلاتے ہوئے احتجاج کیا، ٹائپسٹ کچھ جواب دیے بغیر ٹائپ پر بڑی تیزی سے انگلیاں چلا رہا ہے، میں نے ایک ہی سانس میں اپنا حسب و نسب اور اتہ پتہ بتا دیا ہے۔“(۲۶)

یہ پروفیسر احمد کی پہلی گواہی تھی جس میں اس سے الفاظوں کا انتخاب بھی نہیں ہو رہا تھا۔ پروفیسر کا کردار اس ناول میں جس طرح زندگی کے جبر و ستم کو برداشت کرتا ہوا زندگی گزارتا ہے یہ اس ناول میں خصوصی اہمیت کا حامل کردار ہے۔ پروفیسر زندگی سے تنگ آیا ہوا شخص ہے اور گواہی دینے کا بھی طریقہ نہیں آتا۔ انیس ناگی نے گواہی دینے والے معاملے کو مزید آگے یوں بڑھایا ہے:

چپ کیوں ہو اپنا پیشہ کیوں نہیں بتاتے؟ محافظ نے گرج کر پوچھا ہے، میں ابھی سوچ ہی رہا ہوں کہ کیا جواب دوں کہ کسی نے ہجوم میں سے آواز لگائی! شہادتیں دینا ہاہاہا،(۲۷)

پروفیسر نے اپنے نئے کاروبار کا آغاز کیا تو اسے بڑی شرمندگی ہوئی لیکن انسان کیا کرے جب حالات ہی انسان کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیں۔ پروفیسر کی زندگی کا یہ دور انتہائی تلخ ترین لمحات سے پُر ہے۔ گواہ کی خاموشی اسے جھوٹا سمجھنے کے لیے کافی ہے لیکن جہاں رشوت کا بازار گرم ہو وہاں آوازوں کے مدھم ہونے یا خاموش ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہجوم میں سے گواہ پر برابر آوازیں کسی جارہی ہیں ۔ کسی نے کہا کہ اس کا رویہ شامل مثل کیا جائے، احمد چیخ کر اعتراض کرتا ہے۔ پروفیسر نے اپنے اندر موجود تمام طاقت کو جمع کر کے اور گلا صاف کرکے وہ سب کچھ اس تیزی سے دہرایا کہ سب حیرت سے دیکھنے لگے۔ پروفیسر کچھ باتیں بھول جاتا ہے اور فوراً اسے چوہدری یاد آجاتا ہے۔ انیس ناگی نے اس کردار کو خوبصورت انداز میں ناول میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"طوطا سبق دوہرا رہا ہے ہاہاہا، اف میں برآمدگی کا ذکر بھول گیا ہوں، چودھری میرا ستیاناس کر دے گا میں نے جھوٹے یقین کے ساتھ بلند آواز میں خالی کرسی کو مخاطب کیا ہے! جناب والا میں کچھ بھول گیا ہوں۔ بھولی ہوئی بات کو یاد کرنے کی اجازت نہیں، ٹائپسٹ نے بدستور انگلیاں چلاتے ہوئے تنبیہ کی ہے۔"(۲۸)

گواہی دینا کوئی آسان کام نہیں اور پھر ایک پروفیسر کے لیے جو معاشرے کو درست سمت دینے کے لیے دن رات کوشاں رہتا ہے۔ ایک اُستاد قائد کی طرح اپنے طالب علموں کے دل میں اتر کر ان کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کہانی کو انیس ناگی نے بڑی چابک دستی سے آگے بڑھایا ہے۔ کمرۂ عدالت میں بائیں جانب بیٹھا موٹا شخص ایک دم غصے میں جھرجھری لے کر بچوں کی طرح دانت پیسنے لگتا ہے، جرح کی اجازت طلب کر کے پروفیسر سے مخاطب ہوتا ہے پوچھتا ہے کہ کیا یہ درست ہے کہ آپ پہلی مرتبہ شہادت دے رہے ہیں؟ احمد نے جرح کا آغاز کیا جواب ملا کہ منشی گواہ پر جرح نہیں کر سکتا، یہ اعتراض محافظ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس وقت کرسی خالی ہونے کی وجہ سے سب کچھ جائز ہے احمد نے محافظ کو جواب دیا ہے۔ انیس ناگی نے اس کارروائی کو یوں آگے بڑھایا ہے پروفیسر بات بات پر جھوٹ بولتا ہے اور اس پر تمام ہجوم قہقہے لگاتا رہتا ہے لیکن کارروائی جاری رہتی ہے:

''ہجوم پر قہقہے لگا رہا ہے، حاجی نائب نے نیچے سے مجھے بھرپور ٹھوکر ماری ہے اور میرے منھ سے بے ساختہ چیخ نکلی ہے۔ کٹہرے میں کھڑے بھینگے کے ساتھ نے چیخ کر کہا ہے! جناب ایک دو سوال میں کروں گا۔

ٹاپئسٹ: اجازت ہے۔۔۔

بھینگے کا ساتھی کیا یہ ٹھیک ہے کہ تم چوہدری کے کہنے پر چھوٹی شہادت دے رہے ہو؟(۲۹)

اس کہانی کو انجام تک پہنچانے کے لیے انیس ناگی نے مختلف کرداروں سے کام لیتے ہوئے ان کا بالکل صحیح استعمال کیا ہے۔ دراصل ناول ''دیوار کے پیچھے'' میں ایک ایسے فرد کی سرگزشت ہے جس کے تمام انسانی رشتے ٹوٹ چکے ہیں فرد اپنی شناخت کھو چکا ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے اس نے نیا راستہ اختیار کیا وہاں بھی اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، وہ ہر بار کوئی نہ کوئی غلطی کرتا ہے۔ انیس ناگی نے عدالت میں ہونے والی کارروائی کو مزید یوں بڑھایا:

میں: میں کسی چوہدری کو نہیں جانتا میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی شہادت دی ہے احمد لپک کر آگے بڑھا ہے اور بھینگے کے ساتھ کے کان میں کچھ کھسر پھسر کر رہا ہے۔۔۔

یہ بالکل غلط ہے احمد تم تم۔۔۔ میں سچ بول رہا ہوں، نہیں میں جھوٹ بول رہا ہوں۔''(۳۰)

ناول میں پروفیسر کے جرائم کی ایک مکمل فہرست موجود ہے۔ پروفیسر کی موجودگی خود ایک جرم ہے، معاشرے نے اسے مردود قرار دے دیا ہے۔ اس کا تعاقب کیا جاتا ہے، احتجاج کرنے کی بھی عادت ہے اور سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ پروفیسر وضاحت اور معنویت کا طلب گار رہتا ہے۔ گواہی دینے والے معاملے میں بھی وہ گھبرا جاتا ہے اور قہقہوں کے شور سے گھبرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''میں زور زور سے چیخنے لگا ہوں اور میری ہر چیخ کے ساتھ قہقہوں کا شور بلند ہو رہا ہے۔ یہ پروفیسر ہے نہیں یہ جھوٹا گواہ ہے یہ بہروپیہ ہے ہاہاہا۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی اور روشنی کے دھبے ناچ رہے ہیں۔۔۔ میری ٹانگیں نقاہت سے بری طرح کانپ رہی ہیں، سامنے چوہدری سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہا ہے، طبعیت کچھ بحال ہوئی ہے اور میں منھ کا کڑوا ذائقہ دور کرنے کے لیے اپنی دونوں

جیبوں میں سگریٹ کی ڈبیہ ٹٹول رہا ہوں لیکن نہ ڈبیا مل رہی ہے اور نہ دو نوٹ جن کی
خاطر۔۔۔"(۳۱)

انیس ناگی نے فرد کی کہانی کو موضوع بحث بنا کر خود کلامی میں ناول تحریر کیا ہے یہ ناول پاکستانی کلچر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ متوسط طبقے یا نچلے طبقے کے نشیب و فراز کا عکاس یہ ناول "دیوار کے پیچھے" بڑی جاذبیت اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ ناول کا مرکزی کردار پروفیسر معاشرے میں پائے جانی والی ناہمواریوں، عدم مساوات، انسان کے ہاتھوں دوسرے انسانوں کی تذلیل، جرم و گناہ کی دنیا میں انسانیت کا شخصی و غیر شخصی دونوں سطح پر استحصال اور ان گنت مسائل کے خلاف انفرادی سطح پر آواز بلند کرتا ہے لیکن بے سود۔ جس جگہ بھی پروفیسر جاتا ہے یا یوں کہیے کہ حالات جس جگہ لے جاتے ہیں وہ اپنے انقلابی نظریات کا اظہار کرتا ہے اور معاشرے کی بے حسی پر چلتا ہوا نظام ٹس سے مس نہیں ہوتا بلکہ پروفیسر بھی معاشرے کی طرح بے حس ہو جاتا ہے۔

معاشرہ ایسے انقلابی نظریات و خیالات رکھنے والے افراد کو کچل دیتا ہے اور جو ایسے نظریات کے حامل ہوتے ہیں ان کو بھی معاشرے کے بے حس اور گھٹیا افراد کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔ ناول میں پروفیسر بھی معاشرے کی بے بسی کا شکار ہو جاتا ہے اور آخر میں خود کو انہی گھٹیا اور کمینے لوگوں کی صف میں پاتا ہے جن کو وہ شروع سے غلط اور ناپسند کرتا رہا ہے۔ پروفیسر خودکشی کی بھی ناکام کوشش کرتا ہے۔ بالآخر وہ معاشرے کے رحم و کرم پر زندہ رہ کر ایک لایعنیت پر مبنی زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

پروفیسر کو کالج سے خوفناک آدمی کہہ کر نکال دیا جاتا ہے، اب وہ جھوٹیاں گواہی دینے سے بھی اکتا گیا ہے، پولیس کے ساتھ گشت کرنا بھی اس کی معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے ایک کوشش ہے، ناول میں پروفیسر کے جرائم کی پوری فہرست موجود ہے۔ اوّل یہ کہ اس کی اپنی موجودگی ہی جرم ہے اس کا سب سے بڑا جرم ہی یہ ہے کہ وہ معاشرے میں اپنے وجود کی حقیقت کے بارے میں سوچتا ہے وہ اس لیے بھی معتوب ہے کہ معاشرے نے اسے مردود قرار دے دیا ہے اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے وہ اسی تعاقب کرنے والے سے سامنا کرنے کا سوچتا ہے لیکن اتنی ہمت نہیں کہ رک کر اس کا سامنا کر لے۔ وہ تنہائی میں ممنوعہ موضوعات کے متعلق سوچ و بچار کرتا ہے خود سے ہی احتجاج کرتا ہے۔

ناول میں احمد کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر سے ملاقات کے دوران اس کا حمایتی بن کر اسے مشورے دیتا ہے لیکن وہ اصل میں اسے اپنے مقاصد اور مکروہ دھندے سے پیسہ اکٹھا کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ پروفیسر کی سوچیں متحرک رہتی ہیں وہ احمد کے بارے میں یوں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے:

> ”میں اتنا فاترالعقل نہیں جتنا بنایا جارہا ہے یا میں نے خود اپنے آپ کو بنانے کا تہیہ کیا ہے! مجھے احمد شازشی معلوم ہوتا ہے، وہ چودھری کا آدمی ہے، اس نے مجھے کس چکر میں الجھا دیا ہے؟ میں نے تو اس کے معاون کے طور پر کام کرنے کا معاہدہ کیا تھا لیکن مجھے بتدریج ایک مکڑی کے جال میں الجھاتا جارہا ہے۔ مجھے جو نقصان پہنچنا تھا وہ پہنچ چکا ہے، ۔۔۔ تلاش رزق تمہیں ایسی بھول بھلیوں کی طرف لے جارہی ہے جہاں سے تم واپس نہیں آسکو گے اگر کبھی آ بھی گئے تو اپنے آپ کو پہچان نہیں سکو گے۔“(۳۲)

معاشی مفادات کی خاطر انسان کہاں کہاں پہنچ جاتا ہے جہاں گمان بھی نہیں ہوتا اور ایسے ایسے کام سر انجام دینے کے لیے تیار ہو جاتا جو اس کی عزت کو بھی داغ دار کر دیتے ہیں۔ انیس ناگی کی تکنیک نے اس کی صلاحیتوں کا بھرپور ساتھ دیتے ہوئے ناول کو تعجب انگیز حد تک فطری واقعات کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ تمام کردار ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے میں انیس ناگی کی مہارت نظر آتی ہے۔ پروفیسر چونکہ مرکزی کردار ہے اس لیے ناول اسی کی زندگی کے گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔ احمد کے ساتھ کام پر جانے کے بعد اور پھر وہاں کے اصول وضوابط سمجھنے کے بعد پروفیسر نے داڑھی بھی رکھ لی ہے اور اب اس کی یہ حالت ہے کہ لوگ اسے صوفی کہہ کر پکارتے ہیں۔ گھر والے بھی نہیں جانتے کہ پروفیسر کے شب وروز کہاں گزرتے ہیں۔ انیس ناگی نے اس کا تذکرہ یوں کیا ہے:

> ”میرے گھر والوں کو میری اس زندگی کا علم نہیں ہے، میں نے اس سے ملازمت کا جھوٹ بولا ہوا ہے۔ یوں بھی اب میں گھر بہت کم قیام کرتا ہوں۔ صبح مجھے اپنے ساتھ لے جاتا ہے، دن بھر کام کاج۔۔۔ جیب میں سے ”جن“ کا محلول جلدی سے حلق میں انڈیلتا ہوں کہ مجھے کوئی دیکھ نہ لے۔ راہ چلتے ہوئے بھی بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں کہ کوئی میری شناخت نہ کرلے۔ پھر خود ہی ہنسنے لگتا ہوں، میں نے داڑھی اور لمبے بالوں میں اپنے آپ کو کب سے چھپا رکھا ہے، احمد کے اڈے پر بھی لوگ مجھے صوفی صاحب کہنے لگے ہیں۔ (۳۳)

پروفیسر کا کردار ہمارے معاشرے میں ایسے ہی نظر آتا ہے جیسے انیس ناگی نے ''دیوار کے پیچھے''میں بیان کیا ہے۔ انیس ناگی نے متوسط طبقے میں رہنے والے لوگوں کی عکاسی بڑی خوب صورتی سے کی ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان مجرم نہیں ہوتا بلکہ معاشرہ اسے مجرم بنا دیتا ہے مجرموں کی دنیا میں اگر ان کی بائیوگرافی دیکھی جائے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ یہی انسان جو آج خطرناک مجرم کے روپ میں دنیا میں بلاخوف قانون کی دھجیاں بکھیرتا ہے اصل میں وہ کبھی ایک معزز شخصت کی طرح زندگی گزارنے کی کوشش میں تھا لیکن حالات وواقعات نے اسے غلط کاموں کی طرف موڑ دیا اور اب وہ ایک خطرناک مجرم کے روپ میں دنیا کے سامنے موجود ہوتا ہے۔

انیس ناگی نے متوسط طبقے کی ترجمانی بڑے ہی انوکھے انداز میں کی ہے وہ پروفیسر کو جو کہ کبھی بھی دوسروں کی زندگی میں خلل نہیں ڈالتا، سیدھی سادھی زندگی بسر کرتا ہے، اس کے ذریعے معاشرے کی برائی کو پیش کیا ہے معاشرہ کس قدر بے رحم اور بے حس ہے کہ انسان کو وہ کچھ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جن کے خلاف وہ آواز اٹھاتا رہا ہو۔ جب تقدیر تدبیر کا راستہ روک لے تو پھر انسان کے پاس دو ہی راستے بچتے ہیں سر تسلیم خم یا اعلان بغاوت۔ دونوں راستوں کا انجام ہلاکت ہے صرف ہلاکت۔

''دیوار کے پیچھے'' ناول میں ایک ایسے فرد کی سرگزشت ہے جس کی سماعت میں فرق آچکا ہے، اس کے ساتھ جڑے تمام انسانی رشتے اس سے بیزار ہو کر اسے چھوڑ چکے ہیں اور اس کی اپنی کوئی شناخت اسے پسند نہیں ہے۔ انیس ناگی نے پروفیسر کے ایک ایسے روپ کو ناول میں جگہ دی ہے جو معاشرے کی ظلم و ستم کو برداشت نہ کر سکے اس کے اندر موجود قائدانہ صلاحیتیں ایک ایک کر کے دم توڑتی چلی جاتی ہیں۔ ایک پروفیسر کے ہاں بہت سی ایسی خوبیوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن وہ بھی معاشرے کا حصہ ہوتا ہے اسے بھی زندگی گزارنے کے لیے تمام مادی اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب معاشرہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرے اور حالات اس قدر تنگ ہو جائیں تو قائدانہ خوبیاں معدوم ہو جاتی ہیں اور مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وہ مختلف طریقے اپناتا ہے۔ جیسا کہ انیس ناگی نے اس ناول میں ایسے ہی پروفیسر کی کہانی بیان کی ہے جو حالات سے تنگ ہے اور اس نے اپنے خیالات و نظریات کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ چوہدری کا ساتھ دیا ہے لیکن چوہدری کے ناپاک عزائم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ملک صاحب کی جان بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال لیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

”پروفیسر میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے پہلے مجھے یقین نہ آیا میں نے اپنی طرف دیکھا تو اس ناقابل یقین کہانی پر یقین آیا کہ ایک انجینئر بستہ الف کا بدمعاش ہو سکتا ہے تو ایک پروفیسر۔۔۔۔ آج سے بیس سال پہلے اس نے میرے باپ کو شبہ کی بنا پر ایک واردات میں ملوث کر لیا تھا میں اس زمانے میں انجینئرنگ کرنے کے بعد نیا نیا ایس ڈی او بھرتی ہوا تھا اس چودھری نے اس ذلیل نے تفتیش کے دوران میرے باپ پر تشدد کیا کہ اس نے جان دے دی وہ نہایت نیک سیدھا سادھا کلرک تھا۔“(۳۴)

انیس ناگی نے ناول میں ایک ایسے پروفیسر کے ساتھ ساتھ ملک صاحب اور دوسرے اہم کرداروں کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔ ملک صاحب جو کہ خدا اور انسان دونوں سے ڈرتا تھا، مظلوم کا ساتھ اور ظلم کرنے والے کے خلاف تھا۔ چودھری نے اسے ناجائز قتل کیا اور پھر میں نے اشتعال میں آکر اس کے بھائی کو قتل کر دیا اس نے مجھے پکڑنا چاہا میں باڈر پار کر کے اپنے ایک سکھ دوست کے پاس تین سال چھپا رہا وہاں جب مخبری ہوئی تو میں واپس آ گیا اور دو برس بھیس بدل کر مختلف شہروں میں پھرتا رہا اس کے بعد میں اتنا مضبوط ہو تا گیا کہ مجھے دوبارہ گرفت میں لینا مشکل ہو گیا، میں نے ظلم کا دہشت اور دولت کے ذریعے مقابلہ کیا ہے۔ میں اور چوہدری چوبیس سال کے بعد ایک جگہ اکٹھے ہوئے ہیں وہ منتہلی کے بہانے مجھے دوبارہ مشتعل کرنے کی کوشش کرتا ہے مجھے حسب ضابطہ سزا نہیں دی جا سکتی اسی لیے مجھے مقابلے کے ذریعے قتل کرنے کا پلان بنایا گیا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ چودھری جب تک زندہ ہے وہ ہر صورت میں وار کرے گا چودھری کا کینہ ابھی تک ختم نہیں ہوا، روز روز کی بک بک کا فیصلہ ہونا چاہیے ملک صاحب! پھر پروفیسر آج چودھری کا تیا پانچا ہو جائے بالکل میں یہ اطلاع اسی غرض سے یہاں لایا ہوں لیکن میری آمد کی اطلاع کسی کو نہیں ہونی چاہیے۔ ایک قائد کی طرح پروفیسر نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ملک کی جان بچانے کی بھرپور کوشش کی، اسے تمام منصوبہ بندی کے بارے میں بتایا، اس پر ملک کہتا ہے کہ تم فکر مت کرو میری سٹین گن بڑی وفادار ہے میرا باپ ابھی کل مجھے خواب میں ملا ہے اس کے سارے کپڑے لہولہان تھے وہ ابھی تک اپنا قصاص مانگتا ہے میں اسے چھلنی کر دوں گا، میں اس بار یہ کھیل ختم کر کے بارڈر پار چلا جاؤں گا۔ چودھری کو مارنے کے بعد وہ یوں منصوبہ بندی کرتا ہے:

"میں کل کے بارے میں نہیں سوچتا میں چوبیس برس بعد پھر باڈر کراس کر جاؤں گا ہر نام سنگھ ابھی زندہ ہے پچھلے برس وہ مجھے باڈر پر ملا تھا اگر یہاں پکڑا گیا تو میرے پاس کافی دولت ہے اسے بطور ڈھال استعمال کروں گا پروفیسر اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے قربانی اور جدوجہد کی ضرورت ہے اگر میں زندہ بچ گیا تو تم میرے ساتھ شامل ہو سکتے ہو ہم دونوں اپنی جارحیت جاری رکھیں گے۔ ملک صاحب میں چلتا ہوں بہت کم وقت رہ گیا ہے ہو سکتا ہے راستے میں مڈبھیڑ ہو جائے باہر میری جیپ کھڑی ہے ڈرائیور تمہیں چھوڑ آتا ہے!"(۳۵)

پروفیسر کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ ہمیشہ وضاحت کا طلب گار رہتا ہے، معنویت کی تلاش میں سرگرداں ہے اور زندگی کے مقصد کی تلاش میں گھوم پھر رہا ہے۔ دریا میں چھلانگ لگانے پر بھی وہ زندہ بچ جاتا ہے۔ اس طرح چھلانگ لگانا ارور پھر بچ جانا یہ کسی معجزے سے کم نہیں۔ زندگی نے ابھی اور بھی امتحان لینے تھے اسی لیے موت کے انتظار میں زندگی کی جبر و ستم کو برداشت کرنے کے لیے دریا نے بھی اسے مرنے نہیں دیا اور پروفیسر موت کے انتظار میں زندگی جبر مسلسل کی طرح نیم مردہ حالت میں کاٹ رہا ہے۔ جرم کیا ہے؟ کچھ پتہ نہیں لیکن یہ ضرور پتہ ہے کہ چاروں طرف سے سزاؤں نے گھیر رکھا ہے۔ ساغر صدیقی کے بقول:

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں (۳۶)

انیس ناگی نے اپنے ناول میں "دیوار کے پیچھے" میں معاشرے کے بھیانک چہروں کو انتہائی دلیری سے بے نقاب کرنے کی جسارت کی ہے۔ ایک اُستاد کے احترام کو اجاگر کرنے اور اساتذہ کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کو بھرپور انداز میں پیش کرتے ہوئے نوجوان نسل کو بہتری کی جانب گام زن کرنے کے لیے جو انداز اپنایا ہے لائق ستائش ہے۔

ناول میں پروفیسر کے جرائم کی ایک پوری فہرست موجود ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اس کی اپنی موجودگی ہی جرم ہے وہ اس لیے بھی مجرم ہے کہ معاشرے نے اسے ٹھکرا دیا ہے اور اسے مردود قرار دے کر قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کے تعاقب کیا جاتا ہے، تنہائی میں ممنوعہ موضوعات اس کو الجھائے رکھتے ہیں،

احتجاج کرنے کا عادی ہے، ان ساری برائیوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اندر قائدانہ صلاحیتیں بھی لیے ہوئے ہے۔ اس نے ملک کی جان بچانے کے لیے خود اپنی جان کو ایک قائد کی طرح خطرے میں ڈالا ہے۔

آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ "دیوار کے پیچھے" ہمارے معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کا بہترین عکاس ہے۔ انیس ناگی نے اس ناول میں جن موضوعات پر قلم فرسائی کی وہ ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں۔ پروفیسر کی تمام برائیوں کی فہرست کے ساتھ ساتھ اس کی قائدانہ خوبی بھی واضح انداز میں نظر آتی ہے یہی اس ناول کا خاصہ بھی ہے جو قاری کو اپنے سحر میں جکڑے رکھتا ہے اور قاری ناول کو پورے انہماک سے شروع سے آخر تک پڑھتا ہے۔

iii۔ ماسٹر صاحب بطور قائد (جنم کنڈلی)

بلا مبالغہ عظیم ترین پیشہ تدریس ہے، اُستاد اور معاشرے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اُستاد معاشرے کی اصلاح کرتا ہے معاشرے میں جو بھی خوبصورتی نظر آتی ہے وہ کسی ایک شخص کی محنت نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے کہیں نہ کہیں اُستاد کا ضرور ہاتھ ہوتا ہے۔ اُستاد معاشرے کا اہم ترین فرد ہے جس کے بغیر معاشرہ تباہی و بربادی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس معاشرے میں عظیم اساتذہ ہوتے ہیں وہ اس معاشرے کا سنہری دور کہلاتا ہے اور معاشرہ دن رات ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے اسے دنیا میں اعلیٰ مقام پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اُستاد معاشرے کی بنیادوں، قوموں کی جڑوں، ملکوں اور ریاستوں کی سرحدوں اور نظام عالم کی بقاء میں بنیادی اور مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔

اُستاد محض ایک شخص کا نام نہیں ہے بلکہ وہ پورا جہان ہوتا ہے جس سے لاکھوں لوگ شعوری اور غیر شعوری طور پر جڑے ہوتے ہیں اُستاد کی محنت، دیانت، راست بازی، لگن، محبت، آثار، خلوص اور نیک نیتی کا اثر صرف اس کی ذات تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ ان صفات حسنہ کا دائرہ کار لاکھوں لوگوں تک پھیلا ہوتا ہے۔ اُستاد کے بغیر دنیا میں آنکھ کھولنے والا شخص کامل انسان نہیں بن سکتا، اُستاد کا احترام ایک انسان کو ترقی کی منازل پر آسانی سے پہنچا دیتا جن کا اس نے خواب دیکھا ہوتا ہے۔

اس پیشہ کی فضیلت کے باعث ہی نوجوان طالب علم اُستاد بنتے ہیں اور مختلف شعبوں میں درس و تدریس کا کام سرانجام دیتے ہیں اُستاد کی محنت سے ہی دنیا کے ہر شعبے میں کام کرنے والا کسی نہ کسی طور پر قومی لیڈر شپ کا حصہ ہے۔ اُستاد اگرچہ طالب علم ہی ہے لیکن صرف رہنما اُستاد ہی بہترین رہبر ہوتا ہے جو اپنے

طلباء کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور انہیں تدریس کی حکمت عملی پر عمل کرنے کے ساتھ رہنما کی طرح گائیڈ کرتا ہے اور ان کے حوصلہ کو کبھی پست نہیں ہونے دیتا۔

فہیم اعظمی کے ناول ''جنم کنڈلی ''میں ماسٹر کا کردار بڑی خوبیوں کا حامل ہے وہ اپنے طلبا کو حوصلہ افزائی کے ذریعے آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا ہے:

> ''انگریزی کا ماسٹر اسے بہت پسند کرتا تھا اور اُس کی دھوتی بڑی اجلی تھی اور اس کی صدری پر استری روز ہوتی تھی اور اس کا جنیو بہت سفید تھا۔ والفاظ کی تے تیز رفتاری سے کرتا تھا اور یہی بات اس میں اور اس کے ماسٹر میں کامن تھی۔
>
> اور جب حساب کا پرچہ بہت آسان آیا اور اس نے جلدی جلدی سے سارے سوال کر ڈالے اور اس کو سو فیصدی نمبر کا یقین ہو گیا۔۔ تو وہ سفید جنیو سے لپٹ گیا اور اس نے اس کے آنسو پونچھے اور اتھارٹی سے کہا۔
>
> '' تم فیل نہیں ہو سکتے ''(۳۷)

اللہ تعالی نے انسان کو اجتماعیت کا شعور دے کر دنیا میں پیدا فرمایا اور یہ اسی شعور کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ گھر، خاندان، تنظیمیں اور ادارے بنانے کی تگ و دو کرتا ہے، قوم اور معاشرے کی تشکیل کرتا ہے اجتماعیت کا یہ شعور ان کی طاقتوں کو جمع کرنے اور ان کو بروئے کار لانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور سکھاتا ہے کہ کم تعداد اور کم وسائل کے ساتھ کس طرح آگے بڑھنا ہے، انسان تنہا جو کچھ نہیں کر سکتا وہ اجتماعیت کے شعور سے حاصل کر لیتا ہے اجتماعیت کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان کسی ایک شخص کو رہنما تسلیم کرے اور وہ رہنما اس منتشر انفرادیت کو اپنے فیصلوں کے ذریعے یکجا کرے۔ لیڈر ہونا اور پھر خود کو حقیقی لیڈر ثابت کرنا ایک چیلنج ہوتا ہے اور اس شخص کے فیصلوں سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ لیڈر واقعی حقیقی لیڈر ہے یا پھر قسمت کی کرم نوازی نے اس مقام تک پہنچایا ہے۔ حقیقی لیڈر عام لوگوں سے کئی اعتبار سے بلند اور برتر جگہ کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سب سے اہم اس کی اخلاقی حیثیت ہوتی ہے۔

فہیم اعظمی نے خود کلامی پر مشتمل اپنے ناول ''جنم کنڈلی ''میں ماسٹر کو عظیم رہنما کے طور پر پیش کیا ہے جو ماضی کی مثالوں سے اور آنے والے وقت کو جوڑ کر ایک جوش پیدا کر دیتا ہے یہی رہنما کا کام ہے کہ وہ اپنے قول و فعل سے نئی روح پھونک دے:

> '' ڈرو اس وقت سے جب درخت چلیں گے۔ ''

اور میڈرڈ کے جنگل نے میلارَ اکس کی آنکھوں میں لال مرچیں جھونک دی ہیں۔۔
اور جبل الرحمۃ نے شعلہ اُگل دیے ہیں اور لوط کے صنم ناچنے لگے ہیں اور رام چندر
جی کا کھڑاؤں ہٹا کر راون اجودھیا کے سنگھاسن پر بیٹھ گیا۔"(۳۸)

"جنم کنڈلی" میں فہیم اعظمی نے جس طرح مختلف ادوار کو یکجا کیا ہے اور اپنے قارئین کو اس درجہ دلچسپ حقیقتوں سے روشناس کروایا ہے کہ پڑھنے والے کا انہماک ہی ختم نہیں ہوتا۔ ایسے ایسے عظیم لوگوں کو بالکل سادہ انداز میں مکالماتی طریقہ سے اپنے قاری کے روبرو کیا ہے کہ پڑھنے والا خود کو اس دور میں محسوس کرتا ہے۔ اس ناول میں بہت سے ایسے واقعات کو کسی معاشرتی سبق کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ جن کو شاید کسی دور میں دیومالائی کہانی یا پھر دیوی دیوتاؤں کے قصے ہی سمجھا جاتا رہا ہو۔ ہم تواریخ کا مطالعہ کریں تو کئی بار ہمارا واسطہ حقیقتاً ایسی اقوام سے پڑتا ہے جن کے ابتدائی ادوار دیومالائی کہانیوں میں جکڑے ہوئے ملتے ہیں اور وہ اقوام آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی ان قصوں پر کاربند ہیں۔ سبط حسن اپنی تصنیف "ماضی کے مزار" میں اس دلچسپ امر کی نشاندہی یوں کرتے ہیں کہ:

"پرانی قوموں کی زندگی میں تاریخی دور سے پہلے ایک نیم اساطیری اور نیم تاریخی
دور ضرور آتا ہے۔ اس دور میں انسان کو اپنے ہم جنسوں میں خداوندی کی صفات
نظر آنے لگتی ہیں۔ اس میں خودشناسی کی صلاحیت ابھرتی ہے اور وہ انسان کو بھی ان
کارناموں کا اہل سمجھنے لگتا ہے جو اس سے پیش تر فقط دیوی دیوتاؤں سے منسوب کیے
جاتے تھے"(۳۹)

فہیم اعظمی "جنم کنڈلی" کے ذریعے ایک ایسے کردار کو پیش کرتے ہیں جو کہ سب کو سکھا تو رہا ہے لیکن بات کا حصہ نہیں بنتا۔ وہ واقعات و تواریخ کا پرچار کرنے پر یقین رکھتا ہے۔ اس میں قائدانہ صلاحیت موجود ہے اور وہ اپنے الفاظ کے ذریعے منظر کشی کرتے ہوئے اپنی قیادت کو مضبوط بناتا ہے۔ گو کہ دیومالائی محسوس ہوتا ہے لیکن نامناسب نہیں۔ ملاحظہ ہو:

"یہاں کوئی ماضی نہیں جانتا، سب حال جانتے ہیں اور دونوں حال میں کھو گئے۔ اور
دیوار گر گئی اور پردہ ہٹ گیا اور کسی نے کسی سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کس لیے آیا ہے،
دونوں جانتے تھے، دونوں کے اکھاڑے الگ الگ تھے"(۴۰)

اس ناول کا مرکزی کردار اسی تہذیب پر مکمل عبور رکھتا ہے۔ وہ جب مختلف علاقوں کا سفر کرتا ہے مختلف شخصیات سے ملتا ہے تو وہ دراصل اس تہذیب کو بیان کرتا ہے جس میں وہ شخصیات زندگی گزار رہی ہوتی ہیں۔ اس ناول کا بنیادی کردار اس ہند اسلامی تہذیب کو ایک ہتھیار کی طرح تعلیم و تربیت کی جنگ میں استعمال کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایک اُستاد جس طرح اپنے منصب کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے ناول میں اس کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول کا بنیادی کردار ناول میں ایک اُستاد کا کردار بیان کرتے ہوئے واضح کرتا ہے کہ کس طرح ایک اُستاد بچوں کو اپنا غلام سمجھتا ہے ان باتوں کا بیان کرنا صرف حقائق کو بیان کرنا یا حالات کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ ناول کا مرکزی کردار ان حالات و واقعات کو بیان کر کے ہمیں ایک سبق دینے کی کوشش کرتا ہے کہ ہمیں ایسے کرداروں کے خلاف آواز اٹھانی ہے ہمیں اس صورت حال کو بدلنا ہے۔

مثال کے طور پر ایک ماسٹر جو بچوں کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ ان کو اپنا غلام اور مالشی خیال کرتا ہے ایسے ہی ایک کردار کے تعلق ناول میں صفحہ نمبر ۳۹ پر تحریر کردہ یہ مثال ملاحظہ کریں۔

> ''اور پرائمری سکول کا ہیڈ ماسٹر بچوں کو فالسے کے درختوں کے نیچے چھوڑ کر اپنی کوٹھری میں الٹا لیٹا ہوا کھٹی ڈکاریں لے رہا تھا اور دوسرے بچوں کے ساتھ وہ بھی اس کا پیر دبا رہا تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی انگلیاں ماسٹر کی موٹی ران پر چیونٹی چھوڑ دیتی تھیں اور اس پر رحم کھا کر کہتا تھا۔
>
> ''اچھا تم جاؤ۔''(۴۱)

اس مثال میں دیکھا جائے تو ایک طنز چھپا ہوا ہے جو ہمارے معاشرے میں موجود اس ماسٹر کی طرح کے لوگوں پر کیا گیا ہے۔ ماسٹر کی طرح کے کئی لوگ بچوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں ماسٹر کی ران پر چیونٹی کی طرح حرکت ہونا اور ماسٹر کا یہ کہنا کہ یہ ابھی چھوٹا ہے ایک خاص صورت حال کی طرف اشارہ کرتا ہے ناول کا مرکزی کردار دراصل ہماری تربیت کر رہا ہے کہ ایسے کردار ہمارے معاشرے میں موجود ہیں لیکن ہمیں ان کے خلاف آواز بلند کرنی ہے۔ ایک اور بات اس اقتباس سے واضح ہوتی ہے کہ ناول کا لکھاری ہمارے معاشرے میں موجود چھوٹے چھوٹے کرداروں پر بھی گرفت رکھتا ہے۔ عام طور پر ناول میں اچھائی اور برائی کو علامتی سطح پر بیان کرنے کے لیے بڑے بڑے کردار پیش کیے جاتے ہیں لیکن یہاں پر لکھاری نے ایک عام سے کردار کے ذریعے معاشرے میں موجود برائی کو بے نقاب کیا ہے۔

نہ صرف برائی کو بے نقاب کیا ہے بلکہ اس برائی کے خلاف ایک احتجاجی طنز بھی ہمیں نظر آتا ہے۔ ماسٹر اور بچوں کا جو اقتباس مثال کے طور پر پیش کیا گیا اس سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ ناول کا مرکزی کردار ناول میں موجود دوسرے کرداروں کو ان کے اصل روپ میں بیان کر رہا ہے اور وہ انسانی نفسیات کو بھی بیان کر رہا ہے کہ اگر کوئی ماسٹر ہے یعنی اُستاد ہے تو ضروری نہیں کہ وہ اچھائی کے معیار پر بھی پورا اترے ہر انسان کے اندر اچھائی اور برائی کا مادہ موجود ہے ضروری نہیں کہ جسے ہم اچھا سمجھتے ہوں وہ واقعی اچھا ہو۔ برائی کی قوت کسی وقت اور کسی پر بھی حاوی ہو سکتی ہے اور برائی صرف برے کرداروں کے اندر ہی نہیں ہوتی بلکہ ان کے اندر بھی ہوتی ہے جن کو بظاہر معاشرہ اچھائی کے منصب پر فائز سمجھتا ہے اور اس اقتباس سے مصنف کے مشاہداتی تنوع کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نہ صرف مشاہداتی قوت رکھتا ہے بلکہ ہر قسم کا مشاہدہ اس کے ہاں موجود ہے۔

فہیم اعظمی کے ناول ''جنم کنڈلی'' میں دراصل معاشرہ میں موجود برائیوں، ان پر اکسانے والے عوامل اور ان سے بچنے کے لیے اختیار کیے جانے والے راستوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی ہے۔ اس ناول میں کسی جگہ پر طنز کا سہارا لیا گیا ہے اور کہیں پر نصیحت کا۔ مختلف ادوار سے گزرتا ہوا یہ ناول مختلف تہذیبوں کو کرداروں کی صورت میں ساتھ لے کر چلتا ہے اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے ان میں نکھار پیدا کرتا ہے۔

iv۔ پروفیسر سہارن رائے بطور قائد (آدھے ادھورے خواب)

اُستاد ایک عظیم رہنما اور قائد ہوتا ہے۔ اساتذہ آئندہ آنے والی نسلوں کو سدھارنے کے لئے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اُستاد اپنے طلبہ کی ترقی و کامیابی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں اور اس کے پیش نظر ایک رہنما کے طور پر طلبہ پر تمام تر توجہ مبذول کرتا ہے۔ دوسری جانب طلبہ پر ذمہ داری اور ان کی دلچسپی بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے جس کی بنا پر اساتذہ کی محنت رنگ لاتی ہے۔ اساتذہ کی محنت سے ہی ایک بہترین شخصیت کی تعمیر کے ساتھ ساتھ بہترین معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے۔ ایک مستند اور حقیقی معلّم ہی اپنے طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کو سمجھتے ہوئے ان کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے اور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ایک کامیاب شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

شاہد صدیقی کے بارے میں آصف فرخی یوں رقم طراز ہیں:

''ایک ماہر تعلیم نے اپنی علمی مہارت میں گوندھ کر اس ناول کا خمیر اٹھایا ہے۔
ہمارے یہاں علم وادب کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلے اس درجے پر پہنچ چکے ہیں

کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں ملنے پاتی۔ ایسی دولخت صورت حال میں شاہد صدیقی
کا یہ ناول علم سے ادب کی طرف قدم بڑھاتا ہوا نظر آتا ہے اور اس لئے مجھے خاص
طور پر خوش آئند۔۔۔ناول ہی کا سہارا بہتر ہے اور اس ناول میں فکر و احساس کی یہ
آمیزش زندگی کی حرارت سے جی اٹھتی ہے۔"(۴۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ معلّم بہت بڑا پیش رو اور رہبر ہوتا ہے، بلا مبالغہ تخلیق اور حوصلہ افزائی سب سے اہم ہے جو کہ ایک عظیم اُستاد انجام دیتا ہے۔ طالب علم کی حوصلہ افزائی ایک لازمی عنصر ہے جو معیاری تعلیم کے لئے ضروری ہے۔ ایک ماہر معلّم اپنے طلبہ کی مخصوص ضروریات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی تدریس کی حکمت ترتیب دیتا ہے طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ان میں خود مختاری، روشن مستقبل کی تجسس، چیلنج وغیرہ کے لحاظ سے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ یہ بات تحقیق سے عیاں ہوتی ہے کہ اندرونی حوصلہ افزائی طلبہ کو زندگی کے طویل عرصے میں اپنے ہم منصبوں سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ طلبہ کی جتنی حوصلہ افزائی کی جائے گی اسی قدر ثمرات ہمیں معاشرے کی اصلاح کی صورت میں نظر آنے لگ جائیں گے۔

شاہد صدیقی بخوبی جانتے ہیں کیونکہ وہ بھی عرصہ دراز سے درس و تدریس کا حصہ رہے ہیں کہ ایک کامیاب اُستاد میں کیا کیا اوصاف ہونے چاہیے۔ انہوں نے کہانی میں کرداروں کے ذریعے کامیاب اُستاد کو پیش کیا ہے اور پھر معاشرے کی بے حسی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ایک اُستاد اپنے طلبہ کو اعلیٰ اقدار سکھانے کے ساتھ ساتھ انسان سازی کا عمل بھی جاری رکھے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ شعوری طور پر طلبہ سے ایسی مشقیں کرواتا ہے جس سے طلبہ میں سوچنے سمجھنے اور تحقیق کرنے کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ چودہ سو سال قبل عرب کے قبائلی معاشرے میں عمر کے چالیس سال گزارنے والی امّی (غیر پڑھے) فرد کے قلب پر وحی کا نزول ہوتا ہے اور وہ رہتی دنیا کے لیے معلّم اعظم ﷺ بن جاتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نوید مسیحؑ اور دعائے خلیلؑ ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی دیواریں اٹھاتے ہوئے دعا کرتے تھے:

"ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم آیتک، و یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم۔ انک انت العزیز الحکیم"(۴۳)

ترجمہ: ''اے رب ان لوگوں میں خود انہیں کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائے
جو انہیں تیری آیات سنائے ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی
زندگیاں سنوارے، بے شک تو غالب حکمت والا ہے۔''

رب العزت نے سب سے زیادہ عزت احترام اور توقیر اہل علم کو دی ہے۔ اسوہ حسنہ ﷺ پر نظر ڈالیں تو عیاں ہو گا کہ علم دشمنوں نے آپ ﷺ کو اپنے مشن سے روکنے کے لیے کتنا جبر کیا، دباؤ ڈالا، پریشان کیا مگر آپ ﷺ کے پائے استقامت میں ذرا بھر لغزش نہیں آئی۔ آپ ﷺ نے یہاں تک فرمادیا کہ اگر تم میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج لا کر رکھ دو میں تب بھی اپنے کام سے باز نہیں آؤں گا۔ یہ استحکام واستقامت کی روشن دلیل ہے۔

اچھا اُستاد متعلم کی صلاحیتوں کو مثبت انداز میں اجاگر کرتا ہے وہ مردم شناس ہوتا ہے شخصیت کی نشوونما میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا وہ منفی فکر کا حامل نہیں ہوتا۔ شاہد صدیقی نے بھی پروفیسر سہارن رائے کے کردار کو کہانی میں اسی طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر سہارن رائے اپنے طلبہ کی آنکھوں میں مستقبل کے خواب سجاتے ہیں ان کے اذہان کو کھولتے ہیں ایک قائد کی طرح ان کی مکمل رہنمائی کرتے ہیں اُستاد کی محنت کی بدولت ہی طلبہ ترقی کرتے ہوئے اعلی مقام پر پہنچتے ہیں۔ عظیم اساتذہ طلبہ کو صرف تعلیم ہی نہیں دیتے بلکہ ان کی قسمت تبدیل کرتے ہیں اور یہی ایک عظیم قائد کی خصوصیت ہے۔

سہارن رائے کے ساتھ پہلی کلاس جس دن ہوتی ہے وہ سردیوں کا ایک ٹھٹھرتا ہوا دن تھا، کلاس کو بتایا گیا کہ آج ان کی کلاس میں ایک نئے پروفیسر آئیں گے۔ تھوڑی دیر میں ہماری ہی عمر کا ایک نوجوان کلاس میں داخل ہوا۔ انھوں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کلاس سے کہا کہ مجھے کلاس میں بہت سے آرٹسٹ بیٹھے نظر آرہے ہیں۔ ساری کلاس نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا اور پھر پروفیسر سہارن رائے نے کلاس میں A4 سائز کے سفید کاغذ تقسیم کیے اور بورڈ پر ایک پھول بنایا۔ اس پھول کی صرف تین پتیاں تھیں۔ پروفیسر سہارن رائے کلاس کو پہلے دن سے اس طرح لے کر چلتے ہیں کہ ان کے طلبہ میں مخفی صلاحیتوں کو منظر عام پر لانے کے لیے مختلف مشقیں کرواتے ہیں۔

''بورڈ پر پھول بنا کر وہ ہماری طرف پلٹے اور شرارت سے کہنے لگے۔
''یہ بہت خاص پھول ہے، پتہ ہے کیوں؟''

ہماری کلاس کی ایک پڑھاکو لڑکی سعدیہ نے ہاتھ کھڑا کیا اور کہنے لگی ''سر کیوں کہ اس کی تین پتیاں ہیں۔''

''ویری گڈ سعدیہ۔''

سر رائے نے اس کے نیم ٹیگ کو دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن اس کی ایک اور وجہ بھی ہے۔'' (۴۴)

شاہد صدیقی نے پروفیسر سہارن رائے میں قائدانہ صلاحیتوں کو بھرپور انداز میں برتا ہے انھوں نے ناول کے شروع سے ہی ان کو ایک بہترین قائد دکھانے کی کوشش کی ہے۔ پھول بنانے کے بعد کلاس کو توجہ حاصل کرنے کے لیے کیے گئے سوال پر ساری کلاس سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے، ملاحظہ ہو:

''سر یہ پھول اس لیے خاص ہے کہ بورڈ پر بنا ہوا ہے۔'' میں نے جلدی سے ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ اس پر کلاس میں ایک قہقہہ بلند ہوا اور شاید میں چاہتا بھی یہی تھا۔۔۔

میں نے نوٹ کیا وہ ہمارے نیم ٹیگز کی مدد سے ہمارے ناموں سے پکار رہے تھے۔

''اس پھول کے خاص ہونے کی وجہ یہ ہے۔'' یہاں پہنچ کر پروفیسر رائے بے تکلفی سے میز پر بیٹھ گئے اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا ''یہ میرا پھول ہے۔'' (۴۵)

بات یہیں ختم نہیں ہوتی وہ اپنے طلبہ میں اس مشق کے ذریعے یعنی پھول بنانے کی مشق سے خود اعتمادی اور راہنمائی کا درس دیتے ہیں۔ ان کے طلبہ میں خود اعتمادی اور آگے بڑھنے کی لگن مزید تقویت پاتی ہے اور سہارن رائے اپنے طلبہ میں خود اعتمادی دیکھ کر خوشی کا انداز اختیار کر لیتے ہیں۔

''پروفیسر رائے ہوا میں بلند پھولوں کو دیکھ کر بولے ''ایک ہی کلاس میں اتنے زیادہ آرٹسٹ؟'' ان کے لہجے میں دنیا جہان کی حیرتیں سمٹ آئی تھیں۔ اب میں خود تدریس کے پیشے میں ایک عرصہ گزر چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ پروفیسر ایک غیر محسوس طریقے سے ہمیں خود پر اعتماد کا درس دے رہے تھے۔

اس ایک جملے سے ہمیں اپنا آپ اچھا لگنے لگا۔

''ابھی پھول مکمل نہیں ہوا۔'' پروفیسر رائے کی آواز گونجی۔'' (۴۶)

ایک قائد کی طرح سب کو ایک ٹاسک دینے کے بعد ان میں تجسس پیدا کرنے کا ہنر شاہد صدیقی نے خوب انداز میں برتا ہے۔ پھول کو بنانے کے بعد انھیں ایک اور ٹاسک دے دیا جاتا ہے جس پر تمام طلبہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

"پھول کی پہلی پتی میں اپنا نام لکھیں۔ اپنا پہلا نام۔""دوسری پتی میں اپنا پسندیدہ کھانا۔""اور تیسری میں وہ شخصیت جس نے آپ کو بہت متاثر کیا ہو۔"
ہمیں تیسری پتی کو مکمل کرنے میں زیادہ وقت لگا۔
"ابھی ٹاسک مکمل نہیں ہوا" پروفیسر رائے بولے "اپنا کاغذ اپنے ہمسائے کو دیں اور اس کا کاغذ خود لے لیں۔" ، "آخری مرحلے میں کاغذ کی مدد سے ہم نے اپنے ہمسائے کا تعارف کرانا تھا۔" دور کہیں میرے دل کے کسی گوشے سے آواز آئی۔ یہ پروفیسر دوسروں سے بہت مختلف ہیں۔ بہت مختلف۔ انہیں دلوں اور ذہنوں پر دستک دینا آتا ہے۔"(۴۷)

پروفیسر سہارن رائے میں لیڈر شپ کی تمام خصوصیات کو یکجا کرنا شاہد صدیقی کی علمیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ کلاس کو متحرک کرتے ہیں۔ تمام کلاس کو ایک مشترکہ مقصد کے لیے کام کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ پروفیسر سہارن رائے میں شخصی کشش بھی ہے جو کہ ایک لیڈر کی عمدہ خصوصیات میں سے ہے۔ شاہد صدیقی اچھی طرح جانتے ہیں کہ معلّم ہی تعلیمی ڈھانچے کا اہم ترین عنصر اور وہ عظیم ہستی ہے جس کے کاندھوں پر نئی نسل، جو مستقبل کی معمار اور صورت گر ہے، کی تعلیم و تربیت کی نازک ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں۔ اساتذہ ہی آنے والی نسلوں کے امین اور رکھوالے ہوتے ہیں۔

مثبت سوچ اور درست سمت میں رہنمائی طلبہ کے اعتماد میں اضافہ کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ اُستاد اپنے طلبہ کو گزشتہ کامیابیوں کی فہرست بنا کر انہیں اپنے لیکچر کے دوران موٹیویٹ کرتا ہے جس سے طلبہ کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ بھی خود کو کامیاب شخصیت کی طرح محسوس کرنے لگتے ہیں اور کامیابی کے زینوں پر چڑھنا شروع ہو جاتے ہیں۔

شاہد صدیقی شعبہ تدریس کے عمل سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں اس لیے انہوں نے ناول میں ان تمام اصولوں کو مدنظر رکھ کر کہانی کو آگے بڑھایا ہے جس سے اساتذہ کی تکریم کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

پروفیسر سہارن رائے کے لئے سب کچھ ان کے طلبہ ہی تھے وہ اپنے طلبہ سے گہری محبت رکھتے تھے۔ پروفیسر سہارن رائے اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے لیڈر کی طرح بھی اپنے طلبہ کے ساتھ جڑے ہوئے تھے ملاحظہ ہو:

"یہ پروفیسر رائے تھے کون؟ اس روز آپ اتنی محبت سے ان کا ذکر کر رہے تھے کل مجھے ایک سینئر سٹوڈنٹ فریدہ ملیں مجھ سے میری پڑھائی کا پوچھنے لگیں۔ میں نے کہا باقی تو سب ٹھیک ہے لیکن مجھے تعلیم کے معاشرتی پہلو سے دلچسپی ہے۔۔۔۔۔۔۔
وہ ایک عام سے انسان تھے، very unassuming، لیکن انہیں اپنے کام سے محبت تھی۔ وہ محض ٹیچر نہیں تھے بلکہ inspirer تھے، وہ اپنے شاگردوں کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ان کے خیالات کی قدر کرتے تھے۔"(۴۸)

شاہد صدیقی نے پروفیسر سہارن رائے کے ذریعے ایک ایسے کامیاب قائد کو پیش کیا ہے جس کا ذکر اس کے طالب علم بعد میں بھی کرتے ہیں۔ جب کسی بھی طالب علم کو کوئی معاشرتی پہلو سمجھنے کی ضرورت پیش آتی تو فوراً پروفیسر سہارن رائے کا نام طلبہ کے ذہن میں آتا، اس کی سب سے بڑی وجہ ان کا طلبہ کے ساتھ محبت آمیز سلوک تھا۔ جسے ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے:

"ان کی کلاس میں ہم عام چیزوں کے انوکھے پہلوؤں سے آشنا ہوتے تھے۔ وہ سختی کی بجائے محبت کی طاقت پر یقین رکھتے تھے۔ انہیں دلوں اور ذہنوں کو مسخر کرنے کا ہنر آتا تھا۔
انتثال اپنا چہرہ اپنی دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر مجھے سن رہی تھی۔۔۔۔۔
بس وہ میدانوں سے آئے تھے اپنی مٹی کی پکار پر واپس چلے گئے۔ تین چار سال ہی رہے ہوں گے یہاں۔ وہ کہا کرتے تھے جب بلاوا آتا ہے تو جانا ہی پڑتا ہے۔"(۴۹)

کسی بھی معاشرے میں معلّم کا کردار طرزِ معاشرت پر منحصر ہوتا ہے۔ بہت سے معاشروں میں معلّم کو صرف تعلیمی مضامین پڑھانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اُستاد کے فرائض منصبی میں اور بھی دیگر صلاحیتیں ہونا انتہائی ضروری ہیں۔ ایک اُستاد ہی ہے جو بچوں کی تربیت کرکے اور تعلیم دے کر قوم کے مستقبل کی تعمیر کر رہا ہوتا ہے۔

تدریس وہ پیشہ ہے جسے صرف اسلام ہی نے نہیں بلکہ ہر مذہب اور معاشرے میں نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔ تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو جس قوم نے بھی اپنے اساتذہ کی قدر کی وہ دنیا بھر میں کامیاب و کامران ہوئی۔ اُستاد ایک عظیم ہستی ہے جو ہمیں بلندی پر پہنچا دیتی ہے، اُستاد ایک انمول تحفہ ہے جس کے بغیر انسان ادھورا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ کے لیے معلّم بنایا جانا پسند کیا۔ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ اتنی بڑی اسلامی مملکت کے خلیفہ ہونے کے باوجود ان کے دل میں کوئی حسرت ہے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ ''کاش میں ایک معلّم ہوتا۔'' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ جس شخص نے مجھے ایک لفظ سکھایا میں اس کا غلام ہوں اب اس کی مرضی مجھے بیچ دے آزاد کرے یا غلام بنائے رکھے۔ اُستاد کی عظمت و اہمیت اور معاشرے میں اس کے کردار پر علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کہتے ہیں کہ اُستاد دراصل قوم کے محافظ ہیں کیونکہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا انہیں کے سپرد ہے۔

شاہد صدیقی نے پروفیسر سہارن میں ایسے تمام خوبیوں کو شامل کر دیا ہے جو ایک قائد میں ہوتی ہیں اُستاد میں قائدانہ صلاحیتوں کا خمیر شاہد صدیقی نے جس ہنر مندی سے پروفیسر سہارن کے ذریعے ادا کروایا ہے یہ انہی کا خاصہ ہے۔ ہر کوئی چاہتا ہے کہ کوئی ایسا اُستاد ملے جو ہمیں بلندیوں پر لے جائے لیکن اچھا اُستاد ہوتا کیا ہے یہ بھی پروفیسر سہارن رائے سے ہی معلوم ہوتا ہے:

> ''ٹیچنگ بھی Pottery کی طرح ہوتی ہے۔ ایک شخصیت گری اور دوسری ظروف سازی۔ کتاب میں تین قوانین بیان کئے گئے ہیں جنہیں استعمال کرکے ہم کسی برتن کو آرٹ کے نمونے میں بدل سکتے ہیں۔''
>
> ''کیا آپ جاننا چاہیں گے یہ تین قوانین کیا ہیں؟'' سر رائے نے ہماری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً سر!'' بہت سی آوازیں ابھریں
> سب کی توجہ کا مرکز پروفیسر رائے کی آواز تھی۔
>
> ''تو غور سے سنیں شاید یہ بحث ہمیں اپنے بنیادی سوال 'اچھا اُستاد کیا ہے؟' کے جواب تک پہنچنے میں مدد دے۔''(۵۰)

پروفیسر سہارن رائے نے کلاس میں ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ تمام طلبہ سیکھنے کے بھرپور عمل سے گزر رہے ہیں، وہ کلاس سے سوال کرتے ہیں اور پھر سب کے جوابات کو پوری توجہ کے ساتھ سنتے ہیں۔ ایک

اچھے اُستاد کی خوبیاں بتانے کے لیے انھوں نے مختلف قسم کی مثالوں کا سہارہ لے کر کلاس کو ثابت کر دیا کہ ایک اچھے اُستاد میں کون کون سی خوبیاں ہونی چاہیے۔:

> ''پہلا قانون دماغ کا قانون ہے۔ ایک اچھا ظروف ساز سب سے پہلے ذہن میں برتن کے خدوخال بناتا ہے۔''۔۔۔
>
> پھر وہ بولے ہاں تو ہم ذہن اور ہاتھ کے قوانین کی بات کر رہے تھے۔ کتاب کے مصنف کے مطابق ان دونوں قوانین کے استعمال سے ہم perfect dead skeleton تیار کر سکتے ہیں۔''
>
> ''اور اب آئیں تیسرے قانون کی طرف۔ یہ ہے محبت کا قانون جس سے مردہ ڈھانچے میں جان پڑ جاتی ہے اور آرٹ کا نمونہ وجود میں آتا ہے۔''(۵۱)

جہاں اساتذہ نے ہماری تعلیم وتربیت کا بیڑا اٹھایا تو انہوں نے اپنا فرض بھرپور طریقے سے نبھایا کہ صرف پڑھایا ہی نہیں بلکہ اخلاقی طور پر بھی مضبوط کیا۔ ہمیں صرف کتابی تعلیم ہی نہیں دی بلکہ دینی، اخلاقی، روحانی، جسمانی، ذہنی، معاشرتی اور ہر طرح کی تعلیم وتربیت سے بھی ہمکنار کیا۔ اتار چڑھاؤ سے لے کر اپنے احتساب تک ہماری کردار سازی میں انہوں نے اپنا پورا حق یوں ادا کیا کہ بے اختیار اساتذہ خراج تحسین کے مستحق ہیں۔

شاہد صدیقی اُستاد کے منصب سے بخوبی واقف ہیں انہوں نے کہانی میں اُستاد کی عظمت کا خاص خیال رکھا ہے کہانی کے مرکزی کردار پروفیسر سہارن رائے کو ایک ایسے اُستاد کے روپ میں دکھایا ہے جو اپنے طلبہ میں تحرک پیدا کرتا ہے، انہیں motivate کرتا ہے ۔نئے نئے محاذ ان کے سامنے کھول کر رکھتا ہے۔ پروفیسر سہارن رائے میں کہیں بھی لیڈرشپ کا فقدان نظر نہیں آتا۔ وہ طلبہ کے ساتھ شانہ بشانہ چلتے ہیں۔ پروفیسر سہارن رائے طلبہ تحریک جو کہ عدلیہ تحریک ہے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور ایک لیڈر کی طرح لیڈ کرتے ہیں۔ وہ اپنے طلبہ کو اس طرح گائیڈ کرتے ہیں کہ وہ تن تنہا ہی برائی کے سامنے ڈٹ جائیں:

> ''مزاحمت تو گھپ اندھیرے میں روشنی کی کرن ہے۔ اور گھٹن آلود ماحول میں تازہ ہوا کا جھونکا۔ روشنی اور تازہ ہوا کے یہ استعارے ہی نہ رہے تو زندگی بے رنگ ہو جائے گی۔(۵۲)

ایک اعلیٰ قائد کی خوبی ہے کہ وہ ماضی سے سبق لیتا ہے۔ اپنے ارد گرد کے ماحول سے شناسا ہوتا ہے ۔وہ خود سچا، دیانت دار، امانت دار اور قربانی کا جذبہ رکھتا ہے اور اپنی قوم کی ضروریات سے آشنا ہوتا ہے۔ رشوت، سفارش، کنبہ پروری کی لعنت سے بھی پاک ہوتا۔ ایک اچھا قائد وفاداری کے معنی سمجھتا ہے یعنی کوئی صاحب حیثیت شخصیت اپنے ماتحتوں سے تابع فرمانی کا تقاضا کر سکتی ہے لیکن وفاداری کا تقاضہ نہیں کر سکتی۔ قائد کی صلاحیت شخصیت دیانت اور سچائی ہی بہترین قائد بناتی ہے اور پھر وہ اپنے ماتحتوں سے وفاداری کی امید بھی رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ خود بھی ان کے ساتھ وفاداری کر رہا ہوتا ہے۔ تابع فرما ہر شخص کے چہرے پر متانت اور وفادار شخص کے چہرے پر منافقت نہیں بلکہ مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اچھا قائد ہمیشہ وقت کا پابند ہوتا ہے جھوٹ سے دور فریب سے دور اور اپنے مقصد کے حصول کا جذبہ رکھتا ہے۔ خود اعتمادی سب سے بڑا فن ہے جس قائد میں خود اعتمادی ہو وہ کبھی بھی ہمت نہیں ہارتا اور نہ ہی وہ مخالفوں کی باتوں سے ڈرتا ہے۔

شاہد صدیقی نے قائدانہ صلاحیتوں کو اپنے کردار میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ پروفیسر سہارن رائے کو مکمل قائد کی صورت میں وہ ہمارے سامنے لے کر آتے ہیں۔ وہ بہترین قائد کی طرح مشکل وقت میں خود آگے آ جاتے ہیں اور طلبہ کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ تحریک کے دوران پولیس لاٹھی چارج کرنے لگتی ہے تو سہارن رائے جو کہ دل کے بھی مریض ہیں لیکن مقصد کے حصول اور طلبہ کو بچانے کی خاطر آگے جاتے ہیں اور پولیس کے تشدد کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن ہمت نہیں ہارتے۔

> ''تصور تصور جلدی آؤ۔ دیکھو پولیس نے تمہارے پروفیسر رائے کا کیا حشر کر دیا ہے۔'' میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے افشین کے پیچھے دوڑ پڑا۔ ٹی وی کی سکرین پر ہجوم تھا۔ پروفیسر رائے کی پیشانی سے دھل دھل خون بہہ رہا تھا۔ ان کے سر کے لمبے بال خون میں بھیگ کر چہرے سے چپک رہے تھے پولیس کے لاٹھی چارج نے پیشانی پر گہرے زخم لگائے تھے۔
>
> ایک لمحے کے لئے میرا دل رک گیا۔ ''نہیں یہ ظلم ہے ظلم ہے۔'' میں چیخا۔ افشین نے سہارا دے کر مجھے صوفے پر بٹھایا۔''(۵۳)

پروفیسر سہارن رائے کوئی عام اُستاد نہیں تھے بلکہ وفا کرنے والے اُستاد تھے۔ یہی ان کا گناہ تھا۔ جس کی وجہ سے انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔

"ماں وہ مشینی پروفیسر نہیں تھے۔ وہ تعلیم اور معاشرے کا تعلق سمجھتے تھے۔ وہ کہا
کرتے تھے یہ ہم سب کا معاشرہ ہے۔ اس کی تعمیر میں سب کا ہاتھ ہونا چاہیے۔ ماں وہ
عدلیہ بحالی تحریک کے ہر اول دستے میں تھے۔ حکومت نے ان پر بغاوت کا مقدمہ
بنایا ہے۔"(۵۴)

بہترین قائد کی خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی مشکل میں پھنس جائے۔ ریاست کے پہرے دار انہیں ٹارچر کریں تو اپنی جان بچانے کے لئے دوسروں کو نہیں پھنساتا بلکہ خود ہی مقابلہ کرتا ہے جیسا کہ پروفیسر سہارن رائے نے کیا:

"ہاں یار تصور بتا رہا تھا ان پر پریشر ڈالا جا رہا ہے کہ وہ ان طلبہ کے نام بتا دیں جو ان
کے ساتھ پمفلٹ کی تیاری میں شریک تھے۔ لیکن پروفیسر رائے نے ابھی تک منھ
بند رکھا ہے۔۔۔

"لیکن بینش! سر رائے تو بیمار ہیں انہیں تو قانونی طور پر ہسپتال میں ہونا چاہیے۔" میں
نے کہا

"جس ملک میں عدالتوں کے منصف قید ہوں وہاں قانون کو کون پوچھتا ہے؟" بینش
کی آواز میں برہمی تھی۔"(۵۵)

پروفیسر سہارن رائے میں ایک بہترین قائد کی تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں، انھیں ہر طرح سے ٹارچر کیا گیا، تفتیش کے مختلف طریقے برتے گئے لیکن انھوں نے اپنے مقصد کو سامنے رکھا اور ایک عظیم قائد کی طرح ڈٹے رہے۔ پروفیسر سہارن رائے کو کمزور کرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں:

"سنا ہے بلب کی تیز روشنی میں انہیں جگایا جاتا ہے تاکہ ان کی نیند پوری نہ ہو سکے۔
کبھی مسلسل کئی گھنٹے کھڑا رکھا جاتا ہے۔ یہ سب ان کے اعصاب توڑنے کے
ہتھکنڈے ہیں۔"

"کب تک؟ وہ آخر کب تک اس تشدد کا مقابلہ کریں گے؟" میں نے کہا

"امتثال! سر رائے دوسروں کو بچانے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار
ہیں۔" بینش کی آواز میں یقین تھا۔

میں نے سوچا "سگریٹ، چائے، کتاب کے بغیر سر رائے کی زندگی کیسی ہوگی؟"

"بہت خالی بہت ادھوری بہت بے کیف۔"(۵۶)

پروفیسر سہارن رائے پر زندگی تنگ کر دی گئی ان کی ملاقاتیں بھی بند کر دی گیئں لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ خود پر ہونے والے مظالم کا کچھ یوں ذکر کرتے ہیں۔

"مجھے زندگی سے کاٹ دیا گیا ہے۔
سورج کب طلوع ہوتا ہے اور کب غروب ہو جاتا ہے۔۔۔۔
میں معافی نامے پر دستخط کر دوں اور آئندہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے تائب ہو جاؤں تو فوری رہائی ممکن ہے میں سوچتا ہوں میں کسی سیاسی جماعت میں شامل نہیں ہوں۔ میں تو صرف اس ملک میں آزاد عدالتیں اور آزاد منصف چاہتا ہوں۔ آزاد عدالتوں معزول ججوں کی بحالی کا مطالبہ بغاوت کے زمرے میں کیسے آ گیا؟" (۵۷)

عظیم قائد اپنی زندگی سے نہیں بلکہ اپنے مقصد سے محبت کرتا ہے۔ پروفیسر سہارن رائے نے بھی اسی طرح مقصد کے پیش نظر اپنی جان دے دی لیکن مقصد سے پیچھے نہیں ہٹے اور اپنے بعد ان خوابوں کو پورا کرنے کے لیے نئی نسل تیار کر گئے۔ انھوں نے اپنے ادھورے خوابوں کے پورے کرنے والوں کو آخری بار جب دیکھا تو اس وقت شدید تکلیف میں تھے اور ساتھ ساتھ پُر سکون بھی:

"میرے پاؤں کے نیچے لکڑی کے بوسیدہ تختے چرچرا رہے ہیں۔ درد کی ٹیسوں سے دوہرا ہو کر میں تختوں پر گر گیا ہوں۔ شاید میں مر رہا ہوں۔ میں آخری بار امتثال کو دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے اپنے دامن کے پھول دکھاتی ہے۔ نیلے پیلے بنفشی پھول۔ میں حیران ہوتا ہوں یہ تو میرے خواب تھے۔ پل کا آخری تختہ ٹوٹ رہا ہے۔ لیکن امتثال نے میرا کام آسان کر دیا ہے۔ میں اس کے دامن میں اپنے خواب دیکھ سکتا ہوں۔
میری زندگی کے آدھے ادھورے خواب۔" (۵۸)

پروفیسر سہارن رائے کو اپنی زندگی سے زیادہ اپنے خوابوں کی فکر تھی جو انھوں نے اپنی آنکھوں میں سجائے تھے۔ ایک قائد کی طرح جان کی پروا نہیں کی اور اپنے خوابوں کے رکھوالے دیکھ کر سکون کا سانس لیا اور گہری نیند سو گئے:

اب آنے والے زمانوں کی کشت میں بوئے جائیں گے۔
نئے موسموں میں نئی ہوا کے ساتھ

نئے رنگوں، نئی کونپلوں، نئے برگ وبار کے ہمراہ

اب میں آسانی سے مر سکتا ہوں۔

میرے خواب محفوظ ہیں۔

اب ان کی حفاظت امتثال کے ذمہ ہے۔"(۵۹)

پروفیسر سہارن رائے کا قائدانہ چہرہ طلبہ کے لیے ایک نصیحت کی طرح ہے۔ شاہد صدیقی نے پروفیسر کو جن مشکلات سے لڑتے ہوئے اپنے عزم کی پختگی کا مظاہرہ کرنے والا بنا کر پیش کیا ہے، بلاشبہ یہ کسی لیڈر کی شخصیت میں ہی وارد ہو سکتی ہیں۔ پروفیسر رائے کی ساری جدوجہد Struggle مقصدیت سے بھرپور ہے۔ وہ یا تو اپنے طلبہ کو سکھانا چاہتے ہیں یا پھر ان کے سینے میں قومیت پرستی کا دل دھڑکتا ہے۔

ج) منتخب ناولوں میں اُستاد بطور قائد: مجموعی و تقابلی جائزہ

راہنمائی انسان کی فطری ضرورت ہے، یوں تو انسان کو وقت بہت کچھ سکھا دیتا ہے مگر انسان کی خواہش کی تکمیل با قاعدہ سیکھنے سے ہی ممکن ہے۔ ہم اپنے آس پاس رونما ہوتی تبدیلیوں سے بھی بہت کچھ سیکھتے ہیں، البتہ جستجو کی تشنگی ختم ہونا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ دنیا کی تاریخ میں قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں دیکھیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک بڑے قائد کی موجودگی ہی کسی قوم کو بڑا بناتی ہے اور کسی ایک بڑے لیڈر کی کمی کسی قوم کو اندھیروں میں دھکیل دیتی ہے۔

ایک لیڈر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ مجموعی سوچ کو تبدیل کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جن اقوام کو عظیم راہنما میسر آئے تو انھوں نے اپنی اقوام کو بھی بامِ عروج تک پہنچایا۔ عرب کے بدوؤں کو سرورِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت ملی تو وہ اقوامِ عالم کے لیے راہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے کے قابل ہو گئے، بعینہٖ دیگر اقوام۔

ایڈولف ہٹلر، نپولین بوناپارٹ، موہن داس گاندھی، محمد علی جناحؒ، علامہ اقبالؒ، نیلسن منڈیلا اور بہت سے دوسرے لیڈروں نے اپنی تگ و دو سے اپنی اقوام کی زندگی میں نئی روح بخشی۔ جس طرح مذکورہ بالا شخصیات نے اپنی کوششوں کے بل بوتے پر اپنی اقوام کو تقویت دی، بالکل اسی طرح معاشرہ میں ایک اُستاد کی حیثیت ہے، جو اگر اپنی شخصیت میں قائدانہ خصوصیات کا حامل ہو تو کچھ عجب نہیں کہ بحیثیت مجموعی کسی قوم کی سوچ کو تبدیل کیا جا سکے۔ ایک اُستاد با قاعدہ طور پر ایک قائد کی حیثیت سے اگر اپنے طلبہ میں جذبہ حب

الوطنی، آگے بڑھنے کا جذبہ، پروان چڑھنے کی لگن، ترقی اور کامیابی تک پہنچنے کا جذبہ اجاگر کرنے میں کامیاب ہو جائے تو یہ کہنا عجب نہیں کہ ان طلبہ میں سے ہی اس قوم کی باگ ڈور سنبھالنے والے میسر آ جائیں۔

اُستاد بطور قائد ایک بحث بناتے ہوئے ہم نے فہیم اعظمی کے ناول ''جنم کنڈلی'' بانو قدسیہ کے ناول ''راجہ گدھ'' شاہد صدیقی کے ناول ''آدھے ادھورے خواب'' اور انیس ناگی کے ناول ''دیوار کے پیچھے'' کے کرداروں میں موجود اساتذہ کے کردار میں سے قائدانہ صلاحیتوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔

''جنم کنڈلی'' کا ماسٹر تو خود تو بہت کم سامنے آتا ہے مگر اس میں روایتی پن سے لے کر جدت پسندی تک کے تمام روپ عیاں ہوتے ہیں، وہ مختلف ادوار کی یاترا کرواتے ہوئے مختلف شخصیات سے بھی ملواتا ہے تاکہ قارئین کو ان کی پسندیدہ شخصیات یا ان کے پسندیدہ ادوار کو قریب سے دیکھنے کا موقع میسر آئے۔ ''راجہ گدھ'' میں موجود پروفیسر سہیل کی قائدانہ صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر اس کی شخصیت کے منفی پہلو اسے باقاعدہ قائد بننے میں مانع ثابت ہوتے ہیں۔ یوں پروفیسر سہیل کی شخصیت عمومی رتبے سے آگے نہ بڑھ سکی۔

انیس ناگی کے ناول ''دیوار کے پیچھے'' میں موجود اُستاد کے روپ میں معاشرے کے ان اساتذہ کا چہرہ دکھایا گیا ہے جو کہ قائدانہ صلاحیتوں سے مالا مال ہونے کے باوجود مناسب مواقع اور سازگار ماحول میسر نہ آنے کی بنا پر کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ معاشرے کی ستم ظریفی اور رحم و کرم پر پڑے ان اساتذہ کو نہ تو سوسائٹی نے کبھی مقام دیا اور نہ ہی ان کی حیثیت سمجھنے کی کوشش کی ہے، یوں کہہ لیا جائے اس پیغمبری پیشہ کو اپنانے کی پاداش میں گمنامی کے اندھیروں میں چلتے گئے۔ شاہد صدیقی کے ناول ''آدھے ادھورے خواب'' کے مرکزی کردار نبھاتے ہوئے اُستاد کو دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہمارے معاشرے کے انقلابی اساتذہ ہیں جو بہر حال اپنے طلبہ کے زور بیان کے بل بوتے پر انقلاب کی طرف دھکیلنے میں مصروف عمل ہیں۔

بحیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو چاروں ناولوں میں موجود کرداروں کی شخصیات میں تضاد ہے۔ ہر کہانی جس طرح مختلف ہے بعینہ ہی ان کے کردار بھی مختلف حیثیتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ان سب کرداروں کو ہم اپنے آس پاس موجود شعبہ تدریس سے منسلک لوگوں میں محسوس کر سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سیّد احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، (جلد چہارم) الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۲۹۲۹

۲۔ محمد عبد اللہ خان، خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص۵۹۷

۳۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص۳۰

۴۔ ایضاً، ص۵۶۳

۵۔ محمد امین بھٹی، محمد ثقلین بھٹی، اظہر اللغات، اظہر پبلشرز، لاہور، ص۷۴۰

۶۔ القرآن الحکیم، سورۃ الاحزاب، آیت ۲۱

۷۔ اقبال علامہ، کلیاتِ اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ص۳۰۶

۸۔ ملک اشفاق، ارسطو حیات، فلسفہ اور نظریات، بک ہوم، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۲۲

۹۔ ایضاً، ص۹۰

۱۰۔ محمد اکرام حسین، محبتوں کے درمیاں، احسن پبلی کیشنز، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء ص۱۷۹-۱۸۰

۱۱۔ مولانا الطاف حسین حالی، دیوان حالی، نامی پریس، کانپور، ۱۸۹۳، ص۱۱۲

۱۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا، تخلیقی عمل، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۸۵

۱۳۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۲۳۷-۲۳۸

۱۴۔ ایضاً، ص۲۴۰

۱۵۔ ایضاً، ص۲۹۴

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ایضاً، ص۲۹۶

۱۹۔ ایضاً، ص۲۹۷

۲۰۔ ایضاً، ص۴۱۸-۴۱۹

۲۱۔ ایضاً، ۲۰۵-۲۰۶

۲۲۔ ایضاً، ص۲۰۸

۲۳۔ ایضاً، ص۲۰۸-۲۰۹

۲۴۔ اقبال علامہ، کلیاتِ اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ص۳۱۶

۲۵۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۱۱

۲۶۔ ایضاً، ص۱۰۷

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ ایضاً، ص۱۰۷-۱۰۸

۳۰۔ ایضاً، ص۱۰۸

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ ایضاً، ص۱۴۳

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ ایضاً، ص۱۵۰

۳۵۔ ایضاً، ص۱۵۰-۱۵۱

۳۶۔ ساغر صدیقی، دیوانِ ساغر صدیقی، خیام پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۱۱۶

۳۷۔ فہیم اعظمی، جنم کنڈلی، الباقریہ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص۴۷

۳۸۔ ایضاً، ص۱۱۸

۳۹۔ سبط حسن، ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص۲۶۱

۴۰۔ فہیم اعظمی، جنم کنڈلی''ص۱۴۴

۴۱۔ ایضاً، ص۳۹

۴۲۔ شاہد صدیقی، آدھے ادھورے خواب (بیک ٹائٹل)، جہانگیر بکس، فیصل آباد، ۲۰۰۹ء

۴۳۔ القراان الحکیم، البقرۃ، آیت۱۲۹

۴۴۔ شاہد صدیقی، آدھے ادھورے خواب، ص۱۹

۴۵۔ ایضاً، ص۱۹-۲۰

۴۶۔ ایضاً، ص۲۱

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ ایضاً، ص۲۸-۲۹

۴۹۔ ایضاً، ص۲۹

۵۰۔ ایضاً، ص۴۳

۵۱۔ ایضاً، ص۴۳-۴۴

۵۲۔ ایضاً، ص۱۱۹-۱۲۰

۵۳۔ ایضاً، ص۱۴۲

۵۴۔ ایضاً

۵۵۔ ایضاً، ص۱۵۱

۵۶۔ ایضاً

۵۷۔ ایضاً، ص۱۵۹-۱۶۰

۵۸۔ ایضاً، ص۱۶۲

۵۹۔ ایضاً، ص۱۶۲-۱۶۳

باب چہارم

منتخب ناولوں میں معلّم بطور دوست کی پیشکش کا مطالعہ

اُستاد وہ نہیں جو کتاب پڑھائے، اصل اُستاد تو وہ ہے جس کی بات دلوں کو چھو جائے۔ اُستاد کیلئے صرف پڑھا دینا، بتا دینا کافی نہیں ہے، عمل کیلئے اکسانا، قوتِ ارادی پیدا کرنا، عزم پیدا کرنا، قوت پیدا کرنا اُستاد کا کام ہے۔ اُستاد میں بہت سی دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان چند خصوصیات کا ہونا بھی از حد ضروری ہے کہ اُستاد کو اپنے مضمون پر مکمل مہارت ہو، مضمون پر مہارت کا مطلب ہے، اپنے مضمون کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق بنانے کی صلاحیت ہو۔ دوسرے یہ کہ اُستاد میں بات چیت یعنی ابلاغ کی صلاحیت فطری طور پر موجود ہو۔ ابلاغ کی صلاحیت کا مطلب ہے کہ اُستاد اپنی بات اپنے شاگردوں کو سمجھا سکے۔ اگر وہ طلبہ کی سطح پر آکر نہیں سمجھا سکتا تو وہ جتنا بڑا اُستاد کیوں نہ ہو، اس کا مطلب ہے کہ اس میں بات چیت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سماجی ذہانت پائی جائے، یعنی اس میں ملنساری کی صلاحیت ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُستاد کو انسانوں کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ ملنسار ہی نہیں ہو گا تو کام نہیں کر پائے گا۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اگر اُستاد میں جذبہ نہیں ہے تو وہ اُستاد نہیں ہے۔ اسی لئے علامہ اقبال نے اس کی نشاندہی کچھ یوں کی ہے:

تُونے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے (1)

اگر اُستاد کے پاس قوت جذبہ نہیں ہے تو وہ قوت جذبہ دے بھی نہیں سکتا، یہ پڑھانے والی چیز نہیں ہے، یہ دینے والی چیز ہے۔ پانچویں خصوصیت اُستاد کیلئے یہ ہے کہ اس میں سیکھنے کا شوق ہو۔ جو خود پیاسا ہو وہ دوسرے کو پیاسا بنا سکتا ہو۔ جس کو خود ہی پیاس کا ادراک نہ ہو، وہ دوسروں کو کیا شعور دے گا۔ چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہو، کیونکہ اُستاد وہ شخص ہوتا ہے جس نے قوم کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود آگے بڑھنے والا نہیں ہے تو کبھی بھی آگے بڑھنے والے لوگ پیدا نہیں کر سکے گا۔ تعلیم تو

اندر کی تبدیلی کا نام ہے۔ دراصل اُستاد علم نہیں دیتا بلکہ اُستاد علم کی پیاس دیتا ہے۔ اگر پیاس مل جائے تو علم خود چل کر آتا ہے، یعنی پیاس اتنی طاقتور چیز ہے کہ اگر آپ علم کے پیاسے ہیں تو پھر آپ اس کیلئے کتاب بھی خریدیں گے، اس کیلئے ورکشاپ میں جائیں گے، اس کیلئے سفر بھی کریں گے، اس کیلئے اسکالرشپ کا بھی کھوج لگائیں گے۔ اس کیلئے ہجرت بھی کریں گے، اس کیلئے بڑی سے بڑی قیمت بھی ادا کریں گے، اس کیلئے پیدل بھی چلیں گے۔ آج بھی آپ اگر قابل اُستاد بن جائیں تو لوگ پلکیں بچھائیں گے۔ آپ آج اپنا مقام بنانے کو تیار ہوں، دنیا سرنگوں ہونے کو تیار ہو جائے گی۔ لیکن اگر آپ ہی طے نہ کریں تو جتنا مرضی مرتبہ بڑھ جائے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اُستاد دراصل قوم کے محافظ ہیں کہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور اُن کو مُلک کی خدمت کے قابل بنانا اِنہی کے سپرد ہے، سب محنتوں سے اعلیٰ درجے کی محنت اور کارگزاریوں میں سب سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری معلّمین کی ہے۔'' اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اُستاد علم کا سرچشمہ ہوتا ہے، تب ہی قوموں کی تعمیر و ترقی میں اساتذہ کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ تعمیرِ انسانیت اور علمی ارتقاء میں اُستاد کے کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدائے آفرینش سے نظامِ تعلیم میں اُستاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

اُستاد کی عظمت کے بیان کے لیے اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے کہ تمام انبیاؑء بشمول حضرت محمّد اللہ ﷺ کو معلّم بنا کر بھیجا گیا۔ تو ذرا سوچیے کہ وہ انسان، جو ہمیں شعور و آگہی، تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتا ہے، معاشرے میں اُٹھنے بیٹھنے کے قابل بناتا ہے، مہذّب دنیا کے طور طریقے سکھاتا ہے اور سب سے بڑھ کر ہماری کامیابیوں پر ہم سے زیادہ خوش ہوتا ہے، اُس اُستاد کا مقام و مرتبہ کتنا بلند ہو گا۔

اگر معاشرے کی فلاح و بہبود، جذبہ انسانی کی نشوونما اور افراد کی تربیت سازی کی بات کی جائے تو یہ بھی اُستاد ہی کی بدولت ہے اور اسی وجہ سے اُستاد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، وہ اپنے شاگردوں کی تربیت میں ہمہ وقت لگا رہتا ہے تاکہ انہیں ثمرور بنایا جا سکے۔ تدریس وہ پیشہ ہے، جسے صرف دینِ اسلام میں ہی نہیں ، دنیا کے ہر مذہب و معاشرے میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا علم میں اُستاد کی قدر و منزلت جس طرح اسلام میں اجاگر کی گئی ہے کسی اور مذہب میں نہیں۔ اللہ رب العزت نے قرآن پاک میں نبی اکرم ﷺ کی شان بحیثیت معلّم بھی بیان کی ہے۔ اُستاد کے ادب و احترام اور عظمت کے حوالے سے اکابرین کے بیان کردہ متعدد واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اساتذہ کی عزت اور ادب و آداب کے بغیر انسان کبھی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔ اُستاد اگر معلّم ہونے کے ساتھ ساتھ دوست بھی ہو تو درس و تدریس کے

دوران ایک ایسا تعلیمی ماحول پیدا ہوتا ہے جو طلبہ کو اُستاد کے مزید قریب کر دیتا ہے اور سیکھنے سکھانے کا عمل بخوبی سرانجام پاتا ہے۔

الف) اُستاد بطور دوست کی مثالی خصوصیات

تدریس موثر ہدایات پر مبنی ایک ایسا علم ہے جو مسلسل ارتقاپذیر ہے اور جس کی تکمیل تقریباناممکن ہی ہے۔ کیونکہ موثر تدریس کے لئے جہاں متبادل تدریسی نظریات کو سیکھنے کا عمل جاری ہے وہیں سکھانے کے لئے سیکھنے کا عمل بھی جاری و ساری ہے۔ مہذب معاشروں میں بہترین اساتذہ اتفاقاً منصہ شہود پر رونما نہیں ہوتے ہیں بلکہ یہ اعلیٰ شخصی ترغیب و تحریک کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اساتذہ دوران تدریس مقصد تعلیم سے انحراف نہ کریں وہ معلومات کے انبار لگانے اور معصوم ذہنوں کو اپنے علمی تجربہ سے مرعوب کرنے کے بجائے ان کے ذہنوں کو تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنے کی کاوش کریں۔ اساتذہ مروجہ ،مقررہ،روایتی و مقید تعلیمی نظریات پر کاربند رہنے کے بجائے اپنی تدریس میں نئے ، تعلیمی نظریات،رجحانات اور جدید طریقہ تعلیم کو رواج دینے کے ساتھ ساتھ طلبہ کی بہتر زندگی اور ترقی کے لئے اساتذہ کو شخصی طور پر متحرک وفعال بنا کر طلبہ اور اساتذہ کے درمیان دوستانہ علمی ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو پیشہ تدریس کا سب سے اہم عنصر گردانا گیا ہے۔

موجودہ دور میں تعلیم و تدریس پر جدید تحقیقات کی روشنی میں گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اساتذہ جو تدریس اور معلومات کی ترسیل کے اہم ستون تصور کیے جاتے ہیں آج جدید معلومات سے ہم آہنگ ہو کر ''اکتساب برائے تدریس'تدریس برائے اکتساب'' یعنی سیکھو، سکھانے کے لئے اور سکھاؤ سیکھنے کے لئے، کے نظریہ پر عمل پیرا ہیں۔ تدریس کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے جس میں موثر تدریس کے لئے معلّم کی بہتر طریقہ ہائے تدریس سے آگہی، تعلیمی منصوبہ بندی، مضمون اور سبق کی منصوبہ بندی ، منظم انداز میں منصوبے پر عمل پیرائی ،طلبہ کے رویوں اور برتاؤ میں بہتری کے لئے خاص حکمت عملی کو وضع و اختیار کرنا،طلبہ کی ترقی کی مناسب جانچ و نگرانی کے لئے تعین قدر (امتحان) کی معلومات سے آگہی، تعلیم سے وابستہ افراد، تنظیموں اور دیگر محکموں سے روابط ،اپنے مضمون اور موضوع پر عالمانہ عبور ،پیشہ وارانہ صلاحیتوں میں اضافہ اور بہتری کے لئے سعی و جستجو وغیرہ جیسے عناصر شامل ہیں۔ درس و تدریس کو موثر اور مفید بنانے کے

لئے ان شعبوں پر توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ ان شعبہ جات پر توجہ مرکوز کرنے کے لئے ایک ایسا نظام تعلیم تشکیل دیا جاسکتا ہے جو موجودہ نظام کو موثر، مربوط اور منظم بنانے میں معاون ہو گا۔

ایک اُستاد کا کام بہتر طریقے سے معلومات کی منتقلی یا ترسیل نہیں ہے بلکہ تدریس کا مقصد بچوں میں علم کے حصول کی ترغیب و تحریک پیدا کرنا، رہنمائی ور ہبری کے ذریعے بچوں میں خود کار اکتساب کی فضاء کو فروغ دینا ہے۔ اُستاد کی پیدا کردہ تحریک کے زیر اثر طلبہ حصول علم میں معاون تمام وسائل کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔

اُستاد کی شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک بحیثیت انسان اور دوسرا بحیثیت معلّم۔ بحیثیت انسان اُستاد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تعلیمی اور سماجی ماحول سے استفادہ کرکے طلبہ کی پوشیدہ صلاحیتیں بھرپور طریقے سے اجاگر کرے۔ معلّم کی حیثیت سے ایک اُستاد کو سماجی (Social) اور انسان دوست مزاج کا حامل ہونا ضروری ہے۔ سماجی شخصیت کا حامل اور انسان دوست اُستاد ماحول پر با آسانی اثر انداز ہوتا ہے۔ ایسے اساتذہ اداروں کے ماحول اور نظام کو طلبہ کے لئے دلکش بنادیتے ہیں۔ دوسروں کو علم سے آراستہ کرنے، فہم و ادراک پیدا کرنے کا فن، سیکھنے اور سمجھنے کے مقابلے میں قدرے مشکل کام ہوتا ہے۔ اُستاد کا اپنے طلبہ کے ساتھ رشتہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے جب وہ اپنے طلبہ کے ساتھ دوستانہ رشتہ قائم کرلیتا ہے تو وہ ایک اُستاد اچھا موثر اور کامیاب معلّم بن سکتا ہے اور اپنے پیشے سے انصاف کر سکتا ہے۔

مثالی اُستاد میں چند خوبیوں کا ہونا ضروری ہے جن میں ایک یہ ہے کہ اُستاد مضمون و موضوع پر مہارت اور عبور رکھتا ہو، درس و تدریس اور تعلیم و تعلم میں طلبہ پر اثر انداز ہونے والا سب سے اہم عنصر اُستاد کا مضمون و موضوع کا علم اور اس پر مکمل عبور ہوتا ہے۔ مضمون و موضوع کے علم پر عبور و مہارت پیشہ تدریس سے وابستہ افراد کے لئے نہایت ضروری تصور کی جاتی ہے، طلبہ کے نزدیک علم و فن کا دوسرا نام اُستاد کی شخصیت ہوتی ہے۔ بہترین معلّم اپنے علم میں وسعت پیدا کرتے ہوئے اُستاد طلبہ میں اکتساب کی فضاء کو پروان چڑھاتا ہے، ایک کامیاب اُستاد کا ہر سبق درس و تدریس میں تنظیم و ترتیب پیدا کرنے سے ہی تدریس کا فن پارہ بنتا ہے۔

ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اساتذہ مختلف تعلیمی و تدریسی وسائل کے استعمال کے ذریعہ موضوع اور مضامین کی معلومات میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہیں۔ موضوع اور مضمون کے بارے میں مزید معلومات اور حقائق کے لئے غیر نصابی کتابوں کے مطالعہ سے اپنے علم میں اضافہ کریں۔ ہر

وقت اپنے طلبہ کو معیاری اور بہترین معلومات اور عمدہ علم کی فراہمی کو یقینی بنانا ایک اُستاد کا اہم فریضہ ہوتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ مطالعہ کی عادت کو مستقل اپنا شیوہ بنالیں۔ مطالعہ کی کثرت کی وجہ سے، علم میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ اساتذہ کے لئے تو مطالعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

اُستاد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے ہم پیشہ دوستوں، ساتھیوں، مضامین کے ماہرین، اپنے مضمون میں مہارت اور کمال رکھنے والے افراد سے گفتگو کو رواج دیں، تاکہ علم میں اضافے ہونے کے ساتھ ساتھ موضوع کے گنجلک و پیچیدہ نکات کی تفہیم آسان ہو جائے۔ اساتذہ کے لیے معلومات کی ذخیرہ اندوزی، مطالعہ کی وسعت، جہاں موضوع و مضمون کے دانشورانہ تفہیم و تجزیہ کا ذریعہ بنتی ہے وہیں طلبہ کی استعداد، ذہنی صلاحیت کے مطابق ذہانت کے فروغ، درس و تدریس کی تنظیم و ترتیب میں معاون ثابت ہوتی ہے۔اس کے علاوہ اساتذہ اپنی پیشہ وارانہ اور مضمون کی معلومات میں تجدید اور اضافے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھیں۔ اپنے مضمون میں نکھار پیدا کرنے والے نئے تعلیمی، علمی و سائنسی رجحانات سے واقفیت حاصل کریں تاکہ طلبہ میں تدریس کو آسان اور مفید بنایا جاسکے۔ پڑھائے جانے والے موضوعات کا وسیع اور گہرا علم رکھتے ہوئے اساتذہ تمام طلبہ میں اکتساب کو یقینی طور پر پروان چڑھاسکتے ہیں۔

موضوع کے متعلق وسیع معلومات کی وجہ سے درس و تدریس میں سہولت پیدا ہوتی ہے اُستاد کا اپنے مضمون میں دسترس کی وجہ سے اختراعی طریقے ہائے تدریس اور تخلیقی تدریس کو جگہ دیتے ہوئے علمی نظریات کو استحکام اور پائیداری فراہم کرتا ہے۔ اُستاد کا اپنے مضمون اور موضوع پر جس قدر عبور اور دسترس ہوگی اتنا ہی طلبہ کے ذہنوں پر خوش گوار اثرات پیدا ہوں گے۔ مضمون پر کمال اور عبور اُستاد کی عظمت و عزت کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ طلبہ مضمون میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ صحت مند اکتساب و تعلیمی ماحول کے لئے اُستاد کا اپنے مضمون اور موضوع پر مکمل عبور اور دسترس ضروری ہے۔ ایک اُستاد میں اگر یہ خوبیاں موجود ہیں تو وہ بلاشبہ ایک عظیم اُستاد بھی ہوتا ہے اور ایک اچھا دوست بھی۔

ب) منتخب ناولوں کے کرداروں کا تجزیہ:

i۔ پروفیسر سہیل بطور دوست "راجہ گدھ"

جب ہم "راجہ گدھ" کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے مرکزی کردار پروفیسر سہیل کو بھی فلسفی اور راہنما ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے طلبہ کے ساتھ دوستوں جیسا رویہ بھی روا رکھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ طلبہ

کے ساتھ شغل کرنا، چہل قدمی کرنا، گپ شپ کرنا، لین دین کرنا، اور ہنسی مذاق کرنا ان میں روایتی طور پر پایا جاتا تھا۔ اس امر میں پسند اور ناپسند کا دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہاں لیکن کچھ پسندیدہ طلبہ کے ساتھ انتہائی حد تک تعلقات استوار کرنے کو بھی معیوب نہ سمجھتے تھے۔ اپنے احساسات بانٹنا، شام کے وقت طلبہ کے ساتھ لطف اندوز ہونا، سگریٹ نوشی کرنا اور ادھر ادھر کی باتوں کے دوران طلبہ کی ذہنی استعداد کا اندازہ لگانا اور مشفقانہ یا دوستانہ انداز اپناتے ہوئے ان سے راز تک اگلوانا بھی پروفیسر سہیل کی عادت میں شامل تھا۔ شادی شدہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی زندگی خود تو کسی دائرے کا مرکز نہیں تھی لیکن اس کی باتوں میں مرکزیت ضرور نظر آتی ہے۔

"راجہ گدھ" کے پروفیسر سہیل جس طرح بہت سی دیگر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اپنے آپ کو مکمل سمجھتے تھے بالکل اسی طرح درست وقت پر بات کرنا اور اپنی ہر بات کا درست جواب لینا اس کی عادت کا حصہ تھا، پھر چاہے وہ جواب مثبت ہو یا منفی۔ وہ آدھی ادھوری بات کے قائل نہ تھے۔ حتی کہ طلبہ کے ساتھ ہر طرح کے معاملات انتہائی واضح انداز میں پایہ تکمیل تک پہنچانا مناسب سمجھتے تھے۔ دوستانہ رویہ میں میری اس بات کو دلیل ان کی یہ گفتگو ہے:

> "میرے پاس فی الحال موٹر سائیکل ہے کسی لڑکے کو ضروری کام ہو تو وہ مجھ سے چابی مانگ سکتا ہے۔ لیکن جو وعدے کے مطابق موٹر سائیکل واپس نہیں کرے گا وہ دوبارہ اپنے اس حق کو استعمال نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی لڑکی بس سٹاپ پر کھڑی ہو اور ہاتھ دے کر مجھے روکے میں اسے لفٹ دوں گا۔ لیکن اگر وہ مجھے موٹر سائیکل موڑنے کو کہے گی تو میں اسے اتار دوں گا ____ اب آپ سب مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کے پاس کیا کچھ ہے ____ جو آپ دوسروں کے ساتھ Share کر سکتے ہیں اور کس حد تک۔"(۲)

کسی بھی تحریر کے مصنف کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تحریر میں روایتی ضروریات کو مد نظر رکھے تاکہ یہ نہ محسوس ہو کہ وہ تحریر کسی دوسری دنیا کے منظر نامے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہر سطح پر جزئیات اسی منظر نامہ کے متعلق ہوں جس سے منسلک کی گئی ہیں۔ کیوں کہ جس دور کی عکاسی مقصود ہو گی لازمی طور پر جزئیات بھی اسی سے متعلق ہوں گی۔

بانو قدسیہ کی تحریر میں یہ سب خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں کیوں کہ وہ زمان و مکان کو ملحوظ رکھتی ہیں وہ بخوبی جانتی ہیں کہ کس جگہ پر مکالمہ مقصود اور کہاں پر بیانیہ، کبھی کبھار وہ منظر کو اپنے جائزہ سے بیانیہ کے ذریعے پیش کرتی ہیں تو کہیں کرداروں کے درمیان مکالمہ ہوتا ہوا دکھا کر اپنی تحریر کا حسن بڑھاتی ہیں۔

"راجہ گدھ" میں بھی اکثر جب وہ پروفیسر سہیل کو ایک دوست کے روپ میں پیش کرنا چاہتی ہیں تو بیانیہ سے ہٹ کر مکالمہ کو ہی ذریعہ اظہار بناتی ہیں۔ تاکہ اپنے قاری کو اپنے شعور کے متعلق آسان رسائی دے سکیں۔ پروفیسر سہیل اور اس کے شاگردوں کے درمیان ملاقات کا عمومی منظر یوں پیش کرتی ہیں کہ قاری کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جائے کہ پروفیسر سہیل کس بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کے عادی ہیں، ملاحظہ ہو:

"تمہیں کیا ہوا ہے____ محبت ہو گئی ہے کسی سے___" انہوں نے انگریزی میں سوال کیا۔

میں چپ رہا۔

"نشہ وشہ تو نہیں کرتے ناں۔"

میں پھر بھی چپ رہا۔

"نوکری ملی کہیں؟"

"درخواست دی ہوئی ہے_____ سر۔"

"سرور کا تکلف چھوڑو_____ تمہیں ہوا کیا ہے؟"(۳)

"راجہ گدھ" کے مقبول ہونے کی ایک وجہ اس کے کرداروں کا اپنے آپ سے تضاد بھی ہے ایک ہی چہرہ بیک وقت مختلف روپ دھارتے ہوئے اپنے خالق کی ہنر کاری کا ثبوت بنتا ہے۔ اس ناول کے چار بنیادی کرداروں کو مختلف اوقات میں مختلف حالتیں اور چہرے اوڑھتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ بانو قدسیہ جس طرح سے معصوم طلبہ کے، کلاس کے پہلے دن کے بعد سے، ان کی شخصیت میں پے در پے تبدیلیاں لے کر آتی ہیں یہ ان کی خاص خوبی ہے۔ معصوم چہروں سے معاشرے کے تلخ ترین حلیوں تک پہنچاتے ہوئے وہ معاشرے کا حقیقی چہرہ بھی آشکار کرتی ہیں۔

"راجہ گدھ" کے ذریعے بانو قدسیہ کسی ایک شخص، ایک پہلو، یا ایک نظریہ کا احاطہ نہیں کرتیں، بلکہ اس میں ایک عہد سمو دیتی ہیں۔ طلبہ کی معصومیت سے نحوست کے سفر میں جابجا ہمیں پروفیسر سہیل کا کردار نظر آتا ہے۔ بظاہر طلبہ کی بھلائی کرتے ہوئے ان کو اپنے قریب کرتا ہے اور پھر اپنے پسندیدہ طلبہ کے قریب

تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ پروفیسر سہیل سارے کرداروں کے لیے بہت اچھا بھی نہیں اور سارے کرداروں کے لیے ہی بہت برا بھی ثابت نہیں ہوتا یا یوں سمجھ لیں پروفیسر سہیل کے آس پاس گھومتے ہوئے کردار اس کی شخصیت میں سے اپنے اندر کی اچھائیاں اور برائیاں تلاش کر لیتے ہیں۔ پروفیسر سہیل بہر حال اپنے آپ کو ممکنہ طور پر دوستانہ رکھتا ہے اور دوستانہ ماحول میں اپنے طلباء کے ساتھ گھلنے ملنے کی کوشش کرتا ہے، جو کہ انتہائی مثبت بھی ہے۔ یہاں پر قابل ذکر گفتگو قیوم کے ساتھ ہے جو کہ اس کا پرانا طالب علم ہے پروفیسر سہیل اس کے ساتھ کس بے تکلفی سے بات کرتا ہے یہ اس کی دوستانہ رویہ کا عکاس ہے:

> ''مجھ سے ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ ورزش کرتے رہو اور سوچتے رہو تم کو کس چیز کی تلاش ہے؟ ___ اپنی یا خدا کی ___ اس کے علاوہ ہر تلاش بیکار ہے۔''
>
> ''کسی کی بھی نہیں ___ مجھے۔۔۔۔''
>
> ''اوئے پینڈو تمہارا کوئی قصور نہیں۔ پہلے انسان یا اپنی تلاش کرتا تھا یا خدا کی ___ اس کی جستجو بے نام نہیں ہوتی تھی۔ اب تمہارے جیسا ماڈرن پڑھا لکھا گدھا یہ بھی نہیں جانتا کہ اسے تلاش کس چیز کی ہے، کیسے مان لے کہ کہیں کوئی سادہ سا علاج ہے جو اسے سکون دے سکتا ہے ___ اچھا چند دنوں کے لیے تجربے کے طور پر یوگا کرلو گے؟''(۴)

پروفیسر سہیل اپنے طالب علم کے ساتھ پُر خلوص دوستانہ ماحول پیدا کرنے کے لیے ان کی ذاتی زندگی میں بھی دخل اندازی کرتے ہیں اس کی بیماری کو ٹھیک کرنے کے لیے اسے یوگا کرنے کا کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسے اُستاد کی خوبی ہے جو اپنے طلبہ کے دلوں میں رہتے ہیں۔ جب اُستاد اور طالب علم کے درمیان ذاتی زندگی پر بات ہو اور اُستاد اپنے طلبہ کی بات کو توجہ سے سنتا ہے اور اسے مفید مشورے بھی دیتا ہے۔ جماعت میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ جب اساتذہ اپنے طلبہ کے ساتھ ان کی ذاتی زندگی میں شامل ہوتے ہیں تو اُستاد اور شاگرد میں زیادہ انسیت ہونے کے ساتھ ساتھ سیکھنے سکھانے کے عمل میں بھی بہتری پیدا ہوتی ہے۔ ''راجہ گدھ'' میں ایسے ہی پروفیسر کے اپنے طلبہ کے ساتھ تعلق کو دکھایا گیا ہے:

> ''میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں باقاعدگی سے ___ ہر روز ___'' میں نے التجا کی۔۔۔
>
> میں اس کے خلاف ہوں ___ میں spoon feeding کے خلاف ہوں۔ تم میں اپنے السر سے لڑنے کی قوت ہونی چاہیے ۔ میں تمہیں اپنی بیٹری خود چارج کرنے کا

طریقہ آنا چاہیے۔ مجھے ملتے رہے تو میں تمہیں تباہ کر دوں گا____ مجھے ایک وجہ سے تم سے بڑی دلچسپی ہے قیوم ___ میں تمہارے لئے اپنے دل میں محبت رکھتا ہوں۔ ‘‘[۵]

پروفیسر سہیل اور قیوم کے درمیان بانو قدسیہ نے دوستانہ ماحول پیدا کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اُستاد کا اپنے طلبہ کے ساتھ مشفقانہ رویہ درس و تدریس کے عمل میں انتہائی ضروری ہے۔ پروفیسر سہیل جس طرح قیوم کے ساتھ بے تکلفی کا مظاہرہ کرتا ہے اسی وجہ سے طلبہ اور اساتذہ میں جو جھجک ہوتی ہے وہ باقی نہیں رہی۔ سہیل بلا جھجک اپنی ہر بات پروفیسر سہیل سے کرتا ہے۔ قیوم کے ساتھ دوستانہ رویہ ہونے کے وجہ سے وہ اپنے اُستاد کو ملنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ اپنی ہر راز کی بات بھی وہ پروفیسر سہیل سے کرنے کا خواہاں رہتا ہے۔ دو دوستوں کے درمیان جب بے تکلفی کا ماحول پیدا ہوتا ہے تو وہ ایک دوسرے کو جہاں دیکھتے ہیں یا جب ان کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اپنے دل کی بات کہنے کے لیے کئی کئی گھنٹے کی طویل نشست کو بھی کم ہی سمجھتے ہیں۔ ’’راجہ گدھ‘‘ میں پروفیسر اور قیوم کے درمیان ہونے والی گفتگو اس بات کی عکاسی کرتی ہے پروفیسر سہیل سگریٹ نوشی کرتے ہوئے اپنے طالب علم سے محو گفتگو ہے:

’’ماڈرن لباس میں یوگا کرنے والا پروفیسر بڑی چمکدار مسکراہٹ کے ساتھ اٹھا اس نے بل ادا کیا۔ بیرے کو ٹپ کے ساتھ مسکراہٹ کا عطیہ دیا____ پھر سارے میں مسکراہٹ کی سرچ لائٹ ڈالی اور لمبی چوڑی تمہید کے بغیر کہا، ’’اچھا قیوم پھر ملیں گے؟۔۔۔‘‘

اس نے پلٹ کر میری جانب نگاہ نہ ڈالی اور ہوٹل کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔‘‘[۶]

ہر ذی عقل اور ذی شعور یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی کسی سے رفاقت ہو اور ایسی رفاقت کہ جس میں وہ بے تکلفی سے اپنی تمام تر ضروریات اور خواہشات کو بانٹ سکے۔ اپنے جذبات و احساسات بلا جھجک اس کے ساتھ بیان کر سکے، یا پھر پریشانی، اداسی، بے چینی، بے قراری جیسے احساسات کے دوران اپنی سوچوں کو تقویت دے سکے۔ یہ ساری کیفیات نہ صرف انسانوں بلکہ دیگر مخلوقات کی ضرورت کا بھی حصہ ہیں۔

بانو قدسیہ نے ایک ماہر نفسیات کی طرح معاشرے کی نفسیات کے اس پہلو کو بھی پرکھتے ہوئے احاطہ تحریر میں لانے کی کوشش کی اور اپنے ناول ’’راجہ گدھ‘‘ میں مختلف کرداروں کے درمیان نفسیاتی اور جذباتی تعلقات پروان چڑھا کر اپنی تحریر کو فطرت کے قریب تر کر کے دکھایا ہے۔ اس ناول میں پروفیسر سہیل اگرچہ

ایک اُستاد کی حیثیت سے موجود ہے مگر اس کے دوستانہ رویہ کی عکاسی کلاس کے علاوہ بھی دیگر تمام جگہوں پر اپنے طلباء اور دوستوں کے لیے دکھائی دیتی ہے۔ پروفیسر سہیل اپنے طلباء کے ساتھ غیر معمولی طور پر دوستانہ رویہ رکھتے ہیں۔ ان کی خوشی اور غم یا دیگر معاملات میں ان کے ساتھ ایک اچھے دوست کی طرح برتاؤ کرتا ہے۔ راجہ گدھ کا کردار قیوم جب ریڈیو اسٹیشن پر انٹرویو دینے کے بعد واپس آکر پروفیسر سے ملاقات کرتا ہے تو اُستاد شاگرد ہونے کے باوجود ان دونوں کے درمیان دوستانہ گفتگو ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:

''میں نے تو ملنے سے منع کیا تھا!'' پروفیسر نے کہا۔

''میں آپ کو اپنے انٹرویو کے متعلق بتانا چاہتا تھا۔''

''کیسا رہا انٹرویو؟''

''ٹھیک ٹھاک۔''

''کون کون تھا بورڈ پر؟''

''آر۔ڈی لاہور تھا ____ ڈی جی صاحب تھے دو مقامی دانشور __'' میں نے جواب دیا۔

''کیا کچھ پوچھا تھا؟''(۷)

دوست ایک ایسا لفظ ہے جس میں ان گنت جذبات چھپے ہوئے ہیں ''راجہ گدھ'' میں دوستوں کے ذریعے ایسے واقعات جمع کرائے ہیں کہ قاری ہر لحظہ دوستی کی لذت محسوس کرتا ہے پروفیسر سہیل اپنے طلباء کے ساتھ ایسا دوستانہ رویہ اپناتے ہیں جیسے وہ بچپن سے ان کے ساتھ رہے ہوں، پروفیسر سہیل کا یہ رویہ ان کے طالب علموں میں احساس کمتری ختم کر دیتا ہے اور ان کے طلباء ان سے بے تکلفی سے باتیں کرتے ہیں، سگریٹ پیتے ہیں، نہر کنارے پاپولر کے درخت کے نیچے چہل قدمی کرتے ہیں۔

پروفیسر سہیل کا قیوم کی نوکری کے بارے میں اتنا متجسس ہو کر پوچھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان بے تکلفی ہے اور محبت بھی۔ قیوم اپنے دل کی بات صرف اور صرف اپنے اُستاد اور دوست سے ہی کرتا ہے۔ یہ ساری گفتگو اسی محبت اور دوستی کا نتیجہ ہے یہ گفتگو ملاحظہ ہو:

''نوکری مل گئی تو کر لو گے؟ ___'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''پتہ نہیں سر ___ میں آج کل گہری anxiety کا شکار ہوں۔۔۔''(۸)

بانو قدسیہ نے ناول میں کردار کے ذریعے اُستاد اور اس کے طلبہ کے درمیان دوستانہ رویہ کو اس قدر قریب کر دیا ہے کہ طالب علم اپنے اُستاد سے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتے ہوئے کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ بانو قدسیہ نے اپنے ناول میں اُستاد اور شاگرد کے درمیان فاصلے کو کم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ انھوں نے اس کے لیے پروفیسر سہیل کا انتخاب کیا ہے۔ ان کے ناول ''راجہ گدھ'' میں پروفیسر سہیل کا رویہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ طلبہ کے ساتھ دوستانہ اور ہمدردانہ رویہ طلباء کی ذہنی صلاحیتیں نکھارنے کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

پروفیسر سہیل اپنے طلباء کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے گپ شپ کے دوران سگریٹ کے کش بھی لگاتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے طلباء کی ذہن سازی بھی کرتے ہیں۔ یہ دوستانہ رویہ ہی ہے جس کی وجہ سے ایک اُستاد کے ساتھ اس کا طالب علم اس بے تکلفی سے باتیں کرتا ہے عموماً معاشرے میں ایسے اُستاد کم ہی ملتے ہیں جو اپنے طلباء سے محبت والا رشتہ ہمیشہ کے لئے قائم کر سکتے ہوں۔ بانو قدسیہ نے جہاں اور بہت سے نظریات پیش کیے وہیں انہوں نے حلال اور حرام کے نظریے کو ایک اُستاد اور شاگردوں کے درمیان مکالمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ قاری کے لئے سمجھنا انتہائی اہم ہے کہ حلال اور حرام کے بہت سے طریقے ہیں ان طریقوں کو انہوں نے ''راجہ گدھ'' میں بہت ہی انوکھے انداز میں بیان کیا ہے۔

بانو قدسیہ نے حرام اور حلال کا نظریہ پیش کرنے اور پھر اسے درست ثابت کرنے کے لیے ناول میں موجود کرداروں کو ایک دوسرے میں یوں پیوست کر دیا ہے کہ ایک کردار دوسرے کردار کے بغیر ادھورا ہے اور ساتھ ہی ان کرداروں کو مختلف جگہوں پر ملاقاتیں کرواتے ہوئے کہانی کو اس طرح آگے بڑھایا ہے کہ قاری کو تھکن کا احساس ہی نہیں ہوتا اور وہ سارے ناول کو ایک ہی نشست میں پڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ اس ناول کو مکمل پڑھ لیتا ہے تو وہ بانو قدسیہ کے نظریے جو انہوں نے حرام حلال کا پیش کیا ہے اچھی طرح سمجھ لیتا ہے بانو قدسیہ نے پروفیسر سہیل کو اپنے طلبہ کے ساتھ دوستانہ ماحول میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر سہیل اپنے طالب علم قیوم سے گپ شپ لگاتے ہوئے حلال و حرام کے نظریہ کی وضاحت کرتا ہے اور اپنے دوستوں کی طرح اسے سمجھاتا ہے اور اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے مختلف دلیلیں دیتا ہے ملاحظہ ہو:

> ''مغرب کے پاس حرام و حلال کا تصور نہیں ہے اور میری تھیوری ہے جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی genes کو متاثر کرتا ہے رزق حرام سے ایک خاص قسم کی Mutation ہوتی ہے جو خطرناک ادویات شراب اور

radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ رزق حرام سے جو genes تغیر پذیر ہوتے
ہیں وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ ناامید بھی ہوتے ہیں"(۹)

پروفیسر سہیل اور قیوم کی اس گفتگو میں حلال اور حرام کا نظریہ اپنے پورے زوروں پر ہے۔ پروفیسر سہیل اپنے طالب علم اور دوست کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ انسانوں میں جب یہ genes نسل در نسل سفر کرتے ہیں تو ان genes کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ رزق حرام سے ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے، قیوم یہ ساری باتیں سن کر حیران و پریشان ہو کر پروفیسر سہیل کا منہ تکنے لگتا ہے۔

پروفیسر سہیل نے قیوم کو مغرب والوں کے حلال و حرام کے بارے میں بتاتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم تکبیر پڑھ کر جسے حلال کرتے ہیں تو وہ تعجب سے دیکھتے ہیں۔ اور جب ہم عورت سے زنا نہیں کرتے، نکاح پڑھ کر اسے اپنے لیے حلال بناتے ہیں تو یہ سب باتیں مغرب والوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ پروفیسر سہیل بتاتا ہے کہ حلال و حرام کا تصور انسانی نہیں ہے، اس میں بہت بھید ہے گہرا بھید۔ اللہ نے حلال حرام کی حد سب سے پہلے بہشت میں لگائی تھی۔

پروفیسر سہیل سائنسی توجیحات بھی پیش کرتا ہے لیکن قیوم یہاں روایتی طالب علم کی طرح بات کو سمجھنے سے قاصر ہے قیوم کے دماغ میں حرام چیزیں وہ عام سی چیزیں ہیں جو ایک عام انسان کے دماغ میں ہوتی ہیں پروفیسر سہیل یہاں اپنے اس نظریے کو ثابت کرنے کے لئے حرام کے ذریعے سے کمائی ہوئی روٹی سے پیدا ہونے والے genes کے اثرات سے بھی آگاہ کرتا ہے اور اسی طرح حلال روزی سے پروان چڑھنے والے انسان کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔ دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو مکمل طور پر دوستانہ بحث ہے ملاحظہ ہو:

"بات کرنے والا ایک معمولی مشرقی آدمی ہے تمہارے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نیو
کیمپس پر چلنے والا ___ کہیں جو یہ نظریہ کسی مغربی فلاسفر کے منہ سے سن پاتے تو
فوراً قائل ہو جاتے ___ مائی ڈیر سٹوڈنٹ ___ حرام کیا ہے؟ وہ جس سے منع کیا
گیا ___ اچھے اور برے کا سوال نہیں ہے۔ صرف جو چیز منع فرمائی ہے اللہ نے وہ
حرام ہے اس لیے حرام و حلال کا جھگڑا سب سے پہلے جنت میں پیدا ہوا"(۱۰)

بانو قدسیہ نے حلال اور حرام کے تصور کو مغرب کے حوالے سے بھی پیش کیا ہے مغرب میں حلال نام کی چیز نہیں ہے اللہ تعالی کے حکم کے مطابق جو ہمیں حلال چیز کا بتا دیا گیا ہے وہ حلال ہے اور جس چیز کو

اسلام نے حرام قرار دیا ہے وہ ہر صورت میں حرام ہی ہے، حضرت آدم نے جو شجر ممنوعہ سے گندم کا دانہ کھایا، چوں کہ منع کیا گیا تھا اس لیے وہ حرام تھا، اچھے برے کا سوال نہیں تھا بس وہ جو منع تھا وہ حرام۔ آدمؑ کے جسم میں اس گندم کے دانہ کھانے کی وجہ سے ایک خطرناک تغیّر آیا۔ ان کے جسم میں Genes میں جس تغیّر سے اللہ نے ڈرایا تھا، اس وقت تک حضرت آدمؑ اور اماں حوا کے تمام خلیے صالح تھے ان کا نیوکلیس محفوظ طریقے سے ٹوٹتا ہے لیکن اب اس نیوکلیس میں چھپے ہوئے خلیے میں تبدیلی آئی، اب وہی خلیے جو صالح تھے اب لولے، لنگڑے، اندھے اور ناامید پیدا ہو کر آنے والی نسلوں میں منتقل ہو گئے، اسی دیوانہ پن کے پہلے آثار ہابیل اور قابیل کے جھگڑے میں واضح ہوئے۔

دیوانگی کی شدید شکل انسان کشی ہے، دیوانگی کی شکل میں ہونے والا پہلا قتل ہابیل اور قابیل کے درمیان جھگڑے سے نہیں ہوا تھا، یہ جھگڑا ان genes کی وجہ تھی جو حضرت آدم کے وجود میں شجر ممنوعہ کے کھانے کی وجہ سے ٹوٹے پھوٹے تھے۔ پھر یہی نسل در نسل منتقل ہوتا ہوا دوسری پود تک ورثہ میں آئے ہیں۔ خود رزق حرام کھاتے ہیں اور آنے والی نسلوں کو پاگل پن کی وراثت میں عطا کرتے ہیں۔

ان باتوں کو بانو قدسیہ نے پروفیسر سہیل اور قیوم کے درمیان دوستانہ رویہ کو پروان چڑھانے کے بعد بے تکلفی کے انداز میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے پروفیسر سہیل اپنے شاگرد کے ساتھ دوستوں کی طرح باتیں کرتا ہے اور کلاس میں دی گئی اسائنمنٹ کا تذکرہ بھی کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ قیوم کو حرام حلال کا فلسفہ سمجھا دیتے ہیں ملاحظہ ہو۔

> ”جو رزقِ حلال ہم اندر ڈالتے ہیں، اس کا بلڈ کمیسٹری پر مثبت اثر ہوتا ہے اور جو رزقِ حرام اندر داخل ہوتا ہے اس کا منفی اثر ہوتا ہے ہمارے لہو پر۔“
>
> ”یعنی ایک بوری آٹا جو حرام کی کمائی سے آیا ہے اور ایک بوری آٹا جو حلال کی کمائی سے آیا ____ ان کی بلڈ کمیسٹری مختلف ہو گی؟ جانے دیجیے سر۔“[۱۱]

حلال اور حرام کا نظریہ جس طرح بانو قدسیہ نے ”راجہ گدھ“ میں پیش کیا ہے وہ آسانی سے قاری کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ وہ اسے مختلف طریقوں سے ثابت بھی کرتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ جو شخص حرام کھائے گا اس کے لہو کی کیمیائی حالت مختلف ہو گی اور جو حلال کھائے گا اس کی مختلف۔ مغرب کا حوالہ دیتے ہوئے بتاتی ہیں کہ اگر مغرب کے پاس حرام حلال کا تصور ہوتا تو وہ کب کے پاگل پن کی اصل وجہ دریافت کر لیتے۔

پروفیسر سہیل حلال اور حرام کے نظریے کو آسان طریقے سے سمجھانے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں جس طرح دوستوں کی آپس میں بے تکلفی سے باتیں ہوتی ہیں پروفیسر سہیل اپنے طالب علم سے اسی طرح باتیں کرتے ہیں پروفیسر سہیل کبھی اسے باباجی کہہ کر بلاتے ہیں تو آگے سے قیوم انہیں جناب پروفیسر بقراط صاحب کہہ کر پکارتا ہے یہ اصل میں اُستاد اور شاگرد کے درمیان دوستانہ رویہ ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو مختلف القابات سے پکارتے ہیں:

> ”جناب پروفیسر بقراط صاحب ____ آٹا ایک مادی چیز ہے۔ اس کا جو کچھ بھی کیمیکل اثر ہو گا۔ دونوں حالتوں میں ایک سا ہو گا۔ کیونکہ ان دونوں میں ایک خاص مقدار تک کاربوہائیڈریٹ اور پروٹین وغیرہ ہوں گے۔“[۱۲]

”راجہ گدھ“ میں حلال و حرام کے نظریے کو اُستاد اور شاگرد کے درمیان گفتگو کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مثالوں کے ذریعے اسے ثابت بھی کیا گیا ہے۔ اُستاد اور شاگرد ایک دوسرے سے سوالات و جوابات بھی کرتے ہیں جس سے یہ نظریہ واضح ہو جاتا ہے جیسے کہ پروفیسر سہیل اپنے شاگرد کو سمجھانے کے لیے کہتا ہے کہ پانی پر جب دم کیا جاتا ہے تو دم کئے ہوئے پانی کی تاثیر بدل جاتی ہے جس پانی میں سے بجلی گزرتی ہے تو اس سے اس میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ پھر اپنے شاگرد کو مخاطب کرتا ہے کہ گدھے آدمی جس وقت آٹا رزق حرام سے خریدا جاتا ہے اس میں ایک منفی چارج جمع ہو جاتا ہے۔ پھر پروفیسر اس نظریے کو مزید واضح کرنے کے لیے کہتا ہے کہ اچھا یہ بتاؤ دادا کا گناہ پوتے تک کیسے پہنچتا ہے؟ مفلسی کیسے سفر کرتی ہے انسانوں میں؟ قیوم اپنے اُستاد اور دوست کی باتوں کو توجہ سے سنتے ہوئے اس کے جواب میں کہتا ہے کہ دیوانہ پن موروثی ہو سکتا ہے اور ماحولیاتی بھی لیکن موروثی کی وجہ وہ نہیں ہے جو آپ بیان کر رہے ہیں۔

اُستاد اور شاگرد کے درمیان سوال و جواب اور بحث ساتھ ساتھ چل رہی ہے جس سے حرام اور حلال کا نظریہ بھی بانو قدسیہ پروفیسر سہیل کی زبان سے بیان کروا رہی ہیں اور قیوم ان کا شاگرد ہے لیکن وہ تجسّس میں ہے اور اس نظریہ کو بار بار رد کر رہا ہے پروفیسر سہیل سائنس اور مذہب دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلتا ہے اور کہتا ہے کہ مذہبی اعتقادات میں بھی اصل میں سائنس ہے۔ پروفیسر سہیل نے قیوم کے کندھے پر زور ڈال کر پوچھا، کہاں ہے تمہارا باپ؟ وہ سمجھے گا، وہ جانتا ہو گا کہ اللہ علیم ہے اور اس نے گوشت پر تکبیر پڑھنے کا حکم دیا ہے تو کوئی وجہ تو ہو گی۔ پروفیسر پروفیسر سہیل اور قیوم کی گفتگو ملاحظہ ہو۔

”سور کا کا گوشت حرام ہے۔ اس پر سو تکبیریں پڑھ لو، یہ حرام ہی رہے گا۔ جو یہ کھائے گا وہ اپنی Gene mutation کا خود ذمہ دار ہو گا۔“

”کیا اسی لئے عورت کو بھی حلال کر کے استعمال کرنے کا حکم ہے؟۔۔۔۔“

” پلیز آپ عورت کو بکرے کے گوشت سے نہ ملائیں۔ آج کل ویمن لبریشن چل رہی ہے کسی عورت نے سن لیا تو وہ آپ کو حلال کر دے گی ___ بلکہ حرام کر دے گی۔“(۱۳)

پروفیسر سہیل اپنے شاگرد اور دوست قیوم کے درمیان بے تکلفانہ گفت و شنید بہت دور تک چلی جاتی ہے وہ اپنے شاگرد قیوم کو یوگا کرواتے ہیں تاکہ السر ختم ہو جائے اور قیوم کی زندگی میں السر نام کی چیز باقی نہ رہے۔ بانو قدسیہ مہارت کے ساتھ کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے کرداروں کو بہترین انداز میں استعمال کرتی ہیں۔ پروفیسر سہیل اور قیوم نہر کنارے خود رو گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر سہیل نے ایک پتھر اٹھا کر بہتے پانی میں پھینکا۔ تھوڑے سے چھینٹے اڑے اور پانی بھی اپنی روانی پر قائم ہو گیا۔ حلال و حرام کے نظریے کو مزید واضح کرنے کے لیے سہیل قیوم سے سوچنے کا کہتا ہے۔ یہ حرام و حلال کا بڑا ظالم چکر ہے، کبھی کبھی رزق حرام سے فرداً فرداً پاگل پن پیدا نہیں ہوتا بلکہ قوم کی قوم دیوانی ہو جاتی ہے۔ پھر قیوم کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ عورت کے معاملے میں تو بہت زیادہ احتیاط برتنی چاہیے۔ قیوم اور پروفیسر کے درمیان جب یہ نظریہ اپنے زوروں پر تھا تو قیوم اجازت لے کر جانے لگتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

”اچھا سر میں پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔“

بھاگو۔۔۔ بھاگو۔۔۔ تم صاحبزادے کبھی حاضر نہیں ہوں گے۔ ہم جیسے پروفیسروں کے پاس کبھی کوئی حاصل نہیں ہوتا۔۔۔ تم لوگ ایسی لڑکیوں کے پاس وقت گزارنا چاہتا ہوں گے جو تمہیں ___ اچھا چھوڑو This is your age ۔“

اس نے اپنی کھوپڑی پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا ___ ”یہاں۔۔۔ بہت بڈھا ہو گیا ہوں قیوم۔۔۔ دعا کرنا میری تھیوری کامیاب ہو جائے۔“

” ہو گی جی ان شاءاللہ ضرور ہو گی۔“(۱۴)

ناول کے تمام کرداروں کے درمیان الفت اور ساتھ ہی دیوانگی کی علامات بھی ظاہر کر دی گئی ہے۔ سیمی کو آفتاب سے عشق ہوتا ہے اور پھر پروفیسر سہیل آفتاب کو غلط سمت دیکھا کر سیمی سے دور کر دیتا

ہے جب کہ سیمی آفتاب کے پیار میں دیوانگی کی حدوں تک پہنچ چکی ہے قیوم بھی سیمی سے پیار کرتا ہے لیکن سیمی کو آفتاب کے علاوہ کوئی انسان نظر ہی نہیں آتا یہاں تک کہ اسے پروفیسر سہیل بھی نہیں۔

پروفیسر سہیل پر بھی دیوانگی کے اثرات نظر آتے ہیں وہ بھی سیمی شاہ سے لاشعوری طور پر عشق کر بیٹھتا ہے اور اس کا اظہار نہیں کر پاتا آفتاب سے سیمی کو دور کرتا ہے اور قیوم سیمی سے جنسی تعلق استوار کرتا ہے اور سیمی اس تعلق میں آفتاب کو ہی یاد کرتی ہے۔ بالآخر سیمی اسی دیوانگی کی حالت میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے قیوم بھی دیوانہ ہو جاتا ہے اور پروفیسر سہیل بھی اسی عشق لاحاصل میں زندگی گزارتے ہیں۔ پروفیسر سہیل سیمی سے محبت کا اظہار قیوم کے سامنے کرتا ہے اور اپنے نظریہ جو حلال و حرام کا ہے اس کے لیے کتاب چھاپنے کا ذکر یوں کرتا ہے:

> "میں علم کے بل بوتے پر ایک بڑا حسین و جمیل فرعون بن گیا تھا۔ اندر سے مجھے کسی کی پروا نہ تھی۔
>
> "اب ہے ____ سر۔"
>
> " ہاں ہے ___ اپنی تھیوری کی ____ یاد ہے رزق حرام کی تھیوری۔"
>
> " خدا کے لئے اسے دوبارہ نہ دہرانے لگ پڑیں۔"
>
> " نہیں اس کی چنداں ضرورت نہیں میں اپنی کتاب چھپنے کے لئے امریکہ کے ایک پبلشر سے بات کر آیا ہوں۔ رزقِ حرام کی تھیوری پر تم سے بات ہو گی لیکن بزبان انگریزی ہو گی۔"(۱۵)

پروفیسر سہیل اور قیوم کے درمیان بے تکلفی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قیوم اپنی ہر بات اپنے اُستاد پروفیسر سہیل کے ساتھ کرتا ہے اور سہیل بھی ہر بات قیوم سے کرتا ہے۔ قیوم اور پروفیسر سہیل کی چہل قدمی اس وقت وارث روڈ پر ہو رہی تھی اور ساتھ ساتھ گفتگو بھی۔ وارث روڈ پر پورا چاند نہ جانے کیوں طلوع ہو گیا تھا اور ایک کوٹھی کی تیسری منزل سے پورا نکلا ہوا پروفیسر سہیل اور قیوم کی باتیں سنے جا رہا تھا۔ پروفیسر سہیل قیوم کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ میں اتنے سارے علم کے باوجود بھی سیمی شاہ میرے دل میں گھستی چلی گئی۔ میرے دل میں اگر علم کا تکبر اتنا نہ ہوتا تو شاید میں اسے لے اڑتا۔ لیکن علم خود ایک حجاب ہے۔ پروفیسر سہیل سمجھتا تھا کہ سیمی شاہ زانو ٹیک دے گی لیکن ابھی میں اپنے علم کو آگ نہیں لگا سکا تھا کہ آفتاب درمیان میں کود آیا۔ اس کے ساتھ وہ سب کچھ تھا جو کوئی عورت پسند کرتی ہے۔ سیمی

شاہ اچانک کالج کیوں چھوڑ گئی؟ اور آفتاب نے اس سے شادی کیوں نہ کی؟ ان ساری باتوں کے جواب وہ قیوم کو خود دیتا ہے ملاحظہ ہو:

”وجہ میں تھا____ میں بُرا آدمی نہیں ہوں۔Devil نہیں ہو مائی ڈیئر سٹوڈنٹ____ لیکن اتنے سارے علم کے باوجود میں اپنےEmotions پر قابو نہ پاسکا____ ان دنوں میں اس قدر شدید حسد کا شکار ہو گیا کہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے ___ آفتاب مجھ سے بہت متاثر تھا۔ میں طالب علموں کو متاثر کئے بغیر اپنی نوکری کو حلال نہیں سمجھتا۔“

”بس دو شامیں آفتاب نے میرے ساتھ ہوٹل میں گزاریں اور پھر اسے سیمی سے محبت تو رہی ہو گی لیکن وہ سیمی سے شادی پر رضامند نہ رہا__ میں نے اسے بددل کر دیا سیمی سے۔“(۱۶)

بانو قدسیہ نے اپنے ناول "راجہ گدھ" میں سیمی شاہ کی محبت کو ایک ایسے نقطہ نظر سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے جس میں استاد ایک اچھے دوست کے روپ میں آتا ہے، لیکن ایک ہی وقت میں وہ نہ تو ایک اچھے دوست کا روپ دھار سکتا ہے نہ استاد کا۔ آفتاب اور سیمی شاہ کی محبت کو ختم کرنے اور آفتاب کی شادی کے پیچھے پرفیسر سہیل ہی کارفرما نظر آتا ہے۔ سیمی شاہ کو آفتاب کے علاوہ کوئی شخص نظر نہیں آتا وہ صرف اور صرف آفتاب ہی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہے، جب آفتاب کی شادی ہو جاتی ہے تو اسے اپنے آپ سے بھی گھن آنے لگتی ہے۔ اب اس کی زندگی بے معنی ہے۔ سیمی کی خودکشی کے پیچھے کارفرما عناصر میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے گھر والوں کے پاس اولاد کو دینے کے لیے وقت نہیں ہے اور دوسرا آفتاب سے محبت۔ ناول ”راجہ گدھ“ میں مزید اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے قیوم حیران ہوتا ہے اور پوچھتا ہے کہ آپ وجہ تھے، قیوم کو وہ ساری باتیں یاد آرہی تھی جو شادی کے دن آفتاب نے قیوم سے تالاب کے کنارے کی تھی وہ ساری گفتگو پروفیسر سہیل سے کی تھی۔ ان دونوں کی گفتگو ملاحظہ ہو:

”ہاں میں ہی وجہ بنا____ میں___ سیمی میری طرف شروع شروع میں مائل تھی لیکن آفتاب کو میں نے یقین دلایا کہ وہ کسی ایک مرد کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی۔ سیمی میں محبت تو تھی وفا نہیں تھی۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟۔۔۔ شکر ہے جوانی میں Guilt کا زہر رگوں میں اتر گیا ورنہ اپنے عہد کا پورا شیطان ہوتا۔ مجھے بھی اس Guilt نے بڑی مار دی ہے۔"(۱۷)

یہ بانو قدسیہ ہی ہیں جنھوں نے عمرانیات کی کلاس کے پہلے دن سے شروع کر کے اسے مختلف مراحل میں کرداروں کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھا ہے وہ پروفیسر سہیل ہی کی زبانی حلال و حرام کا نظریہ پیش کرتی ہیں اور پھر یہی اُستاد اور شاگرد کے درمیان دوستانہ رویہ اور تعلق خوبصورتی کے ساتھ پروان چڑھاتی ہیں اور پھر پروفیسر سہیل ہی کی زبانی اس کے عشق کا اظہار قیوم کے سامنے کروا کر قیوم کو حیرانی میں ڈال دیتی ہیں۔

پروفیسر سہیل کا کردار ہمہ جہت اپنی موجودگی کے اثرات مرتب کرنے والی شخصیت کا حامل ہے۔ اس کے آس پاس موجود لوگ منفی یا مثبت لیکن اس کی شخصیت سے اثر پذیر ضرور ہوتے ہیں۔ اس کے طلبہ کو ہی لے لیجیے کہ دیوانگی کی وجہ کو تلاش کرنے والی کلاس کس طرح خود دیوانہ پن کا شکار ہو جاتی ہے یہ کرداروں کو بیان کرنے اور درست جگہ پر استعمال کرنا بانو قدسیہ کا ہی ملکہ ہے انہوں نے کلاس کے طلباء کو اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا ہے کہ ان کے درمیان محبت اور دوستی کا رشتہ بھی قائم ہے۔

پروفیسر سہیل کے ہاں ہمہ گیریت ہے کیوں کہ اس کے ساتھ ہونے والی ہر گفتگو کے لیے اس کے پاس کچھ نہ کچھ ضرور موجود ہے۔ پروفیسر سہیل کا دوستانہ رویہ اسے اپنے جیسے دیگر ہم منصبوں سے ممتاز بناتا ہے لیکن اس کی شخصیت کے منفی پہلو لازمی طور پر اس کے شعبہ کو داغ دار کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

"راجہ گدھ" کی دیگر خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کا مرکزی کردار ایک طرف تو اپنی شخصیت کے جادو میں دوسروں کو جکڑتا دکھائی دیتا ہے اور دوسری طرف خود کسی عشق میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو فسوں گری میں اسیر کر بیٹھتا ہے۔ ناول کے تمام کردار ایک دوسرے کے ساتھ کڑے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سب کی منزلیں ایک دوسرے سے مختلف بھی نظر آتی ہیں۔ کلاس کے آغاز سے لے کر انجام تک تمام کردار بخوبی کہانی کو آگے بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ پروفیسر سہیل کا طلبہ کے ساتھ دوستانہ رویہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

ii۔ پروفیسر بطور دوست "دیوار کے پیچھے"

زندگی کے سفر میں یا یوں کہیں کہ موت کے انتظار میں ہم جتنا وقت دنیا پر گزارتے ہیں اس دوران کچھ لوگ ہمارے ساتھ مخلص، ہمدرد، خیر خواہ اور بہترین دوست ہوتے ہیں۔ ہم ان کی باتوں کو دوسروں کی

باتوں پر ترجیح دیتے ہیں لیکن ہمیں اس بات کا اندازہ بہت دیر بعد ہوتا ہے کہ وہ صرف ہمیں آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر ہماری کامیابی کا گراف اوپر جاتا دیکھ کر ہمارے دوست اور خیر خواہ بنے ہوئے تھے۔ جونہی ہماری کامیابی ناکامی کی طرف سفر شروع کرتی ہے تو وہی دوست جو خود کو ہمارے خیر خواہ ظاہر کرتے تھے ایک ایک کر کے غائب ہونے لگ جاتے ہیں۔ تب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کون مخلص تھا اور کون مطلبی۔ عروج کے دنوں میں تمام تعلق والے ایک دوسرے سے بڑھ کر ہماری خدمت میں لگے ہوتے ہیں لیکن جب ہمیں اصل میں خدمت اور ایثار کی ضرورت ہوتی ہے تو ڈھلتے سورج کی طرح یہ رشتے بھی ڈھل چکے ہوتے ہیں۔ برا وقت انسان کو بہت کچھ سکھا کر چلا جاتا ہے۔ برا وقت انسان کو وہ سبق سکھاتا ہے جو کسی کالج، یونیورسٹی یا مدرسہ میں نہیں سکھایا جاتا۔ برا وقت آپ کو وہ علم پڑھاتا ہے جو ہمیں کتابوں میں ملتا ہے اور نہ ہی کوئی اُستاد سکھاتا ہے، یہ آنکھوں کو ایسی پہچان سکھاتا ہے جو کوئی اُستاد یا مدرسہ بھی نہیں سکھا سکتے۔

برا وقت انسان کو کندن بناتا ہے، یہ پہلے گھائل کرتا ہے اور پھر مرہم بن جاتا ہے کامیابی کا ہر راستہ مشکلات کی بھٹی سے ہو کر گزرتا ہے یہ ہمارے ہاتھ میں تجربات اور شعور کی وہ کنجی دیتا ہے جس سے ہر تالہ کھل جاتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ زندگی میں سب کچھ کسی نہ کسی وجہ سے ہوتا ہے غلط ہوتا ہے تا کہ ہم صحیح کی قیمت جان سکیں، لوگوں کے اصلی چہروں سے شناسائی ہو سکے اور کبھی کبھی اچھی چیزیں کھو جاتی ہیں تا کہ ہمیں ان سے بہتر چیزیں مل سکیں۔ اہل عقل کبھی اپنی ہار اور ناکامی کا رونا نہیں روتے بلکہ ان کو حل کرنے کے لیے دل و جان سے کوشش کرتے ہیں۔ عقل مند انسان خاموش، ساکت، دیوار پر لکھی ہوئی تحریر سے نصیحت حاصل کر لیتا ہے جب کہ جاہلوں کے لیے لاکھوں کتب بھی کسی اہمیت کی حامل نہیں ہوتیں۔

انیس ناگی نے ایک ایسے اُستاد کو اپنے ناول میں شامل کیا ہے جس کی شعوری سطح تو کافی بلند ہے لیکن وہ معاشرے کی چال چلن کو نہیں سمجھ سکا وہ معاشرے کو اپنے پڑھے ہوئے طریق کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے لیکن ڈھال نہ سکا اور خود معاشرے کے ہاتھوں بے بس ہو کر، مجبور ہو کر معاشرے میں ایسے افراد کا روپ دھار لیتا ہے جنہیں وہ شروع سے ہی سخت ناپسند کرتا رہا ہے۔ کالج سے اسے خطرناک آدمی کہہ کر نکال دیا گیا ہے اور وہ اپنے حالات کو رونا رو رہا ہے اور کوئی اس کی سننے کو تیار نہیں۔

> ”پچھلے پندرہ بیس دن سے میرا کوئی پرسان حال نہیں ہے میں ہی کسی کو ملنے جاؤں تو کوئی ملتا ہے وگرنہ کوئی مجھے ملنے نہیں آتا میری افادیت ختم ہو چکی ہے اگر چہ پہلے بھی بطور لیکچرار میں چنداں افادیت کا حامل نہیں تھا تاہم کھوٹے پیسے کی طرح امتحانوں

کے دنوں میں کام آتا تھا اب سرے سے میری افادیت معدوم ہو چکی ہے۔۔۔۔ میرا ہر فعل میرے اندر چھپے کسی جرم کو ہوا دے رہا ہے میرے اندر انتقام اور زندگی کو فتح کرنے کے بھیانک منصوبے جنم لے چکے ہیں ان کے سائے بتدریج گہرے ہوتے جارہے ہیں۔"(۱۸)

انیس ناگی نے معاشرے میں موجود انتہائی حساس طبیعت لوگوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ ناول "دیوار کے پیچھے" ایک ایسے شخص کے گرد گھوم رہا ہے جو معاشرے کی بے حسی کا شکار ہوا ہے پروفیسر کی طبیعت فساد پر آمادہ ہوتی ہے، اسے ہر چیز میں اختلاف نظر آتا ہے لیکن وہ خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کرتا ہے صبر کا دامن تھامے رکھتا ہے۔ صبر اور قناعت سے زندگی جینا چاہتا ہے موت کے بعد کی خاموشی سے ڈرتا ہے کیوں کہ موت کے بعد کی خاموشی پر ہر کوئی خاموش ہے، موت کے انتظار میں انسان بہت سی تکالیف کو سہتا بھی ہے اور برداشت بھی کرتا ہے۔ انہی مشکلات سے وہ جینے کا فن سیکھتا ہے یا ہمت ہار بیٹھتا ہے:

"ثانوی تعلقات نے مجھے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا ہے مجھے پہلے بہت سی چیزوں سے اختلاف تھا لیکن ہمیشہ مصالحت اور مفاہمت کو ترجیح دیتا تھا لیکن اب میری طبیعت آمادہ فساد معلوم ہوتی ہے۔۔۔ قناعت بے بسی کا اخلاقی نام ہے قناعت کا مطلب ہے موت، جسے میں سردست قبول کرنا چاہتا ہوں میں آسائش نہیں چاہتا میں صرف حق زیست کی آسائش چاہتا ہوں میں زندہ رہنے کا یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا کیوں کہ موت کے بعد کی خاموشی کے بارے میں ہر کوئی خاموش ہے میرا رجعت کے وعدہ پر یقین نہیں کیونکہ ہر شہر کے شہر خموشاں کا رقبہ ہر روز بڑھتا جارہا ہے۔"(۱۹)

انیس ناگی نے اپنے ناول "دیوار کے پیچھے" میں ہمارے معاشرے کے اہم ترین افراد کی ذلت و رسوائی کو قلمبند کیا ہے۔ ہمارے معاشرے کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے اہم ترین افراد یعنی "اساتذہ"۔ انیس ناگی نے معاشرے کے معماروں پر ہونے والی ظلم و زیادتی کو پیش کیا ہے پروفیسر کے ذریعے ایسے لوگوں کی نار کنے والی سوچوں کا جابجا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی محرومیوں کو بھی قلم کی نوک پر لا کر ان کا اظہار کیا ہے۔ معاشرہ بہت بے رحم ہے اور ظالموں کا ساتھ دیتا ہے۔

انیس ناگی نے پاکستانی معاشرے کی بھرپور عکاسی کی ہے جہاں غریب اُستاد کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ صرف پیپروں کے دنوں میں نمبر لگوانے کے لیے اُستاد کو تحفے تحائف کے ساتھ ساتھ ان کی چاپلوسی بھی کی جاتی ہے۔ معاشرے میں ایسے افراد کی کوئی عزت نہیں کرتا جس کے ساتھ کوئی مطلب نہ ہو سوائے چند لوگوں کے، اور وہ لوگ بہت کم ہیں۔ اُستاد جو کہ معاشرے کی جان ہے جس کے بغیر مہذب معاشرے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس کے ساتھ بھی بہت بہیمانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ ایک اُستاد جب وہ دوران ڈیوٹی اپنے فریضے سر انجام دے رہا ہو تب تو سبھی اس کی عزت کرتے ہیں لیکن جب وہی اُستاد کسی وجہ سے برطرف ہو جاتا ہے یا کر دیا جاتا ہے تو اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا، یہی حال ''دیوار کے پیچھے'' ناول میں موجود پروفیسر کے کردار کا ہے۔ پروفیسر جب اپنی انا کو توڑتا ہے تو بھی اس پر رحم نہیں کیا جاتا بلکہ اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بچپن کا دوست ہونے کا دعویدار آج صرف اور صرف پروفیسر کی کسمپرسی کی حالت دیکھ کر اس پر رحم نہیں کرتا بلکہ اپنا مطلب سامنے رکھ کر اسے ملازمت کی دعوت دیتا ہے۔ پروفیسر کے ساتھ روا رکھے جانے والا سلوک کسی بھی معاشرے کی انتہائی گراوٹ کی علامت ہے۔ ایسے کردار کو انیس ناگی نے اپنے ناول'' دیوار کے پیچھے'' میں یوں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''کیا حال ہے پروفیسر؟ کون ہو تم؟ مَیں احمد اوہ تم، مدتوں بعد شکل دکھائی ہے۔؟
> ''دیکھ لو زمانہ بدل گیا ہے کہ چار سال تک ایک ہی سکول میں پڑھے۔۔۔ ایک دو محلے دار کچھ دنوں سے چہ میگوئیاں کر رہے ہیں انہیں کرنے دو، کس بات پر؟ اور ایک دو دفعہ میں نے بھی خود دیکھا ہے رات کے وقت تمہارے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک موٹر رکتی ہے اور کوئی نامعلوم شخص گھر کے باہر مشکوک طریقے سے گھومتا ہے۔ میری نگرانی کی جا رہی ہے میں مشکوک شخص ہوں۔''[۲۰]

احمد نے جب پروفیسر کو پریشان دیکھا تو اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک مخلص دوست کے روپ میں اس کے سامنے اپنے آفس کی بات کرتا ہے اور ساتھ ہی اسے یہ کہتا ہے کہ پروفیسر سمجھنے کی کوشش کرو جب رزق کا ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ انسان کے لیے اور راستے کھول دیتا ہے۔ اس پر پروفیسر پوچھتا ہے کہ تمہارے وکیل کا نام کیا ہے؟ احمد بھانپ لیتا ہے کہ سادہ طبیعت کا مالک یہ پروفیسر اس کے جال میں آسانی سے پھنس چکا ہے۔ کہتا ہے میرے وکیل کا نام خواجہ علم دین ہے اور وہ گلبرگ میں رہتا ہے وکیل تو صرف نام کا ہے اس کا سارا کام میرے اشاروں پر چلتا ہے۔ یہ سنتے ہی پروفیسر کہتا ہے کہ تم تو پھر کافی

پیسے بنالیتے ہوگے ؟ یار بس اللہ کی دین ہے دس سال میں دو مکان بنالیے ہیں۔ بارہ جماعت فیل ہونے کے باوجود مجھے سارا فوجداری اور دیوانی قانون حفظ ہے ، تعلیم کو کون پوچھتا ہے۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو پھر تو تم بڑے زبردست آدمی ہو۔ احمد اور پروفیسر کی گفتگو کچھ اس انداز میں آگے بڑھتی ہے اور احمد پروفیسر کو نوکری کی آفر کرتا ہے:

> ”پروفیسر یہ خواجہ صاحب تو نام کے وکیل ہیں سارا کام میرے ہاتھ میں ہے دراصل میں نے انہیں وکیل کے طور پر ملازم رکھا ہوا ہے، سارا کام میں ہی کھینچ کر لاتا ہوں خواجہ صاحب تو صرف پیش ہوتے ہیں باقی ہر چیز کی طنابیں میرے ہاتھ میں ہوتی ہیں، پروفیسر، تم اب بزنس کیوں نہیں کرتے ؟۔۔۔ آج کل ہمارا کام کافی بڑھ گیا ہے، خواجہ صاحب ایک ٹاوٹ نما منشی رکھنا چاہتے ہیں میں نے انہیں صاف کہہ دیا کہ اگر کسی اور کو رکھا تو میں ساری پریکٹس الٹ دوں گا پروفیسر تم ڈرافٹنگ وغیرہ کر سکتے ہو نا؟“(۲۱)

اُستاد کی زندگی بھی معاشرے میں موجود دوسرے انسانوں کی طرح ہوتی ہے وہ بھی معاشرتی تقاضوں کے ساتھ ہی زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے زندگی گزارنا اس قدر مشکل ہوتا ہے جب انسان کے تمام کے تمام ملنے والے مطلبی ہوں، انہیں دوست سے نہیں بلکہ اپنے مفادات سے غرض ہو۔ اُستاد کا میل ملاپ کم ہی لوگوں سے ہوتا ہے وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں زندگی سے الجھ کر رہ جاتا ہے۔ سکول، کالج، یونیورسٹی میں پڑھانے کے بعد گھر کے کاموں کو دیکھنا بھی انتہائی مشکل ہوتا ہے اسی وجہ سے ان کے ملنے والے ذرا دوسرے لوگوں سے کم ہوتے ہیں اور اگر یہی جو چند ملنے ملانے والے بھی خود غرض اور حسد کرنے والے ہوں تو انسان تنہا رہ جاتا ہے اور زندگی جنگ میں ہتھیار ڈال دیتا ہے، پسپا ہو جاتا ہے، ایڑیاں رگڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

انیس ناگی نے ایسے ہی پروفیسر کو اپنے ناول کا مرکزی کردار بنایا ہے جس کے ملنے والے بہت کم ہیں ملنے والوں میں بھی مخلص دیکھنے کو نہیں ملتا۔ پروفیسر کی زندگی المیہ ہے ہمارے معاشرے کا۔ ایسے معاشرے کا المیہ جس میں لوگ خود کو مہذب اور تعلیم یافتہ کہتے ہیں اور اُستاد کی تکریم کرنے کے بجائے اس کی تذلیل کرتے ہیں۔ ناول میں ایک اور اہم کردار احمد کا ہے احمد اس پروفیسر کی بے روزگاری اور تنگ دستی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور پروفیسر غربت و افلاس کی وجہ سے احمد کا منشی بن جاتا ہے اور پھر اس سے کام کی تفصیل پوچھ کر اس کے ساتھ کام کرنے پر آمادگی ظاہر کرتا ہے:

> ”تمہارے کام کی اصلی نوعیت کیا ہے ؟ہاہاہا بہت وسیع کام ہے موکلوں کو اپنے نرغے میں لانا، رسہ گیری کرنا، دونوں فریقین سے جوڑ توڑ ، گواہوں کو حسب ضرورت پھسلانا، منشی گیری، مجرموں کو پکڑنے میں مدد دینا۔ تم اپنے کام بیک وقت کیسے کرتے ہو؟ اسی لیے تمہاری ضرورت ہے۔ نہ بابا میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ بھئی یہ کام تم کر بھی نہیں سکتے اس کے لیے بڑے تجربے کی ضرورت ہے، تم بس فوجداری کا کام سنبھال لو باقی کام میں خود نپٹالوں گا۔۔۔ہاں یہ لو ایک سو روپیہ۔ یہ کیسے روپے ؟ اس خوشی میں کہ دس پندرہ سال بچھڑنے کے بعد دو پرانے کلاس فیلوز کی طرح پھر زندگی کا سفر اکٹھے شروع کر رہے ہیں۔ نہیں، نہیں، میں تم سے بھیک مانگنے نہیں آیا۔“(۲۲)

انسان اور منافقت کا رشتہ بہت پرانا ہے لیکن آج کل تو اس کے کیا کہنے۔ ہر کسی کی زبان اور عمل سے ظاہر ہوتی ہے اور کبھی کبھی تو سامنے والا اپنے جملوں کو اس طرح منافقت کی خوبصورتی میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے کہ ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔ کہنے کو تو ہماری زندگی میں بہت سے دوست ہوتے ہیں ان میں سے کچھ تو واقعی دوست ہوتے ہیں اور کچھ کو ضرورت کے تحت دوست بنا لیا جاتا ہے۔ دنیا میں جہاں دوغلے لوگوں کی بھرمار ہے وہیں ایسے لوگ بھی خوش قسمتی سے پائے جاتے ہیں جو چاہ کر بھی منافقت نہیں کرتے اور ان کی صاف گوئی ان کی خصوصیت ہونے کے باوجود ان کی دشمن بن جاتی ہے ایسے لوگوں کی دوستی ہر غرض، مطلب سے پاک اور حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔ دفاتر میں کام کرتے ہوئے بھی منافقت کی نئی شکل دیکھنے کو ملتی ہے ہر کوئی آپ سے بڑے اچھے انداز میں ملتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ کس کے دل میں کیا ہے، کون واقعی آپ کا ساتھی ہے اور کون بڑے شاطرانہ انداز میں آپ کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ کون آپ کے کام کو سراہ رہا ہے اور کون آپ کی فائل پر اپنا نام لکھ کر BOSS سے داد وصول کر رہا ہے ۔جب پتا چلتا ہے تب تک گیم ختم ہو چکی ہوتی ہے اور آپ کا پتا صاف کیا جا چکا ہوتا ہے۔ آپ زندگی کی ایک نئی جنگ کا آغاز دوبارہ ابتداء سے کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

انیس ناگی نے بھی پروفیسر کے ایسے ہی کردار کو موضوع بنایا ہے اور معاشرے کے دوغلے پن کو کھول کر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ احمد کا پروفیسر کے ساتھ ملنا محض اتفاقیہ ہو سکتا ہے لیکن پروفیسر کا استعمال

احمد بڑی ہوشیاری سے کرتا ہے اسے دلدل میں ایسی جگہ دھکیل دیتا ہے جہاں سے واپسی کا راستہ ممکن نہیں۔ احمد نے پروفیسر کو اپنے جال میں پھنسا کر اس سے اپنے کئی کام نکلوائے، ملاحظہ ہو:

> "صبح سے ہی میرے سارے بدن میں عجیب طرح کی کھد بد ہوری ہے، گزرا ہوا دن کافی مصروف تھا، میں اب کامیابی کے مراحل سے گزر رہا ہوں۔ اس دوران میں تین چار کامیاب شہادتیں دے چکا ہوں اور میں نے اس طرح ان دیکھے واقعات کو قابل یقین طریقے سے بیان کیا کہ سب کو سزا ہو گئی، ۔۔۔ میں نے رات کے وقت چوہدری کے گھر آنا جانا بھی شروع کر دیا ہے اور اپنے شکار کو چوہدری کے گھر یا اڈے پر سے ہی قابو کر لیتا ہوں اس طریق سے میرا اور احمد کا کاروبار کافی فروغ پر ہے۔"(۲۳)

احمد اپنے گھناؤنے دھندے میں پروفیسر کو الجھاتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایک دن تنگ آ کر پروفیسر نئی راہ پر چلنے کی ٹھان لیتا ہے اسے سمجھ آ جاتی ہے کہ اس کا دوست ہی ہے جو اسے ہمیشہ غلط استعمال کرتا رہا اور پیسہ کماتا رہا، اس کے ساتھ ساتھ پروفیسر کو اس بات کا بھی علم تھا کہ بُرے وقت میں صرف اور صرف احمد نے ہی اس کی مدد کی تھی چاہے اس مدد کرنے سے اسے بھی کافی فائدہ ہوا۔ انیس ناگی نے دوست کے کردار کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ سر سے لے کر پاؤں تک مطلبی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "احمد مجھے چھوڑ دو، کہاں تک مجھے لے جاؤ گے؟ مجھے ترغیب مت دو، میں تھک چکا ہوں۔۔۔۔ کنٹین کے نوکر نے چائے کے برتن دھو کر کنٹین بند کرنے کا اعلان کیا ہے، میں کرسی سے اٹھ کر کچھ فاصلے پر باغیچے کے زردی مائل گھاس پر درخت کے نیچے دونوں گھٹنوں کو سر میں لے کر سورج غروب ہونے کا انتظار کرنے لگا ہوں اتنی تپش میں پانچ میل کا سفر مجھے پیس کر رکھ دے گا۔ احمد قتل سے پیدا شدہ صورت حال سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔۔۔ میں اب کبھی جھوٹی شہادت نہیں دوں گا، بہت ہو چکی، میں نے جو روپ دھارا ہے اسے اپنے اندر رچا نہیں سکا، میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میں بننے کی کوشش کی اس کے درمیان جو خلیج رہی، میں نہ تو اسے سمجھ سکا اور نہ اسے پر کر سکا۔"(۲۴)

دیوار کے پیچھے میں موجود پروفیسر کا کردار انتہائی ڈرامائی حیثیت کا مالک ہے۔ سچائی اور خودداری کا یہ پیکر سماج کی نظروں میں انتہائی بے قدری کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ مصنف کے ہاں اس ناول کے عنوانات میں

جس نظریہ کی حدت محسوس کی جاسکتی ہے وہ یہی ہے کہ ہمارے یہاں علم، سچائی، حقیقت شناسی اور احساس کو انتہائی بے قدری سے دیکھا جاتا ہے۔

زیر بحث ناول میں موجود پروفیسر سماج کی نظروں میں ہی نہیں بلکہ اپنی نظروں سے بھی گر چکا ہے ماں، بہن، بھائی، دوست اور سب ملنے والے اسے بے حیثیت اور مطلبی نظر آتے ہیں کیوں کہ اس بے قدر معاشرہ میں اس کی شخصیت کو وہ مقام حاصل نہیں ہو پاتا جس کا وہ حق دار ہے۔ اس کو اپنی سچائی، ایمانداری اور حقیقت پسندی کی بناپر سوائے ذلت ورسوائی کے کچھ بھی میسر نہیں آتا۔ آخر کار اسے اپنی ان تمام ترخوبیوں کو ترک کرتے ہوئے دنیاداری نبھانے کا ہنر بھی سیکھنا ہی پڑتا ہے اور وہ جان جاتا ہے کہ اگر معاشرہ ایسے لوگوں کو پال رہا ہے جو ہمیشہ سے ہی غلط کاموں پر لگے ہوئے ہیں تو پھر ایسے پروفیسر کا بھی کوئی قصور نہیں جسے انیس ناگی نے اپنے ناول میں مرکزی کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔

iii۔ ماسٹر صاحب بطور دوست (جنم کنڈلی)

لفظ اُستاد ایک انتہائی مقدس لفظ ہے جس کا خیال آتے ہی انسان تعظیماً نظریں جھکا لیتا ہے اور یہ ردعمل ہمیشہ یا ہر کسی اُستاد کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اُستاد کی شخصیت میں فطری اُستاد کا چہرہ ہو تو شاگرد تو کیا دوسرے لوگ بھی اس کی تعظیم ضرور کرتے ہیں دراصل اُستاد انسانیت کا وہ روپ ہے جس کی بے شمار جہتیں ہیں۔ مثلاً ہنرور، عالم، راہنما، قائد اور مدبر وغیرہ لیکن ہر جہت کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے معیار پر پورا اترے۔ علم کے میدان میں بہت سے لوگ اُستاد کی بنیاد پر قدم رکھتے ہیں اور وہ فقط پڑھانا جانتے ہیں مگر ایک مکمل اُستاد کی شخصیت میں وہ روحانیت، اپنائیت، تدبر، توازن، احساس اور اخلاق سے اعلیٰ اوصاف ضرور پائے جاتے ہیں وہ قائد اور رہنما بن کر بھی سکھاتا ہے خود نمونہ بن کر بھی معاشرے کے لیے راہیں ہموار کرتا ہے۔

برسوں پہلے کے اُستاد اور آج کے اُستاد میں نمایاں فرق یہ ہے کہ تب اُستاد اور شاگرد کے درمیان حد فاصل تھی جو کہ اب نظر نہیں آتی مگر یہ کہنا بھی بے جا نہیں کہ تب کا اُستاد آج کے اُستاد سے زیادہ مشفق تھا۔ علم سکھانے میں مادیت کا ظہور نہیں ہوا تھا تعلیم کا لفظ پڑھنے پڑھانے کی بجائے سیکھنے سکھانے کے لیے مستعمل تھا۔ یہ وہ دور تھا جب اُستاد کو محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اُستاد بھی اپنے سے جڑے ہر رشتے کی دل سے قدر اور عزت کرنا خود پر فرض سمجھتا تھا۔ اُستاد کا مقام و مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی بلند ہے اسی لیے اللہ نے تمام انبیا علیہم السلام کو معلّم بنا کر دنیا میں بھیجا۔

فہیم اعظمی اس دور کے اُستاد اور شاگرد کے درمیان دوستانہ ہمدردی اور محبت کے رویہ جات کو بھی اپنے قلم سے اوجھل نہیں رہنے دیتے۔ اپنے ناول ''جنم کنڈلی'' کے کردار ماسٹر جی کو بچوں کے ساتھ سنجیدہ تو دکھاتے ہی ہیں مگر ان کے ساتھ بچوں کی اپنائیت اور بچوں کے لیے ان کی ہمدردی کو احاطہ تحریر میں لاتے ہوئے اس رشتے کے تقدس کو بیان کیا ہے۔ فہیم اعظمی کے ناول کا کردار ماسٹر جی روایتی اُستاد کی طرح بچوں کے درمیان اپنا احترام بھی رکھتا ہے اور طلباء اُستاد کی تعظیم کو سعادت بھی گردانتے ہیں ماسٹر اور طلبہ کے درمیان روایتی تعلق کو فہیم اعظمی خوبصورتی سے رقم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''پرائمری اسکول کا ہیڈ ماسٹر بچوں کو فالسے کے درختوں کے نیچے چھوڑ کر اپنی کوٹھڑی میں الٹا لیٹا ہوا کھٹّی ڈکاریں لے رہا تھا اور دوسرے بچوں کے ساتھ وہ بھی اس کا پیر دبا رہا تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی انگلیاں ماسٹر کی موٹی ران پر چیونٹی چھوڑ دیتی تھیں''(۲۵)

زندگی کے ہر شعبہ میں ہم کامیاب اور ناکام کی دوڑ میں ہیں بالکل ویسے ہی جیسے بچپن سے ہی ہم پاس اور فیل کے درمیان لٹکتے رہتے تھے اور یہی زندگی کا سب سے حسین وقت تھا۔ سکول کے دور سے پاس اور فیل کی دوڑ میں پڑنے کا غم اور خوشی اپنی جگہ مگر پاس ہونے کے بعد اسکول سے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی خوشی کا منظر تھا۔ اپنی حیثیت کے مطابق ماسٹر جی کی خدمت کرنا یا منہ میٹھا کروانا بھی یہاں کی روایت کا حصہ ہے۔ فہیم اعظمی اپنے ناول ''جنم کنڈلی'' کی کہانی کا آغاز سے ان روایات کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ اصل میں یہ زندگی کی لا ابالی عمر میں تو ہے لیکن انسان کی چاہت اور خواہش سے بے پروا چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر خوش اور ننھی پریشانیوں پر غم گین ہو جاتا ہے۔

فہیم اعظمی پاس ہونے والے دن کی خوشی اور اُستاد و شاگرد کے درمیان دوستانہ و مشفقانہ تعلق کو بیان کرتے ہوئے ان کی عمروں کے درمیان فرق کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں لہذا اس دوستی کو مشفقت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ طلبہ جب پاس ہونے کے بعد سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہیں اور اُستاد محترم کو منہ میٹھا کے طور پر نذرانہ دیتے ہیں اس منظر کو فہیم اعظمی یوں بیان کیا ہے:

''دوسرا درجہ پاس کرنے کے بعد جب ماسٹر نے سرٹیفکیٹ دینا شروع کیا تو سب بچے آٹھ آٹھ آنے لے کر ماسٹر کی نذر کرنے گئے۔۔۔ سرٹیفکیٹ اور یہ ہاتھ میں روپیہ لیے ہوئے لائی گٹّا لینے کے لئے بھاگ رہا تھا۔ پھر وہ چپکے سے اٹھا اپنے دامن میں

درخت کے نیچے سے جامن چنی اور اندھیری کوٹھڑی میں بیٹھ کر جامن کے بیج
کوروشن دان سے کوٹری کے بہو کے کڑھاؤ کی طرف پھینکنے لگا اور ماسٹر صاحب کی
آواز پر چونک پڑا۔
"یہ لو اپنا سرٹیفکیٹ۔ "(۲۶)

کامیابی اور ناکامی ذہانت کا معیار نہیں۔ زندگی میں بہت کچھ ایسا بھی ہوتا ہے جہاں پر ذہانت ہار جانے کو کامیابی تصور کرتی ہے۔ بچپن کا دور بھی عجیب طرح کا ہوتا ہے جب ہم بہت چھوٹی سی بات پر مایوس اور ناامید ہو جاتے ہیں اور پھر اسی قدر چھوٹے سے سہارے پر ہماری خوشی کی انتہا باقی نہیں رہتی۔ بسا اوقات کوئی مبہم سی ناکامی ہماری سوچ کے واضح آنگن میں کسی "کوبرا" کی طرح پھن پھیلائے مناسب وقت کی منتظر ہوتی ہے۔ ہم اس کو پرکھ نہیں پاتے اور پھر تہہ در تہہ گزرتے دن اور رات ہمیں اس ناکامی کے قریب تر کرتے جاتے ہیں حتیٰ کہ جس وقت کو ہم کامیابی کے امکان کے طور پر محسوس کر رہے ہوتے ہیں عین اسی وقت وہ ناکامی ہمیں ڈس لیتی ہے اور پھر ایک طویل عرصہ تک ہم اسی ناکامی کے زخم کو سہلاتے رہتے ہیں۔ بچپن کے دور میں ہم ماسٹر جی کے پاس پڑھتے ہیں تو بھی پسند اور ناپسند کا جھگڑا رہتا ہے لباس اور چال چلن اور طور طریقہ بڑا معنی رکھتے ہیں۔ دل ہی دل میں کسی اُستاد کو دوست اور کسی کو دشمن بھی سمجھ بیٹھتے ہیں اور یہی بچپن کی سچائی ہے جسے فہیم اعظمی نے انتہائی مدبرانہ انداز میں اپنے ناول "جنم کنڈلی" کی کہانی کا حصہ یوں بنایا ہے:

"انگریزی کا ماسٹر اسے بہت پسند کرتا تھا اور اُس کی دھوتی بڑی اجلی تھی اور اس کی
صدری پر استری روز ہوتی تھی اور اس کا جنیو بہت سفید تھا۔ وہ الفاظ کی تے
تیز رفتاری سے کرتا تھا اور یہی بات اس میں اور اس کے ماسٹر میں کامن تھی۔
اور جب حساب کا پرچہ بہت آسان آیا۔۔۔ اور وہ بے معنی معلوم ہوا اس نے زور
سے چیخ کر کہا۔ "میں تو پوزیشن لینے والوں میں ہوں۔ "(۲۷)

فہیم اعظمی اُستاد اور شاگرد کے درمیان تعلقات کو دراصل اپنے ناول کے الجھاؤ کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ تجرید زدہ اس کہانی کو بغیر سر پیر جانور کہا جا سکتا ہے جس کا آغاز و اختتام پڑھنے والے پر منحصر ہے۔ ناول "جنم کنڈلی" کے اوراق کو الگ الگ کر کے پھر آگے پیچھے کر کے بھی جوڑ دیا جائے تو بھی اسی طرح کی ایک کہانی عمل میں آ جائے گی۔ "جنم کنڈلی" کا ماسٹر بہت سادہ مزاج ہے جو اپنے طالب علموں کے کامیاب، ناکام،

اچھے اور برے کے بارے میں وقتاً فوقتاً رائے دیتا ہوا اپنے تعلقات استوار کرتا ہے۔ طلبہ کے لئے یہی آراء ماسٹر جی کے بارے میں مشفقانہ تاثر پیدا کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> ''بھاگنے لگا اور اس کے ماسٹر کی آواز دور سے آتی رہی۔ ''ارے یہ تو بڑا اچھا طالب علم ہے۔'' اور ہندو پرنسپل نے اسے اٹھا کر جنیو کے سب سے اوپری حصہ پر کھڑا کر دیا لیکن اس نے گردن جھکا لی۔ اس کو ماسٹر بھی اچھا لگا اور پرنسپل بھی، مگر گداز جسموں کے لیے موزوں وارننگ سسٹم نہیں تھا اور جونک نے خون خشک کر دیا تھا۔ مڑ کر دیکھا تو اس کی ماں مرزا عابد علی کی کتاب کھولے علم کے عین پر روشنائی لگا رہی تھی اور جہالت کے جیم کو ایرز کر رہی تھی۔''(۲۸)

اُستاد کی شخصیت ایک ایسے پیڑ کی مانند ہوتی ہے جو موسم اور حالات کی سختیاں خود پر برداشت کرتے ہوئے اپنی شاخوں کے پھیلاؤ میں آنے والے لوگوں کو سایہ اور چھاؤں مہیا کرتا ہے کہ وہ حالات کے ان تھپیڑوں سے محفوظ رہ سکیں جن کو اس نے خود پر برداشت کیا ہے۔ انسان کو زندگی کے ہر پہلو میں اور جیون کی ہر دوڑ میں کامیابی کی منازل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کسی اُستاد کی ضرورت درپیش رہی ہے۔ یہ کبھی ممکن نہیں ہوا کہ کوئی انسان کسی ان دیکھے سفر میں بغیر کسی کی راہنمائی کے بآسانی پہنچ جائے۔

فہیم اعظمی کا شاہکار ''جنم کنڈلی'' اپنے اندر ایک ایسے اُستاد کی موجودگی کو ظاہر کرتا ہے جو کہ مختلف ادوار کے لوگوں سے ہی نہیں بلکہ فلسفیوں اور دانش وروں سے بھی مکالمہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ کردار ایک ایسے اُستاد کی مانند ہے جو زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے جس نے ان حالات میں سے گزرتے ہوئے زندگی کا مشاہدہ کیا ہو۔ ارسطو، سقراط، افلاطون، بقراط، نطشے، کرشن بھگوان، لارڈ میکالے اور دیگر بہت سے مفکرین کے ساتھ ہمہ پہلو مباحث میں شریک یہ اُستاد دراصل وقت کی مثل ہے۔ وقت ہی تو ہے جو گزرتا بھی جاتا ہے اور سب کچھ سکھاتا بھی جاتا ہے۔

iv۔ پروفیسر سہارن رائے بطور دوست (آدھے ادھورے خواب)

دوستی کیا ہے؟ ایک ایسا سہارا جس میں جھجک اور شرمندگی کا پہلو موجود نہ ہو۔ اس رشتے میں انسان وہ سب دکھ انتہائی آسانی سے بانٹ سکتا ہے جن کا کسی دوسری جگہ پر بیان کرنے کا تصور بھی اس کو ہیبت میں ڈال دے۔ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ شش جہت پھیلے اس کے ساتھ متعلقہ مختلف کردار اس کا ساتھ دوستانہ رویہ رکھیں بلکہ ہم اکثر کہتے ہیں کہ ہمارا ماحول بھی انسان دوست ہونا چاہیے۔ زندگی میں موجود تمام کردار مثلاً

ماں، باپ، بہن، بھائی، اعزہ و اقارب اور اساتذہ کا رویہ اگر انسان کے ساتھ مشفقانہ اور دوستانہ ہو تو اس کے آگے بڑھتے ہوئے کامیابی اور ترقی تک پہنچنے کے امکانات کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ خاص کر جب ایک اُستاد ہی انسان کو دوستانہ برتاؤ کا حامل مل جائے تو اس کی زندگی بدل سکتی ہے۔ زیر بحث ناول ''آدھے ادھورے خواب'' میں شاہد صدیقی نے اس امر کو انتہائی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔

شاہد صدیقی نے ''آدھے ادھورے خواب'' میں پروفیسر سہارن رائے کے کردار کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ پروفیسر سہارن رائے میں روایتی اُستاد والی کوئی بات نہیں ہے وہ ایک ایسے اُستاد ہیں جو اپنے طلبہ سے بے حد لگاؤ رکھتے ہیں ان کا بہترین کارنامہ یہ ہے کہ وہ پوری کلاس پر توجہ دیتے ہیں طالب علموں کو ان کے ناموں سے پکارتے ہیں اور اپنے طلبہ کے ذہنوں کو کھولتے اور ان کے اندر کی خوبیوں کو نکھارتے ہیں۔ کلاس میں ان کا پہلا دن ہے اور انہوں نے پہلے دن ہی کلاس کو اپنا مداح اور دوست بنانا ہے۔ کلاس میں پروفیسر سہارن رائے کی گفتگو ملاحظہ ہو:

> '' ابتدائی تعارفی جملوں کے بعد اس نے کلاس سے کہا۔ مجھے یہاں بہت سے آرٹسٹ بیٹھے نظر آرہے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔ اس کے بعد اس نے ہم سب میں A4 سائز کے سفید کاغذ تقسیم کیے اور بورڈ پر ایک پھول بنایا۔۔۔''
>
> سر رائے نے اس کے نیم ٹیگ کو دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔
>
> ''لیکن اس کی ایک اور وجہ بھی ہے۔'' (۲۹)

پروفیسر سہارن رائے کو دماغوں کے بند دریچے کھولنے کا ہنر آتا ہے وہ بڑی کامیابی کے ساتھ کلاس میں بیٹھے ہوئے بچوں کو ان کے نیم ٹیگز سے دیکھ کر ان کے ناموں سے پکارتے ہیں اور سب کی بات کو پوری توجہ ساتھ سنتا ہے۔ کلاس کے پہلے دن ہی انھوں نے کلاس کے ساتھ دوستانہ ماحول کو پروان چڑھایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طالب علم اپنے اندر کی بات کو باہر لاتے ہوئے کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتا تھا۔ کلاس میں ہونے والی گفتگو اس بات پر شاہد ہے کہ اُستاد اور طلبہ کے درمیان بے تکلفی دونوں کے لیے مفید ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''سر یہ پھول اس لیے خاص ہے کہ بورڈ پر بنا ہوا ہے۔'' میں نے جلدی سے ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ اس پر کلاس میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔۔۔
>
> ''ہر چیز جس نے اپنی ذات کا رنگ اور پرتو ہو وہ خاص چیز بن جاتی ہے۔ تو آج ہم سب اپنا اپنا پھول تخلیق کر رہے ہیں۔''

ہم نے بہت سوں نے صرف پرائمری سکول تک ڈرائنگ کی تھی اس لئے کچھ جھجھکے۔

پروفیسر رائے کی آواز گونجی۔

"خواتین و حضرات! پتیوں کا ڈیزائن اپنا اپنا ہو گا۔ جو لوگ کانٹے بنانا چاہیں بنا سکتے ہیں۔ جو اسے گلے میں لگانا چاہیں لگا سکتے ہیں یہ پھول آپ کا ہے۔ آپ کا اپنا۔"(۳۰)

شاہد صدیقی نے کہانی میں ایک مثالی اُستاد کو پیش کیا ہے اُستاد کی بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں ایک اچھا اُستاد وہی ہوتا ہے جو وقت کی پابندی کے ساتھ ساتھ کلاس میں حاضر دماغی سے موجود ہوتا ہے اور اپنا لیکچر تیار کر کے جاتا ہے۔ شاہد صدیقی نے پروفیسر سہارن رائے کو ایک ایسے ہی اُستاد کے روپ میں دکھایا ہے۔ اُستاد کا اسلام میں بہت مقام ہے، اُستاد کو روحانی باپ کا درجہ دیا گیا ہے۔ پروفیسر سہاران رائے ایسے ہی اُستاد ہیں جو اپنے طلبہ سے بڑے خلوص اور محبت کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ طلبہ کو برابر سوچنے کا موقع دیتے ہیں وہ کلاس میں ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں کہ سب طلباء ان کی بات بڑی غور سے سنتے ہیں۔ اسی دوران وہ کوئی انوکھا سوال کرتے ہیں تمام طلبہ سے اس کا جواب طلب کرتے ہیں وہ بند ذہنوں کو کھولنے کا ہنر اچھی طرح جانتے ہیں۔ ایک کلاس کا حال ملاحظہ کریں:

"پروفیسر سہارن رائے کی کلاس میں اس روز بھی دھواں دار بحث چل رہی تھی۔ یہ ان کی خاص ٹیکنیک تھی۔ وہ کلاس کے سامنے ایک سوال رکھ دیتے، سوچنے کا وقت دیتے اور پھر ہر ایک کو اپنی رائے دینے کی صلائے عام تھی۔ اس روز پروفیسر رائے حسب معمول میز پر بیٹھ کر ہمارے خاموش ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ پھر انہوں نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ سب خاموش ہو گئے۔

"آج ہم ایک پہیلی بوجھیں گے۔" پروفیسر رائے نے ڈرامائی انداز میں اعلان کیا۔

"سوال یہ ہے کہ ایک اچھے اُستاد کی تعریف کیا ہے؟" وہ بولے ہم میں سے ہر ایک دو منٹ سوچے اور پھر اپنا جواب نوٹ بک پر لکھ لے۔"

"سر۔ سر۔" فوزیہ نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔" سر جو ٹیچر A گریڈ دے وہ اچھا ٹیچر ہے۔"(۳۱)

پروفیسر سہارن رائے نے جماعت میں طلبہ کو سوچنے کا موقع دیا اور وقت پورا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وقت پورے ہونے پر دیے جانے والے جوابات اور تمام طلبہ کی آراء کا احترام کرنا انھیں طلبہ کی نظر میں

زیادہ معزز بنا دیتا ہے اور یہی طریقہ انھیں اپنے طلبہ کے ذہنوں میں ہمیشہ کے لیے زندہ رہنے کے لیے کافی ہے۔ پروفیسر سہارن رائے کے نزدیک سب سے اہم بات طلبہ کا سیکھنا ہے جو وہ کلاس کے دوران اُستاد سے سیکھتا ہے۔ انھوں نے کلاس کی طرف سے دیے جانے والے جوابات کو بورڈ پر پوائنٹس کی صورت میں لکھا، ملاحظہ ہو:

> ''سر رائے چاک لے کر بورڈ کے پاس کھڑے ہو گئے اور ہمارے دیے گئے پوائنٹس بورڈ پر لکھنے لگے وہ اکثر کہا کرتے تھے اُستاد کے لیے ضروری کام ہولڈ بیک (Holdback) کرنا ہوتا ہے تاکہ طالب علموں کو سوچنے کا موقع مل سکے لیکن اکثر اُستاد بے صبری میں اپنا علم کلاس روم میں انڈیل دیتے ہیں اور طالب علموں کے دماغ بند تجوریوں کی طرح اَن کھلے رہ جاتے ہیں۔ علم کے کیسے کیسے ہیرے موتی بغیر استعمال کے زنگ آلود ہو جاتے ہیں؟
>
> ''علم، مہارت ،تکنیک، کمیونیکیشن، سائیکالوجی، کمٹمنٹ ،شخصیت وغیرہ وغیرہ۔''۔۔۔۔
>
> یہ پروفیسر رائے کی کلاس کا رنگ تھا کہ ہر طالب علم گفتگو کا حصہ تھا۔ وہ مکالمے میں برابر کا شریک تھا۔''(۳۲)

طلبہ کی بھرپور شرکت اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ان کی کلاس میں تمام طلبہ کو مکمل آزادی ہے وہ اپنی رائے دے سکتے ہیں۔ پروفیسر سہارن رائے سب کی باتوں کو نوٹ کر کے پھر انھیں ایک اچھے اُستاد کی خوبیوں کے بارے میں بتاتے ہیں جس سے تمام طلبہ کو پتہ چلتا ہے کہ ایک بہترین اُستاد کو کیسا ہونا چاہیے سہارن رائے اپنے طلبہ کو بتاتے ہیں کہ اُستاد بھی کیک کی طرح ہوتا ہے۔ اس پر تمام کلاس میں سے کچھ حیران ہوئے اور کچھ ہنس دیے۔ اس پر کلاس میں سے پھر سوال اٹھایا گیا، ملاحظہ ہو:

> ''سر! اُستاد اور کیک میں آخر کیا مماثلت ہے؟'' سب کی آنکھوں میں یہی سوال تھا۔ لیکن سر رائے کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔
>
> ''کچھ اُستاد ایک تہہ والے کیک کی طرح ہوتے ہیں اور یہ تہہ سبجیکٹ نالج (Subject Knowledge) کی ہوتی ہے۔'' سر رائے بولے ''لیکن کیا سبجیکٹ نالج کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اُستاد بھی اچھا ہو؟''۔۔۔ میں نے آنکھیں بند

کیں تو میرے دماغ کی سکرین پر ایک اُستاد کا چہرہ گھوم گیا جو بقول اس کے ریسرچ میں بہت اچھی تھی۔ لیکن اس کی کلاس میں ہمارے پلے کچھ نہیں پڑتا تھا۔'' (۳۳)

ایک اچھا اُستاد ہونے کے لیے کیا کیا ضروری ہوتا ہے کلاس میں بحث جاری تھی۔ پروفیسر رائے ساری کلاس کے ساتھ بڑے دوستانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی ذہن سازی بھی کر رہے تھے۔ پروفیسر رائے کلاس میں ایسا دوستانہ ماحول بنا دیتے ہیں کہ تمام طلباء سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اپنی رائے کا اظہار بھی بلا جھجک کرتا ہے۔ ہر طالب علم اپنے ذہن کے مطابق جوابات دیتا ہے اور پروفیسر سہارن رائے سب کے جوابات کو بڑے انہماک سے سنتا ہے۔ سب کے جوابات سننے کے بعد وہ خود گویا ہوتا ہے، کیک کی مثال دے کر ایک اچھے اُستاد کی خوبیوں کو ایک ایک کر کے سب کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ کلاس میں ہونے والی گفتگو ملاحظہ ہو۔

''پروفیسر رائے کی آواز گونجی۔ ''ہم ایک اچھے اُستاد کی تلاش میں ہیں۔ علم کے علاوہ ایک اچھا اُستاد بننے کے لیے کیا چاہیے؟''
''سر پڑھانے کا طریقہ۔'' بہت سی آوازیں آئیں۔
''بالکل درست۔'' سر رائے بولے۔
پھر وہ میز پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے۔ ''کچھ اُستاد دو تہہ والے کیک کی طرح ہوتے ہیں جس میں پہلی تہہ نالج کی اور دوسری طریقہ ہائے تدریس کی ہوتی ہے یعنی وہ مضمون کو جانتے بھی ہیں اور اس کے پڑھانے کے طریقے سے بھی آگاہ ہوتے ہیں۔''
''تو کیا ایک اچھے اُستاد کی تکمیل ہو گئی؟'' ''نہیں۔ ہرگز نہیں۔''(۳۴)

پروفیسر رائے نے خود ہی سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دیا۔ اُستاد اور کیک کی اس مشابہت کو چھوڑ کر پروفیسر رائے نے کلاس کے تمام طلبہ کو اپنی گفتگو کا حصہ بناتے ہوئے سمجھانے کے لیے ایک بہترین اُستاد کی طرح مثالوں کا سہارا لیا۔ پروفیسر کہنے لگے کہ میں نے بہت پہلے میں نے pottery پر ایک کتاب پڑھی تھی جس کا بنیادی خیال یہ تھا کہ کیسے ایک عام سے برتن کو آرٹ کے نمونے میں بدلا جا سکتا ہے۔ پیشہ تدریس بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ایک شخصیت گری اور دوسری ظروف سازی۔ کتاب میں تین قوانین بیان کئے گئے تھے جنہیں استعمال کر کے ہم کسی برتن کو آرٹ کے نمونے میں بدل سکتے ہیں۔ پروفیسر سہارن رائے نے کتاب کا تذکرہ کر کے انھیں قوانین کی طرف لے جاتے ہیں۔ کلاس میں ہونی والی گفتگو یوں آگے بڑھتی ہے:

"پہلا قانون دماغ کا قانون ہے۔ ایک اچھا ظروف ساز سب سے پہلے ذہن میں برتن کے خدوخال بناتا ہے۔"

"دوسرا قانون ہاتھ کا قانون ہے جس میں برتن بنانے والے کے ہاتھ کی موومنٹ بہت اہم ہے۔"۔۔۔۔

ایک نمایاں اور ممتاز اُستاد کی پہچان یہ ہے کے علم اور طریقہ تدریس کی دو تہوں کے اوپر آئسنگ بھی ہو۔ کون guess کرے گا اس آئسنگ کے بارے میں؟"

کلاس میں تین ہاتھ اٹھے۔

سر رائے کا اشارہ پا کر ہماری کلاس کی تسنیم آنکھوں کے کنارے ہر وقت بھیگے رہتے تھے بولی" سر اُستاد کا رویہ، اس کی مہربانی، اس کا شاگردوں کی بات سننا، انہیں اہمیت دینا، ان کی عزت کرنا۔ یہی ہے وہ آئسنگ جو اسے دوسرے اساتذہ سے ممتاز بناتی ہے۔"(۳۵)

شاہد صدیقی نے کہانی کو اس طرح آگے بڑھایا ہے کہ قاری کو پڑھتے ہوئے تھکن کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ پروفیسر رائے کے ساتھ امتثال کی ملاقات کروانے سے پہلے پروفیسر رائے کے بارے میں سوچنا اور مختلف دوستوں سے پروفیسر سہارن رائے کے اصول کا تذکرہ کروانا۔ یوں لگتا ہے جیسے موتیوں کی ایک خوبصورت لڑی ہے اور اس میں شاہد صدیقی نے بڑی محنت اور جدت سے پرو دیا ہے۔ پروفیسر سہارن رائے ایک مکمل اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے انسان بھی ہیں وہ ماحول سے چیزوں کو دیکھتے ہیں، رائے دیتے ہیں اور سوال کر کے چپ ہو جاتے ہیں دوستانہ ماحول پیدا کرنا ان کا خاصہ ہے۔ پروفیسر رائے سے ملاقات ہونے سے پہلے ہی امتثال میں تجسس پیدا کر دیا جاتا ہے۔ اُستاد معاشرے کا سب سے اہم رکن ہے قوم کی تقدیر اساتذہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو ملک ترقی یافتہ ہوتے ہیں وہاں اُستاد کو بہت زیادہ عزت و احترام دیا جاتا ہے یا یوں سمجھ لیں دنیا کی ترقی کا راز اساتذہ کے ساتھ جڑا ہوا ہے اُستاد جس قدر دوستانہ ماحول میں اپنے طلبہ کے ساتھ درس و تدریس کرے گا وہ اسی قدر کامیاب ہو گا اُستاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے طلبہ کی باتوں کو بڑی توجہ کے ساتھ سنے اور ان کی رائے کو اہمیت دے اپنے مزاج کو خوشگوار رکھے۔ پروفیسر سہارن رائے میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں وہ پہلی ملاقات میں ہی طلبہ کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ ان کے ساتھ محبت والا رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔ وہ جیسے بھی ملیں ملنے والا انہیں ہمیشہ یاد کرتا ہے اور وہ بھی اپنے سب ملاقاتیوں کو قدر کی نگاہ سے

دیکھتے ہیں۔ انتثال سے پہلی ملاقات جب ہوتی ہے تو وہ انتثال کے ساتھ دوستانہ رویہ اپناتے ہیں انتثال تو پہلے بھی ان کے بارے میں جانکاری رکھتی ہے لیکن پروفیسر سہارن رائے کی ان سے یہ پہلی ملاقات ہے ملاحظہ ہو:

”اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ میں ہاسٹل کے کمرے میں بستر پر کروٹیں
بدل رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں نے سوچا وقت کاٹنے کے لئے ٹی
وی لاونج میں بیٹھ کر کچھ دیر ٹی وی دیکھوں۔
میں نے کتاب اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔۔۔
”اوہ سوری۔ میں نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔ مجھے انتثال کہتے ہیں۔“
”انتثال آغا۔“
”انتثال“ میں نے زیر لب دہرایا۔“(۳۶)

یہ انتثال آغا کی پہلی ملاقات پروفیسر سہارن رائے سے تھی۔ لیکن انتثال آغا پروفیسر سہارن رائے کے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ جانتی تھی۔ پہلی ملاقات ہے اور انتثال کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی ہے اور پروفیسر سہارن رائے پوچھتے ہیں کہ کیا پڑھ رہی ہیں آپ؟ انتثال آغا نے کلاس کی پریزنٹیشن کا بتایا، اور کہا کہ کل لٹریسی (literacy) پر پریزنٹیشن ہے۔ کلاس میں سب نے یہ آرٹیکل پڑھ کر جانا ہے۔ پروفیسر سہارن رائے نے بات کو آگے بڑھانے کے لیے کہا کہ آج کل فنکشنل لٹریسی (functional literacy) پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے لیکن معاشرے میں تبدیلی کے لئے کریٹیکل لٹریسی (critical literacy) کی ضرورت ہے ۔پالو فریرے (paulo freire) جیسے لوگوں نے ثابت کیا کے لٹریسی کو معاشرے میں تبدیلی کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ شاہد صدیقی نے کرداروں کے درمیان الفت و موانست پیدا کرنے کے لیے بھی ایک ایسا ماحول تشکیل دیا ہے جو قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔

انتثال اور پروفیسر سہارن رائے کی پہلی گفتگو میں مختلف قسم کے تعلیمی موضوعات پر بحث کا سلسلہ شروع ہوتا ہے انتثال کہتی ہے کہ مجھے بھی تعلیم کے کریٹیکل پہلو سے دلچسپی ہے۔ ایک ایسی تعلیم جو نیوٹرل اور passive نہ ہو بلکہ معاشرے کے دل میں دھڑک رہی ہو۔ پروفیسر سہارن رائے دیکھ رہے تھے کہ انتثال کی آنکھوں میں ایک چمک ہے کامیاب اور مخلص انسانوں کی سی چمک۔ یہ باتیں سننے کے بعد وہ انتثال کی ذہنیت کو سمجھ چکے تھے تو انھوں نے بات کو اس طرح آگے بڑھایا:

"تعلیم اور آئیڈیالوجی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ تعلیم ایک قوم کو سُلا بھی سکتی ہے اور بیدار بھی کر سکتی ہے۔ یہ معاشرے کی سماجی اور معاشی تفریق کو بڑھا بھی سکتی ہے اور کم کرنے میں معاون بھی ثابت ہو سکتی ہے۔"۔۔۔

"سر آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔" وہ ہاتھ میں پکڑے پیپرز کو مٹھیوں میں بھینچ رہی تھی۔" اوہ میں تو ڈر گیا تھا شاید مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام سہارن رائے ہے۔"

"سہارن رائے۔" اس نے زیر لب دہرایا۔ پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولی" اوہ میرے خدا۔ سہارن رائے؟"(۳۷)

اُستاد کے اندر یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہونی چاہیے کہ وہ اعلیٰ اخلاق کا مالک ہو کیوں کہ اساتذہ کا زیادہ تر وقت اپنے طالب علموں کے ساتھ گزرتا ہے اور طلبہ اُستاد کو روحانی باپ سمجھتے ہیں اس کے ہر قول و عمل کو بنظر غائر دیکھتے ہیں اور خود بھی اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُستاد کو طلبہ کے ساتھ دوستانہ ماحول پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی رائے کو سن کر اور ان کی رائے کو اہمیت دیتے ہوئے اور ان کے عزت نفس کا خیال رکھتے ہوئے انہیں علم بھی سکھانا ہوتا ہے اور ان کے اخلاق کو درست سمت پر گامزن کرنا ہوتا ہے ایک اُستاد کے لئے یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے وہ اپنے طلبہ سے محبت اور دوستی والی فضا میں شخصیت سازی کرے اور انہیں غور و فکر کرنے کی دعوت دے۔ طلبہ کو صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے ان کی بہترین تربیت کی جائے کیوں کہ یہ طلبہ کل معاشرے کی ترقی میں اہم کردار ادا کریں گے۔

امتثال نے جب سہارن رائے کا نام سنا تو اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ فوراً کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر پوچھتی ہے کہ کہیں آپ پروفیسر رائے تو نہیں ہیں؟ امتثال آغا کی حیرانی کی انتہا اس وقت ہوتی ہے جب اسے پتہ چلتا ہے کہ سر سہارن رائے ان کے کالج میں پڑھاتے تھے۔ اب امتثال کی خوشی کی انتہا تھی اور وہ چاہتی تھی کہ پروفیسر سہارن رائے کے ساتھ ایک تصویر کھینچوا لے۔ کہتی ہے سر آپ پلیز تھوڑی دیر کے لئے بیٹھیں میں اپنے کمرے سے ہو کر آتی ہوں۔ وہ بے خیالی میں مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔ اُستاد اور شاگرد کے درمیان جب بے تکلفی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے تو سیکھنے سکھانے کے عمل میں نمایاں کامیابی ملتی ہے۔ پروفیسر سہارن رائے تمام لوگوں

کے ساتھ مشفقانہ اور دوستانہ رویہ اپناتے ہیں۔ انتثال کے ساتھ پہلی ملاقات اور پروفیسر سہارن رائے کا رویہ اس بات کا عکاس ہے، ملاحظہ ہو:

"سر پلیز آپ کے ساتھ ایک تصویر کھنچوا سکتی ہوں؟"
اس نے بابا کو کیمرہ دیا اور میرے ساتھ آ بیٹھی۔
تصویر کھینچنے کے بعد اس نے بابا کا شکریہ ادا کیا اور اسے واپس جا کر سونے کو کہا۔
" سر مجھے آپ کو دیکھنے اور آپ سے ملنے کی بہت خواہش تھی اور دیکھیں ملاقات بھی ہوئی تو کہاں۔"
"آپ مجھے جانتی ہیں؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
" جی سر۔" اس کی آواز میں جوش اور احساس تفاخر تھا"(۳۸)

تدریس کا پیشہ ایسا ہے جس کا تعلق پیغمبرانہ عمل سے ہے اور اس کا مقصد شخصیت سازی، انسان سازی ہے نبی اکرم ﷺ کو معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ انھوں نے ایک معلّم کی حیثیت سے اپنی زندگی میں ایک ایسی جماعت تیار کی جس نے آپ ﷺ کے وصال کے بعد دنیا میں مہذب بنانے کے طریقے سکھائے، حکومت کے طریقے سکھائے۔ یہ سب کچھ آپ ﷺ کی محنت کا ہی نتیجہ تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہ تمام دنیا میں اسلام کی تبلیغ کے ساتھ انسانوں کو انسان بنانے نکلے نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں سے ہمیں بہت سے واقعات ملتے ہیں جن میں بہترین اُستاد کے اوصاف کا پتہ چلتا ہے۔ اُستاد کے تربیت کردہ شاگرد ہی اُستاد کی فنی قابلیت کو منھ بولتا ثبوت ہوتے ہیں۔ پروفیسر سہارن رائے کو ان کے طالب علم کبھی بھول ہی نہیں پاتے تھے طلبہ کو جو محبت پروفیسر سہارن رائے سے ملتی تھی وہ شاید ہی کوئی اور اُستاد سے ملتی ہوں اسی وجہ سے ان کے تمام طلبہ کو یاد رکھیں اور بات بات پر ان کا تذکرہ کرتے ہیں پروفیسر سہارن رائے کے اسلوب کو بیان کرنا آسان کام نہیں۔ شاہد صدیقی نے پروفیسر سہارن کے ذریعے ایسے کردار کو پیش کیا ہے جس کو اس کے طلبہ بھول نہیں پاتے اور نئے آنے والے طلبہ جب ان کا طریقہ تدریس سنتے تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش وہ بھی پروفیسر سہارن رائے کے شاگرد ہوتے، پروفیسر کو یاد رکھے جانے کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

"میں چاہوں بھی تو پروفیسر رائے کے اسلوب کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔
یہ ایک کیفیت تھی جو محسوس کی جا سکتی تھی۔۔۔۔

جہاں پروفیسر رائے سامعین کا جوش و خروش دیکھ رہے تھے۔ نوجوانوں نے ان کو
گھیر لیا تھا سب کی خواہش تھی کہ وہ پروفیسر رائے سے ہاتھ ملائیں، ان سے بات
کریں، ان کے ساتھ تصویر کھنچوائیں۔
میرے دل کے ایک کونے میں انبساط کی ایک کلی چٹکی۔"(۳۹)

معاشرے کی تعمیر میں اساتذہ کا کردار سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اس کی تعمیر و ترقی میں اساتذہ ایک رول ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں تمام تعلیمی عمل میں اُستاد کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ بچوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کو بہتر طریقے سے پروان چڑھانے کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت بھی کریں۔ انسانی زندگی کے ساتھ جتنے بھی پیشے جڑے ہوتے ہیں وہ سب کے سب عوامی راحت اور سہولتوں کی فراہمی میں لگے ہوئے ہیں کہ زندگی کو آسان سے آسان تر کس طرح بنایا جائے یہ تمام پیشے اور شعبے بلاشبہ معاشرے کے لئے اہم ہیں کہ پیشہ تدریس انسان کی جسمانی، معاشرتی، ذہنی، اخلاقی، روحانی، جمالیاتی اور زندگی گزارنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے اسی وجہ سے اس پیشے کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کامیاب اُستاد کو تعلیمی اغراض و مقاصد پر مکمل دسترس ہوتی ہے وہ پیشے کے تقدس کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اساتذہ کی تربیت سے معاشرہ اور زیادہ نکھر سکتا ہے، اساتذہ کے رویے، حرکات و سکنات، پسند و ناپسند اور برتاؤ کا طلبہ پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اُستاد جب اپنے عمل اور قول سے سب کچھ ثابت کرتا ہے تو اس کے طلبہ میں بھی یہی خوبیاں در آتی ہیں۔ ایک کامیاب اُستاد اپنے مضمون میں مکمل مہارت رکھنے کے علاوہ کلاس کے دوران اپنے طلبہ میں تحریک پیدا کرتا ہے جس سے طلبہ میں علم کی تشنگی پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ اس تشنگی کو دور کرنے کے لئے نئے راستے تلاش کرتے ہیں انہی راستوں پر چلتے چلتے وہ زندگی کا فلسفہ بھی سیکھ جاتے ہیں اور اپنی اصلاح کرنے لگتے ہیں۔

بحث مباحثہ کرنے کے لئے اُستاد کلاس میں عام سا سوال کرتا ہے اور پھر سب اس سوال پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ہر ذہن میں سوچنے کی صلاحیت دوسرے ذہن کی نسبت مختلف ہے جس طرح ہاتھوں کی انگلیاں اور ان کی پوریں اور ان پر بنی ہوئی لائنیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں بالکل اسی طرح سوچنے کی صلاحیت اور سوچنے کا طریقہ بھی ہر انسان کا اپنا اپنا ہے۔ معلّم سوال کرنے کے بعد طلبہ کی ذہنی آزمائش کرتا ہے پھر اسے آزمائش کے دوران سمجھ لیتا ہے کہ کون سا طالب علم کس حد تک سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کا استعمال کرتا ہے پھر اسی طرح وہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ فلاں طالب علم کو کس طرح مستقبل کی

راہوں پر گامزن کرنا ہے۔ ادنیٰ و اعلیٰ لیاقت کے حامل طلبہ کے ساتھ عادلانہ و مساویانہ تعلیمی منصوبہ بندی اور عمل پیرائی ایک اچھے اُستاد کا جوہر خاص ہوتا ہے جس سے وہ اپنے طلبہ کے ساتھ دوستانہ ماحول میں زندگی کی راہیں متعین کرنے میں پیش پیش ہوتا ہے۔ پروفیسر سہارن رائے معاشرے کی بہتری کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ معاشرے میں تعلیم کے ذریعے انقلاب لانے والے اساتذہ میں سے ایک ہیں پروفیسر رائے نے اپنے طلبہ میں انقلاب کی نئی روح پھونکی تھی اس لئے وہ شادی سے بھی دور ہے شمائل سے ان باتوں کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

> ''سارن۔'' اس نے دم لے کر کہا۔'' عورت اور مرد ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک برتر ہے اور دوسرا کم تر۔''
> میں مسکرایا۔ لیکن یہ ایک زخم خوردہ مسکراہٹ تھی۔
> ''شمائل یہ مردوں کی دنیا ہے جو وہ کہتے اور کرتے ہیں وہ معاشرے کا معیار بن جاتا ہے۔'' (۴۰)

پروفیسر سہارن رائے کے اندر بے پناہ محبت کے جذبات موجزن ہونے کے باوجود مقصدیت کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ وہ اپنے اندر کی کیفیات کو بیان نہیں کرتا تھا یا پھر بیان کرنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا ایسا اوقات وہ موضوع کو انتہائی ہنر مندی سے پلٹ لیتا تھا۔ ملاحظہ ہو:

> ''اوہ سارن تم بہت چالاک ہو۔ تم نے بتایا ہی نہیں تم نے شادی کیوں نہیں کی۔
> '' شمائل نے اچانک گفتگو کا رخ بدل دیا۔
> ''میں نے کہانا اور کاموں سے فرصت ہی نہیں ملی۔۔۔
> میں شمائل کے چہرے کو دیکھ رہا تھا یوں لگتا تھا اس کی نظروں میں وہ سارا منظر زندہ ہو گیا ہے۔
> '' کہتے ہیں سارن جیل کی چار دیواری سے باہر لوگوں نے انقلاب زندہ باد کے نعرے صاف سنے۔ یہ عین وہی وقت ہے جب بھگت سنگھ کو پھانسی گھاٹ کی طرف لایا جارہا تھا۔'' (۴۱)

عجز و انکسار کسی بھی انسان کی شخصیت میں نیا پن ہی نہیں بلکہ ایک خوش گوار سکون کا احساس بھی لے کر آتا ہے۔ یہی عاجزی و انکساری انسان کو اس کے مقصد تک پہنچنے میں اہم کردار بھی ادا کرتی ہے۔ پروفیسر

سہارن رائے کے ہاں سب سے زیادہ اہمیت اس کے مقصد کی ہے اور ساتھ ہی پروفیسر سہارن رائے کے ہاں بھی انکسار پایا جاتا ہے۔ جس کو آدھے ادھورے خواب کے مصنف یوں بیان کرتے ہیں کہ:

”شمائل! کہاں بھگت سنگھ اور کہاں میں۔ بس اپنی سی کوشش ہے۔ میرا امیدان تعلیم ہے اور میں سمجھتا ہوں معاشرے میں تبدیلی کا یہ ایک مؤثر ہتھیار ہو سکتا ہے“ میں نے کہا۔

رات گہری ہو چلی تھی۔ شمائل نے گھڑی کو دیکھا اور پھر کہنے لگے” اب مجھے چلنا چاہیے۔“۔۔۔۔

بالکل اسی طرح جیسے سمندر کی لہر واپس جانے کے بعد خوش رنگ سیپیاں باقی رہ جاتی ہیں۔“(۴۲)

اُستاد کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ انسانیت کے چراغوں کو روشن و منور کرنے کے لئے طلبہ کی فطری رجحانات، محرکات،خواہشوں اور رویوں کو شائستہ بنانے کے ساتھ ساتھ انھیں زندگی کی درست سمت پر گامزن کرے، طلبہ میں یقین اور خود اعتمادی پیدا کرے اور طلبہ میں تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کرے۔ اسی طرح اساتذہ کے مطلوبہ اوصاف جن میں علمیت، حس مزاح، پیشے سے دیانت، شخصی جاذبیت، قوت ارادی و غیر جانب داری اور عزت نفس جیسے اوصاف کا پایا جانا نہایت اہم تصور کیا جاتا ہے کیونکہ طلبہ پر گہرے اور دیرپا اثر ایک کامیاب اُستاد کی شخصیت ہوتی ہے۔ یہی اُستاد اگر حقیقت شناس بھی ہو اور نئے تجربات کو کھلے ذہن سے قبول کرنے والا ہو ،نئے تجربات اور رجحانات کے ذریعے طلبہ کے ساتھ تعلقات میں ہم آہنگی اور اخلاقی اقدار پر منحصر رویہ کے ذریعے طلبہ کی کردار سازی کرے تو یہ اُستاد طلبہ کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اُستاد کی شخصیت اس کے طلبہ کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے، طلبہ اُستاد کی عادات واطوار کو نقل کرتے ہیں اور ان کو بطور حوالہ معاشرے میں بتاتے ہیں۔

اساتذہ کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ معزز شخصیات میں ہوتا ہے جس قدر اُستاد میں اوصاف زیادہ ہوں گے اسی طرح اس کے طلبہ میں بھی اقدار کی فراوانی دیکھنے کو ملے گی۔ افلاطون اور ارسطو کا نام بھی قابل ذکر ہے ارسطو اپنے طلبہ کے ساتھ مخلصانہ اور دوستانہ تعلق کے ساتھ درس و تدریس کرتا تھا۔ چہل قدمی کے دوران درس و تدریس کا عمل جاری رہتا ہے یوں چہل قدمی بھی ہو جاتی ہے اور درس و تدریس بھی۔

عظیم فاتح سکندر اعظم کے ساتھ ارسطو کو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ اس نوجوان بادشاہ کی سوچوں پر پہرہ دے سکے۔ سکندر اعظم یونان سے دنیا کو فتح کرنے کی غرض سے نکلا تھا، اس دور میں یعنی قبل مسیح میں سپر پاور یونان اور اس کا بادشاہ جو سکندر اعظم نے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے طاقت کے بل بوتے پر بہت سے علاقے فتح کئے اور واپسی پر جاتے ہوئے راستے میں انتقال کر گیا۔ اس کے ساتھ ارسطو عظیم فلسفی اور اُستاد بھی موجود تھا لیکن جب سکندر اعظم نے اُستاد کی بات کو اہمیت نہ دی اور اپنے جذبات کے ساتھ اور طاقت کے غرور میں آگے بڑھنے سے روکنے اور آرام کرنے کا کہنے پر اپنی مرضی کی تو ارسطو نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اُستاد کی بات کو ماننا اور اس پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے۔ ایک مشہور آزمودہ مقولہ ہے کہ ”با ادب با نصیب۔بے ادب بے نصیب۔“ ادب کرنے سے انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں پہنچنا اسے ناممکن لگ رہا ہوتا ہے۔طلبہ کے ساتھ محبت اور دوستی والا رشتہ قائم کرنے والا اُستاد طلبہ کی تخلیقی اور ذہنی صلاحیتوں کو موثر انداز میں استعمال کرتے ہوئے معاشرے کو بہترین افراد سے نوازتا ہے۔اُستاد کی تربیت کا ہی نتیجہ ہے کہ ہم آج اس مقام پر ہیں اور یہ لکھنا پڑھنا اساتذہ ہی کی بدولت ہے۔

شاہد صدیقی نے پروفیسر سہارن کے ذریعے طلبہ کے اذہان کھولنے کے ساتھ ساتھ طلبہ کی شخصیت سازی جیسے رول کو بھی ادا کروایا ہے۔ کہانی کے ایک اور مرکزی کردار انتثال آغا کی پروفیسر سہارن سے محبت کے موضوع پر مکالمانہ گفتگو اسی بات کی عکاسی کرتی ہے کہ پروفیسر اپنے طلبہ کی رائے کا خیال رکھتے ہوئے ان کی شخصیت کو اعلیٰ درجے پر فائز کرنے کے لیے کوشاں ہیں ملاحظہ ہو!

> ”سر! کل ہاسٹل میں امینہ کے پاس میں نے ایرک سیگال (Erich Segl) کا ناولٹ لو سٹوری (love Story) دیکھا تھا۔ آپ نے پڑھا ہے یہ ناول؟“
> ”ہاں جب یہ ناول آیا تھا تو ایک تہلکہ مچ گیا۔۔۔۔۔۔۔۔ سر رائے بولے ”محبت کاروبار نہیں کہ اس میں مول تول ہو۔ محبت میں کوئی منطق کوئی reasoning نہیں ہوتی۔ آپ جس سے محبت کرتے ہیں اسے خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے عمل کا بدلہ نہیں چاہتے۔ اگر کوئی ایسا چاہتا ہے تو محبت نہیں کاروبار کر رہا ہے۔“(۴۳)

پروفیسر سہارن رائے کی زندگی میں سنجیدگی ہے اور وہ ہر بات کو سنجیدگی کے ساتھ کرنے کے عادی ہیں۔انھوں نے محبت کے موضوع پر گفتگو کر کے اپنی حساسیت اور محبت کی اصل بتانے کی سعی کی ہے۔ پروفیسر سہارن رائے کے نزدیک محبت کے جذبے کو بیان کرنا ناممکنات میں سے ہے، محبت خود کو قربان کر

دینے کا نام ہے، محبت میں انسان کا خود پر کوئی حق نہیں ہوتا، اگر ہوتا ہے تو صرف اس کے محبوب کا، محبت میں انسان کو خود سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے اسے صرف اور صرف اپنے محبوب کے لیے جینا مرنا چاہیے۔ محبت کے موضوع پر گفتگو ملاحظہ ہو:

> ''پروفیسر رائے کو میں نے اب تک تعلیم، زبان، سوشیالوجی اور سیاست پر بات کرتے سنا تھا لیکن آج کا موضوع بالکل جدا تھا۔۔۔۔
>
> ''محبت ایک ایسا جذبہ ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ محبت کسی آدرش، کسی جذبے، کسی نظریے کسی اَن دیکھی صبح سے بھی کی جا سکتی ہے۔''
>
> میرے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی کہ میرے بیگ میں ٹیپ ریکارڈر ہوتا تو میں اس گفتگو کا لفظ لفظ ریکارڈ کر لیتی۔
>
> ''محبت اپنے آپ کو مٹانے کی خواہش کا نام ہے محبت کے معبد میں داخل ہوتے ہیں تو اپنا تجربہ، اپنا مرتبہ انا اس کی دہلیز پر رکھ جاتے ہیں۔'' سر رائے نے اپنی گفتگو کو جاری رکھا۔''(۴۴)

امتثال آغا نے پروفیسر کی باتوں کو یوں اپنے دماغ کے خانوں میں جگہ دی جیسے یہ سب خانے اسی انتظار میں تھے کہ پروفیسر سہارن رائے اس موضوع پر بولیں اور یہ سب ان خانوں کے اندر جذب ہوتا جائے۔ محبت ایک ایسا موضوع ہے جس پر اگر غور کیا جائے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ اس کائنات کا وجود بھی محبت ہی کی وجہ سے ہے۔ امتثال آغا پروفیسر سہارن رائے سے محبت کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے کے متعلق پوچھتی ہے اب وہ خود کو اعزازی طالب علم کہنا چاہتی ہے اور اس کا اظہار یوں کرتی ہے:

> ''سر میں آپ کی براہ راست سٹوڈنٹ نہیں ہوں لیکن آپ سے گفتگو کا اتنا موقع ملا ہے کہ میں خود کو آپ کی اعزازی سٹوڈنٹ کہہ سکتی ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہے سر؟''
>
> ''خواب اور نظریے کی محبت سب سے ارفع محبت ہے جو ہمیں باقی تمام محبتوں سے بے نیاز کر دیتی ہے، یا یوں سمجھو کہ پھر اس خواب اور نظریے سے وابستہ سب لوگوں سے ہمیں محبت ہو جاتی ہے۔ محبت قربانی مانگتی ہے کبھی مال کی، کبھی مرتبہ کی، کبھی جان کی۔''
>
> ''توبہ سر توبہ! میں نے نہیں کرنی یہ محبت۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔''(۴۵)

دنیا کے ترقی یافتہ ممالک اساتذہ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ اُستاد اور معاشرے کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اُستاد معاشرے کو بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اُستاد کے بغیر کسی بھی معاشرے کی تعمیر و ترقی ممکن نہیں۔ اساتذہ کو جب احترام کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تو معاشرہ بگاڑ کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اساتذہ معاشرے کے وہ افراد ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کا تمام تر اثاثہ اپنے تمام تر قاعدے اور ضابطے اور اپنے تمام نظریات کو اپنے معاشرے پر قربان کر دیتے ہیں اور معاشرے کی ترقی اور اصلاح کے لئے ہمہ تن مشغول و مصروف رہتے ہیں تاکہ بہتر زندگی کی بنیادیں استوار کی جاسکیں۔

حضرت محمد ﷺ کی زندگی ہمارے لیے نمونہ ہے۔ آپ ﷺ کو ایک اُستاد کی حیثیت سے دیکھا جائے کہ انہوں نے اپنے شاگردوں سے کس طرح محبت والا رشتہ بنائے رکھا۔ آپ ﷺ نے ہر بات کو، ہر سوال کو چاہے وہ نامناسب ہی کیوں نہ ہو دل جمعی کے ساتھ سنتے اور پھر راہنمائی فرماتے۔ تحمل اور بردباری آپ کے اعلیٰ اوصاف میں سے تھے۔ کسی الجھے ہوئے مسئلے کو بھی آپ ﷺ بڑی جلدی اور خوب صورت انداز میں سلجھا دیتے اور سمجھانے کے لیے مختلف مثالیں دیتے۔ رک رک کر یعنی ٹھہر ٹھہر کر پڑھاتے۔ ایک بات کو دو یا تین دفعہ بھی اگر دہرانا پڑتا تو ناگواری محسوس نہ کرتے بلکہ پیار، محبت اور خلوص کے ساتھ جواب دیتے۔

شاہد صدیقی نے پروفیسر سہارن رائے کو بھی ایسے ہی اعلیٰ اوصاف والے اُستاد کی طرح پیش کیا ہے گو کہ وہ اپنے طلبہ سے کم ملتے ہیں لیکن کلاس کے دوران دوستانہ ماحول کو پروان چڑھاتے ہوئے وہ اپنے طلبہ کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ پروفیسر سہارن کی کلاس میں روز کسی نہ کسی مسئلہ پر بحث ہوتی۔ اس بحث کے دوران وہ تمام طلبہ کو مکمل مواقع فراہم کرتے تاکہ ان کے بند ذہن کھلیں اور معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اپنے اپنے حصے کا کردار ادا کریں۔

انسان اپنی تمام تر زندگی ہمدردی، احساس اور مروت و محبت کے سایہ میں گزارنا چاہتا ہے لیکن بہت سے انسان جو ان احساسات کا تقاضا تو کرتے ہیں مگر خود ان میں یہ تمام لطیف جذبات و احساسات کا فقدان ہے۔ یہ بات روزِ روشن کی مانند عیاں ہے کہ ہم وقت کے دائرے میں تیرتے ہوئے لوگ اپنے آس پاس کے ماحول کو دوستانہ بنانے پر مصر ہیں۔ ایک بچہ اپنے گھر کے ماحول میں، ایک طالب علم اپنی درس گاہ میں اور ایک ورکر اپنی کام کرنے والی جگہ پر دوستی تلاش کرتا پھرتا ہے اگر اسے وہاں دوست مل جائے تو وہ پُرسکون رہتے ہوئے اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے نہیں تو مایوس ہو کر واپسی کی راہ لے لیتا ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ اگر

انسان اپنے ماحول میں دوستی کو پالیتا ہے تو اس کے آگے بڑھنے، پروان چڑھنے اور پھلنے پھولنے کے امکانات پہلے سے کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ زیرِ بحث ناولوں کے مصنفین نے تعلیم کے جہت میں جو مباحث بڑھائے ہیں ان میں اہم پہلو تعلیم کا ہے۔ مذکورہ بالا چاروں ناولوں ___ " دیوار کے پیچھے"، "جنم کنڈلی"، "راجہ گدھ"، "آدھے ادھورے خواب" ___ میں موجود اُستاد کے کردار کو دوستانہ رویہ کا حامل ظاہر کیا گیا ہے۔

"جنم کنڈلی" میں موجود ماسٹر صاحب" آدھے ادھورے خواب" کا پروفیسر سہارن رائے "دیوار کے پیچھے" میں موجود پروفیسر اور " راجہ گدھ" کا مرکزی کردار پروفیسر سہیل ہمیں دوستی کی سطح پر ایک دوسرے سے متماثل دکھائی دیتا ہے۔ یہ اپنے اپنے مختلف العادات رویوں کے باوجود اپنے اثرات اپنے طلبہ پر دوستانہ و مشفقانہ انداز سے ہی ثبت کرتے ہیں۔ ان تمام مذکورہ بالا اساتذہ کو رویہ معاشرے سے تو مختلف ہو سکتا ہے مگر اپنے طلبہ کے لیے سب کا رویہ دوستانہ ہی دکھایا گیا ہے۔

ج: منتخب ناولوں میں اُستاد بطور دوست: مجموعی و تقابلی جائزہ

انسانی معاشرے میں تعمیر و تخریب کا عمل جاری رہتا ہے اور اس عمل کا جاری رہنا ہی زندگی ہے۔ اس کائنات کی یہ سرگرمی خود بخود عمل میں آتی ہے لیکن ایک ماہر ادیب ان تمام تعمیری و تخریبی عوامل کو اپنے افکار و نظریات پر پرکھتا ہے اور نتائج اخذ کرتا رہتا ہے۔ ان کی بدولت وہ آئندہ آنے والی نسلوں کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتا رہتا ہے۔

تمام اصنافِ ادب میں ناول ایسی صنف ہے، جس میں زندگی کی تصویریں جلتی پھرتی دیکھی جا سکتی ہیں۔ زیرِ بحث عنوان کے تحت بھی ہمیں اردو ادب کے ان مخصوص ناولوں میں جہاں زندگی کی اَور بہت سی قدروں کا ادراک کرتا ہے وہیں ان منتخب ناولوں میں استاد کے کردار کو ایک دوست کے روپ میں دیکھتا ہے، کہ مصنفین نے اپنے ناولوں میں کس حد تک استاد اور دوست کے رشتے کو نبھاتا ہے۔

استاد بلاشبہ معاشرے کے نکھار اور ترقی کے لئے بنیادی ستون کی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر استاد ایک اچھے دوست کا روپ بھی دھارے تو معاشرے کی خوبصورت قدروں اور تعلیمی میدان کے مختلف زینوں کو عبور کرنے میں اور بھی آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور معاشرہ اور معاشرتی قدروں میں عمدگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

سب سے پہلے ہم بانو قدسیہ کے ناول "راجہ گدھ" کے مرکزی کردار پروفیسر سہیل کو لیتے ہیں۔ جو مختلف دوسری اقدار کے ساتھ بحیثیت دوست بھی سامنے آتا ہے۔ پروفیسر سہیل سے ہمارا تعارف کلاس روم

میں ہوتا ہے، جو بلا تکلف اپنے طالب علموں کو موٹر سائیکل کی سہولت سے مستفید ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ نہ صرف یہ ظاہری طور پر بلکہ ایک استاد کی شکل میں کلاس اور کلاس روم کے باہر اپنے طالب علموں کے ساتھ بالکل دوستانہ رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ جس سے بہت سے فلسفیانہ اور تعلیمی معاملات کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

"دیوار کے پیچھے" میں انیس ناگی نے ایک ایسے استاد کے کردار کو تراشا ہے، جو اپنی تمام تر فتوحات اور شعوری ترقیوں کے باوجود زمانے کی چیرہ دستیوں سے نبرد آزما نہیں ہو سکا۔ لیکن اگر اسے بھی امن اور آشتی کا سایہ کہیں نظر آیا ہے تو اپنے دوست کے حوالے سے ہی آیا ہے۔ ایک ایسا استاد جو معاشرے میں اپنا کوئی مقام نہیں حاصل کر سکا وہ اپنے دوستانہ روپ میں اس معاشرے کا مقابلہ کرتا ہے۔

"جنم کنڈلی" کے ماسٹر جی کا کردار خاص طور پر خاص اہمیت کا حامل ہے۔ فہیم اعظمی کے دنیا بھر کے افکار و نظریات کے ساتھ ماسٹر جی کا کردار اپنے طالب علموں کے ساتھ محبت بھرا اور دوستانہ ہے۔ عمروں کے بڑے فاصلے کے باوجود استاد اور شاگردوں کا رشتہ منہ میٹھا کرانے والا ہی رہتا ہے۔ زندگی کے بڑھتے ہوئے مسائل کے ساتھ آٹھ آٹھ آنے کی نذر لیتے ہوئے استاد کو جب اپنے طالب علم کے حالات و واقعات کا علم ہوتا ہے تو وہ بغیر آٹھ آنے کے سرٹیفکیٹ فراہم کر کے ایک بڑے دوست کا ثبوت فراہم کر دیتا ہے۔ استاد کی شخصیت ایک گھنے چھاؤں والے درخت کی سی ہوتی ہے جو چھاؤں سے بے خبر ہو کر ہر آنے والے کے لئے اپنے دامن اور بازو پھیلا دیتا ہے۔ یہاں پر ماسٹر جی کا کردار بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ ہر طالب علم اس کے لئے اہم ہے اور وہ اس کی آبیاری اچھے دوست کی طرح ہی کرتا ہے۔

شاہد صدیقی عصرِ حاضر کے ایک بڑے نبض شناس اور ماہر تعلیم ہیں۔ جو معاشرے میں عدل و انصاف اور معاشرتی و معاشی ناہمواری کو خاص موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے ناول میں معاشرتی قدروں کے زوال کا رونا اور ان تاریک راہوں کو روشنیوں سے بھر دینے کی خواہش نظر آتی ہے۔ ان کا ناول "آدھے ادھورے خواب" ایک ایسے استاد کی کہانی ہے جو کلاس روم میں عقائد و نظریات کی فراوانی کو اپنے خاص پیغام کی صورت میں پہنچاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ دوستانہ انداز میں ہر طالب علم کو اپنی شخصیت، نظریے اور سوچ کی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور یہ گرفت اتنی مضبوط اور اعلیٰ ہوتی ہے کہ قاری کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ کہانی آگے کی طرف بڑھتی رہتی ہے اور طالب علم اور قاری اس میں گرفتار ہوتے رہتے ہیں یہاں تک

کہ ناول نگار اپنا کام تمام کر لیتا ہے اور قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔اور اس کا طالب علم اپنے اندر اعلیٰ خصوصیات پیدا کر کے اپنے معاشرے کو بدلنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان ناولوں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ استاد کا کردار نبھایا گیا ہے اور ان میں بحیثیت دوست اعلیٰ خوبیوں کو دکھاتے ہوئے ان کے افکار و نظریات کو درست طور پر قاری تک پہنچایا گیا ہے۔اور آئندہ کے لئے ان کرداروں اور خوبیوں کے حامل کردار کو فکشن کی دنیا میں جاری و ساری کر دیا ہے۔اور ناول نگاروں نے اپنے کام کو درست طور پر اپنے قاری تک اپنی بات پہنچا دی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اقبال علامہ، کلیاتِ اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ص۵۱۱

۲۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۱۰-۱۱

۳۔ ایضاً، ص۲۰۴

۴۔ ایضاً، ص۲۰۹-۲۱۰

۵۔ ایضاً، ص۲۱۰

۶۔ ایضاً، ص۲۱۱

۷۔ ایضاً، ص۲۳۶-۲۳۷

۸۔ ایضاً، ص۲۳۷

۹۔ ایضاً، ص۲۷۶

۱۰۔ ایضاً، ص۲۷۶-۲۷۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۷۸

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً، ص۲۷۹-۲۸۰

۱۴۔ ایضاً، ص۲۸۰

۱۵۔ ایضاً، ص۴۲۷

۱۶۔ ایضاً، ص۴۲۸

۱۷۔ ایضاً، ص۴۲۸-۴۲۹

۱۸۔ انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۵۲

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ ایضاً، ص ۶۱-۶۲

۲۱۔ ایضاً، ص۶۲

۲۲۔ ایضاً، ص۸۰

۲۳۔ ایضاً، ص۱۱۶-۱۱۷

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۷۲-۱۷۳

۲۵۔ فہیم اعظمی، جنم کنڈلی، الباقریہ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۳۹

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۹-۴۰

۲۷۔ ایضاً، ص ۴۷

۲۸۔ ایضاً، ص ۵۰

۲۹۔ شاہد صدیقی، آدھے ادھورے خواب، جہانگیر بکس، فیصل آباد، ص ۱۹

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۹-۲۰

۳۱۔ ایضاً، ص ۴۰-۴۱

۳۲۔ ایضاً، ص ۴۱

۳۳۔ ایضاً، ص ۴۲

۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ ایضاً، ص ۴۳-۴۴

۳۶۔ ایضاً، ص ۴۶-۴۷

۳۷۔ ایضاً، ص ۴۸-۴۹

۳۸۔ ایضاً، ص ۴۹-۵۰

۳۹۔ ایضاً، ص ۶۴-۶۵

۴۰۔ ایضاً، ص ۹۴

۴۱۔ ایضاً

۴۲۔ ایضاً، ص ۹۴-۹۵

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۲۴-۱۲۵

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۲۶

ماحصل

زندگی کی رعنایوں کو ناول میں پیش کرنا ایک بنیادی نقطہ ہے۔ زیر بحث ناولوں میں استاد کے مقام و مرتبہ کو ان ناولوں کے مصنفین نے اپنے اپنے انداز پیش کیا ہے۔ اُستاد بحیثیت فلسفی دیکھیں تو ”جنم کنڈلی“ کے ماسٹر صاحب کا کردار گو کہ مبہم ہے لیکن درحقیقت اس ناول میں مصنف نے وقت کو ہی ایک اُستاد کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے مختلف ادوار کے اور مختلف مکاتب ہائے فکر کے فلسفیوں سے اپنے قاری کا رابطہ کروایا ہے، جبکہ ”راجہ گدھ“ میں موجود پروفیسر سہیل کا کردار اس کے بالکل برعکس دکھائی دیتا ہے۔ گو کہ تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش تو کی جاتی ہے لیکن پروفیسر سہیل کی ذاتی زندگی کا فلسفہ اس کی اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کے گرد گھومتا ہے، وہ اچھائی اور برائی ،خوبی اور خامی، سچ اور جھوٹ، حلال اور حرام کے فلسفوں کو مختلف انداز میں پیش تو کرتا ہے لیکن خود ان پر عمل درآمد کرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ پروفیسر سہیل کے برابر میں اگر پروفیسر سہارن رائے کو دیکھا جائے تو اس کے طریقہ تدریس میں ایک نیا پن ہے وہ انتہائی اچھوتے لیکن غیر محسوس انداز سے محبت ،پیار اور خواہش کا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ وہ ہارنے کو کمزوری نہیں سمجھتا بلکہ اپنے عجز و انکسار سے اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنا جانتا ہے۔ اگر ”دیوار کے پیچھے“ کے پروفیسر کی زندگی کا فلسفہ دیکھا جائے تو وہ ان تینوں سے مختلف ہے، وہ اپنے آس پاس کی زندگی کو اپنے انداز میں دیکھتا ہے اور یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے اس کو اس کی حیثیت کے مطابق مقام نہیں دیا جارہا۔ یہی حیثیت کا فلسفہ اسے احساس کمتری کی طرف دھکیلتا چلا جاتا ہے، یہی احساس اسے گمنامی کی گہرایوں میں بھی لے جاتا ہے۔ اور زندگی بسر کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

اگر ہم بحثیت قائد لیتے ہیں تو ہمیں بانو قدسیہ کے شاہکار ”راجہ گدھ“ کا مرکزی کردار پروفیسر سہیل انتہائی ڈرامائی انداز میں اپنے طلبہ پر قیادت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے طلباء اس کی قیادت کے معترف بھی ہیں اور اس کی غیر موجودگی میں بہتر الفاظ میں اس کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ دوسری طرف پروفیسر سہارن رائے کا کردار بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے ہاں مگر یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ پروفیسر سہارن رائے اپنے اندر ایک جھجک قیادت کے معاملے میں ضرور رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ تکالیف کا سامنا خود کرتے ہیں، ان تکالیف کے لئے اپنے طلبہ کو پیش نہیں کرتے۔ ”دیوار کے پیچھے“ میں موجود پروفیسر قیادت کے معاملے

میں بے معنی دکھائی دیتا ہے کیوں کہ وہ اپنے طور پر ایک معاشرے کا قائد بننے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس کی شخصیت میں در حقیقت ایسا کچھ نہیں ہے، البتہ وہ سمجھتا ہے کہ معاشرے میں اس کا جو مقام ہونا چاہیے وہ اسے نہیں مل رہا حالانکہ وہ اس قدر باصلاحیت نہیں کہ وہ معاشرے میں اس مقام تک رسائی حاصل کر سکے جو کچھ اس کے خیال میں موجود ہے۔ یہ بات مسلمہ و مصدقہ ہے کہ ایک قائد مین ایسی صلاحیتیں موجود ہونی چاہئیں جو اس کے چاہنے والوں کے لئے مثالی درجہ رکھتی ہوں۔ اور یہ بات "جنم کنڈلی" کے ماسٹر جی میں دیکھی جا سکتی ہے۔

بحیثیت مجموعی اگر ہم چاروں ناولوں میں دوستانہ رویوں کو ڈھونڈتے ہیں تو ہمیں اپنے طلبہ سے سب سے زیادہ قریب پروفیسر سہیل ہی نظر آتے ہیں۔ "راجہ گدھ" کے اس مرکزی کردار کے بارے میں یہ رائے قائم کرنا اس وجہ سے بھی معتبر ہے کہ وہ اپنے طلبہ کی ذاتی زندگی میں گھل مل جاتے ہیں اور ان کے مسائل پر سیر حاصل بحث بھی کرتے ہیں اور اس کے علاوہ ان کی ذاتی زندگی میں اس قدر دخیل ہوتے ہیں کہ طلبہ ان کو اپنی ذات کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر ہم دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں تو پروفیسر سہارن رائے کی شخصیت بھی ہمیں طلبا کے درمیان کافی معتبر نظر آتی ہے۔ پروفیسر سہارن رائے دوستانہ رویہ جات کے حامل تو ہیں لیکن وہ طلبا کے درمیان اپنا شخصی مقام برقرار رکھنا بھی بخوبی جانتے ہیں۔ پروفیسر سہارن رائے کے برعکس "دیوار کے پیچھے" کے پروفیسر میں یہ خامی ہے کہ دوستی کو اس قدر بڑھاتے ہیں کہ اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ مذکورہ بالا تینوں ناولوں کے مقابلے میں "جنم کنڈلی" میں ہمیں دوستانہ رویہ کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں اور اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مصنف نے اپنے ناول کو زیادہ تر علامات پر استوار کیا ہے۔

راجہ گدھ کے پروفیسر سہیل کی شخصیت متنازع ہے کیوں کہ اس میں قائدانہ صلاحیت موجود ہے لیکن منفی و مثبت کی پہچان کا شعور اس کی سرشت میں نہیں ہے۔ وہ ان کاموں کو کرنا پسند کرتا ہے جن کو وہ پسند کرتا ہے اور جو وہ نہیں کرنا چاہتا وہ ان میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ یوں کہہ لیجیے کہ پروفیسر سہیل کے ہاں درست اور غلط کا معیار اس کی اپنی پسند ناپسند ہے۔ بحیثیت مجموعی وہ ایک دلچسپ شخص ہے۔ "راجہ گدھ" کے حوالے سے ایک اُستاد کو اس لحاظ سے بھی متنازع دکھایا گیا ہے کہ وہ بہت کچھ کہتا ہے مگر اس پر خود عمل نہیں کرتا۔

انیس ناگی کے مشاہدہ میں آنے والے اُستاد کی حالت دگرگوں ہے۔ "دیوار کے پیچھے" میں موجود پروفیسر کا کردار ایک ایسی جنگ میں مبتلا دکھایا گیا ہے جو کہ اپنے ضمیر کی بات مانے تو اسے معاشرہ ٹھکرا دیتا ہے اور اگر معاشرے کے نقش قدم پر چلے تو ضمیر ملامت کرتا ہے۔ اس ناول میں ایک اُستاد اور اس میں موجود

روحانیت کے قضیہ کو معاشرہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ انسانیت کا ایسا بے رحم چہرہ دکھایا گیا ہے کہ جس میں ایک اُستاد کی توقیر کا احساس تک نہیں ہے۔ انیس ناگی کا زیرک مشاہدہ اس المیہ کا اظہار ہے جو کہ آج کل کے اساتذہ کے ساتھ اس بے رحم معاشرہ کے ہاتھوں روا رکھا گیا ہے۔ یہ اساتذہ کی بے توقیری کا نوحہ ہے۔

کوئی بھی مصنف جب کسی کردار پر قلم کشائی کرتا ہے تو اس میں سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ وہ کردار اس مصنف کی نظر میں کیسا ہے۔ شاہد صدیقی نے انتہائی باریک بینی سے ایک ایسے اُستاد کا چہرہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے جو تمام تر مشکلات کو خود پر برداشت کرتے ہوئے اپنے طلبہ پر آنچ بھی نہیں آنے دیتا۔ اس کے ہاں پروفیسر سہارن رائے کا مقام بہت بلند تر ہے۔ پروفیسر سہارن رائے انقلابی شخصیت کا حامل ہے اور وہ اپنے طلبہ میں قائدانہ صلاحیتیں اجاگر کرنا اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ اس دوران میں آنے والی تمام مشکلات کو خود برداشت کرتے ہوئے اپنے طلبہ کو ان سے از حد محفوظ رکھتا ہے تاکہ کسی کا مستقبل متاثر نہ ہو۔ بانو قدسیہ کے ہاں تعلیم اور اُستاد کا تصور عمومی نہیں ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ پروفیسر سہیل کا کردار بانو قدسیہ کے تعلیمی نظام پر عمیق تر مشاہدے کا فلسفہ ہے کیوں کہ پروفیسر سہیل کی شخصیت میں جدید دور کے اساتذہ کی تعداد کو دکھایا گیا ہے یہ کہنا بے جا نہیں ہو گا کہ پروفیسر سہیل کی سوچ میں اور عمل میں پائے جانے والے منفی رجحانات بالعموم اساتذہ میں نہیں ہوتے لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بانو قدسیہ کے ناول ''راجہ گدھ''میں پروفیسر سہیل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ باقی تمام تر کردار ''راجہ گدھ'' کے آس پاس گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر سہیل اپنی باتوں میں الجھا کر دوسروں کو اپنی بات پر قائل کر لینے کا ماہر ہے

''راجہ گدھ'' کا کردار پروفیسر سہیل کی صورت میں بانو قدسیہ نے ایک ایسے شخص کا چہرہ دکھانے کی کوشش کی ہے جو شعبہ تدریس سے منسلک ہونے کے باوجود اپنی حیثیت سے ناآشنا ہے۔ پروفیسر سہیل کی ذات میں لاابالی پن ہے جس کی بنا پر وہ اپنی شخصیت میں موجود منفی عادات پر شرمندہ ہونے کی بجائے ان کو اپنی زندگی کا باقاعدہ حصہ سمجھتا ہے۔ پروفیسر سہیل کے قول و فعل میں تضاد بھی دکھایا گیا ہے کیونکہ جن باتوں کو وہ عمومی زندگی میں حرام گردانتا ہے وہ خود بھی ان پر عمل پیرا دکھائی دیتا ہے۔

شاہد صدیقی کے ناول ''آدھے ادھورے خواب''میں پروفیسر سہارن رائے کی شخصیت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ شاہد صدیقی کے قلم نے ایک ایسے اُستاد کی حقیقت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو ایک حد سے زیادہ جارح مزاج ہے۔ پروفیسر سہارن رائے کی جارحیت اس کی زندگی کو مشکلات میں دھکیلتی چلی جاتی ہے۔ پروفیسر سہارن رائے مشکلات کو خود پر برداشت کرنے کا قائل ہے اور اپنے طلبہ کو وقت کے

تھپیڑوں کے زیر اثر نہیں چھوڑتا۔ گو کہ بہت سے لوگ اس کے نقشِ قدم پر چلنا مناسب سمجھتے ہیں لیکن پروفیسر سہارن رائے میں بھی کہیں نہ کہیں مایوسی کے امکانات موجود ہیں جن کو وہ اپنی انکساری کی آڑ میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

انیس ناگی کا ناول ''دیوار کے پیچھے'' ایک ایسے اُستاد کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے جو کہ بحیثیت اُستاد اپنے آپ کو معاشرے میں منوانے میں ناکام رہا ہے۔ یہ صرف ایک پروفیسر کی نہیں بلکہ ہمارے آس پاس بکھرے ہوئے بہت سے کرداروں کی کہانی ہے۔ شعبہ تدریس دراصل پیغمبری پیشہ ہے لیکن ہمارے یہاں یہ رواج عام ہے کہ جس کے پاس کوئی ہنر نہیں ہوتا وہ اس شعبہ سے منسلک ہونے میں اپنی عافیت سمجھتا ہے۔ انیس ناگی نے دوطرفہ رویہ جات کی عکاسی کرتے ہوئے ایک طرف تو اساتذہ کے لئے معاشرے کی بے مروتی کو ظاہر کیا ہے اور دوسری طرف وقتی اور موسمی اُستادوں کے چہرے کی نقاب کشائی بھی کی ہے۔ ''دیوار کے پیچھے'' میں موجود پروفیسر کا کردار گو کہ برائی تک نہیں پہنچنا چاہتا لیکن اس کے حالات اس کو برائی کی دلدلوں میں دھکیلتے چلے جاتے ہیں۔ وہ برائی کو برا سمجھتا ہے لیکن برائی میں اترتا ہے۔

اُستاد ایک ایسی عظیم ہستی ہے جس کا تعلق انسان کی روحانیت سے ہے۔ جس طرح کوئی ماہر سنگ تراش کسی پتھر سے ایک خوب صورت مجسمہ تراشتا ہے بالکل اسی طرح ہی ایک اُستاد انسان کی شخصیت میں موجود مختلف پہلوؤں کو مہذب بناتا ہے کہ اس انسان کی روحانی تسکین کا باعث بن سکے۔ زیر بحث تمام تر ناولوں ــــــ ''آدھے ادھورے خواب''، ''جنم کنڈلی''، ''راجہ گدھ'' اور ''دیوار کے پیچھے'' ــــ میں ان کے مصنفین نے اساتذہ کو مختلف رنگوں کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

نتائج

زیر بحث چاروں ناولوں میں ہمارے معاشرے میں اُستاد کے ساتھ کیے جانے والے رویے کو دکھایا گیا ہے۔ اُستاد کسی بھی قوم کے لیے ایک معمار کی حیثیت رکھتا ہے اور معمار بھی وہ جو اپنی قوم کی نظریاتی، اخلاقی، روحانی اور معاشرتی سطح پر معینہ حدود کو تعمیر کرتا ہے۔ زیر بحث ناولوں کی تفصیلی تجزیے کے بعد اُستاد کے متعلق درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

- زیر بحث ناولوں "راجہ گدھ"، "آدھے ادھورے خواب"، "جنم کنڈلی" اور "دیوار کے پیچھے" کے مصنفین نے اپنے اپنے انداز میں دیکھا، پرکھا اور پھر احاطہ تحریر میں لے کر آنے کی جسارت کی۔ البتہ چاروں مصنفین کی جانچ کا پہلو الگ الگ ہے۔ بانو قدسیہ، فہیم اعظمی، انیس ناگی اور شاہد صدیقی نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے ایک اُستاد کو فلسفہ دوستی و محبت اور قائدانہ صلاحیتوں کے پیمانوں پر جانچ کر اُستاد کی معاشرے میں اہمیت وضرورت کو واضح کیا ہے۔ یہ فرق بنیادی طور پر مصنفین کے اس جداگانہ نقطہ نظر کی نشاندہی کرتا ہے جو ان کے سماجی شعور کا مظہر ہے۔
- "راجہ گدھ" میں پیش کیا گیا استاد کا کردار پروفیسر سہیل دوست، فلسفی اور رہنما کی خصوصیات میں مقابلتاً زیادہ توازن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کے شاگرد اس سے بات کرتے ہوئے یا تعلق رکھتے ہوئے عام طور پر کم جھجک کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ یونیورسٹی کی سطح کا استاد ہے اور اس کے طالب علم پختہ فکر ہیں۔ ان کے مسائل پیچیدہ اور گہرے سماجی زاویے رکھتے ہیں۔ اس لیے اس کا دوستانہ رویہ کھل کر سامنے آتا ہے۔
- "دیوار کے پیچھے" میں پیش کیا گیا پروفیسر کا کردار زیرِ نظر تحقیق کے تینوں حوالوں سے ایک ناکام کردار ہے۔ نہ وہ کسی کا اچھا دوست بن سکا اور نہ رہنما کی خصوصیات کا مظاہرہ کر سکا۔ فلسفی کے طور پر بھی اس کا کردار زیادہ تر مجہولیت کا نمائندہ ہے۔ وہ اعلیٰ صلاحیتوں سے متصف ہونے کے باوجود مجموعی طور پر معاشرے میں ایک غیر متحرک اور غیر فعال آدمی ثابت ہوتا ہے۔
- فہیم اعظمی کے ہاں "جنم کنڈلی" کے ذریعہ سے بیان کیا گیا اُستاد علامتی ہے۔ تجسس کی بات یہ ہے کہ اس میں قارئین کو وقت کے دائرہ میں پھیلے ہوئے بہت سے فلسفیوں، ماہرین تعلیم اور مفکرین سے ملنے کا موقع میسر آتا ہے۔ یوں کہنا مناسب ہو گا کہ وقت خود ایک اُستاد ہے اور انسان وقت کے

ساتھ ساتھ سیکھتا چلا جاتا ہے۔ گزرتے لمحوں کا دکھ کے ساتھ انسان پر زندگی کے مختلف پہلوؤں کی حقیقت عیاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ سیکھنے کی کوئی اور وجہ نہیں ہوتی اور انسان ہمہ وقت کچھ نہ کچھ سیکھنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ جنم کنڈلی کے ذریعے سے مختلف ادوار اور امیدوار کی حقیقت تو مختلف تہذیبوں اور ان کے رسوم و رواج، مختلف مذاہب اور ان کے پیروکاروں کے رویہ جات کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔

- "آدھے ادھورے خواب" کا رائے سہارن مثالی کردار ہے۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر اپنے طالب علموں کے لیے زندگی کی راہ ہموار رکھتا ہے۔ وہ اپنی دوستانہ، قائدانہ اور فلسفیانہ بصیرت کا اظہار اپنے کردار و عمل میں ایسے کرتا ہے کہ طالب علم اور استاد کے مابین احترام والا فاصلہ برقرار رہتا ہے۔ یہی فاصلہ اس کے طالب علموں میں جستجو اور تحریک پیدا کرتا ہے۔

سفارشات

ان نتائج کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

- اردو ناول نگاروں نے معلم کے کردار کے حوالے سے معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کردار کی مختلف جہات کی گرہ کشائی کی ہے۔ متعلقہ سرکاری اور نجی اداروں کو اساتذہ کی تربیت کے مختلف پروگراموں کا خاکہ بناتے وقت تخلیقی ادب سے حاصل کی گئی اس روشنی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔
- مختلف سطح کے نصابات میں مثالی استاد کے کردار کی خوبیاں اجاگر کرنے والی تحریروں کی شمولیت کو یقینی بنایا جانا چاہیے تاکہ آج کے طالب علم جب کل کے استاد بنیں تو ان پر نظری سطح پر کتابوں کے ذریعے اور عملی سطح پر اپنے اساتذہ کے کردار و عمل کے ذریعے استاد کی شخصیت کے مختلف پہلو بخوبی آشکارا ہوں۔
- زیرِ نظر تحقیق میں جو ناول منتخب کیے ہیں، ان چاروں میں استاد کا کردار مرد کا ہے۔ ناولوں میں نسوانی کرداروں میں معلمین کی موجودگی کم کم رہی ہے اور کوئی قابلِ ذکر ناول خاتون استاد کے مرکزی کردار کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ افسانے میں البتہ ایسی تحقیق کی جاسکتی ہے اور خواتین اساتذہ کے ضمن میں ایسی ہی تحقیق کی ضرورت موجود ہے۔

کتابیات

القرآن الحکیم

بنیادی مآخذ

انیس ناگی، دیوار کے پیچھے، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۸ء

بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء

شاہد صدیقی، آدھے ادھورے خواب، جہانگیر بکس، فیصل آباد، ۲۰۰۹ء

فہیم اعظمی، جنم کنڈلی، الباقریہ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۴ء

ثانوی مآخذ

کتب

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، ۲۰۱۵ء

احمد شبلی، ڈاکٹر، تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۹ء

اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء

اقبال خان، جدید تعلیمی فلسفہ (جان ڈیوی سے پاؤلو فریرے تک)، مترجم (مسعود اشعر) مشعل، لاہور، ۱۹۹۶ء

اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر الہ آبادی، جلد اول، بزم اکبر، کراچی، ۲۰۰۶ء

الطاف حسین حالی، مولانا، دیوان حالی، نامی پریس، کانپور، ۱۸۹۳ء

ای۔ ایم فارسٹر، ناول کا فن، مترجم ابوالکلام قاسمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء

جے کرشن مورتی، تعلیم اور زندگی کی اہمیت، ادارۂ انیس اردو، الہ آباد، ۱۹۶۰ء

ذاکر حسین، ڈاکٹر، تعلیمی خطبات، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۱ء

ساغر صدیقی، دیوانِ ساغر صدیقی، خیام پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء

سبط حسن، ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۷ء

سعید انصاری، اکابر تعلیم، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دلّی، ۱۹۷۳ء

سلیم اختر ڈاکٹر، نگاہ اور نقطے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء

سیّد محمد سلیم، پروفیسر، مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۸ء
سیّد وقار عظیم، سیّد، داستان سے افسانے تک، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۰ء
عابد علی عابد، سیّد، اصول انتقاد ادبیات، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء
عشرت حسین بصری، تعلیم اور مغربی مفکر (طبع چہارم)، جناح بک سنٹر، ملتان ، ۲۰۰۱ء
علی بن عثمان ، ہجویری ، داتا گنج بخشؒ، کشف المحجوب (مترجم) علامہ فضل الدین گوہر ، ضیاء القرآن لاہور، جون ۲۰۱۰ء
فخر الدین محمد بن رازی، امام، فلسفہ مشرق (مباحث مشرقیہ)، ترجمہ از سید عبد الباقی شطاری ، ہادی بکس، کراچی، ۲۰۱۹ء
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء
فریاد آزر، ڈاکٹر، خزاں میرا موسم، میڈیا پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۰
کامران اعظم سوہدروی، اسلام اور فلسفہ، بک ٹائم، کراچی، ۲۰۱۷ء
لالہ رام نرائن لال، لغاتِ فارسی، لالہ رام نرائن لال بک سیلر وپبلیشر، الہٰ آباد، ۱۹۳۱ء
محمد اقبال، علّامہ، کلیات اقبال، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی فروری ۱۹۸۱ء
محمد اکرام حسین، محبتوں کے درمیاں، احسن پبلی کیشنز، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء
محمد اکرام قریشی، پروفیسر، فلسفہ و تاریخ تعلیم (طبع ششم)، مجید بک ڈپو، فیصل آباد، ۱۹۸۲ء
محمد عثمان، پروفیسر، نئے تعلیمی تقاضے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۷۵ء
محمد عیسی خان، تعلیمی فلسفہ اور تاریخ، عملی کتاب خانہ، لاہور، ۲۰۰۸ء
محمد نواز کنول، ڈاکٹر، مولانا جلال الدین رومی ایک مطالعہ، خوشی محمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء
محمد یسین، ڈاکٹر، ناول کا فن اور نظریہ، خدا بخش پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۲ء
مصطفیٰ علی خاں، معاشرہ، سکول اور اُستاد، مجید بک ڈپو، فیصل آباد، ۱۹۸۳ء
ملک اشفاق، ارسطوحیات، فلسفہ اور نظریات، بک ہوم، لاہور، ۲۰۱۵ء
ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کرداروں کا حیرت کدہ، فضلی سنز، کراچی، ۲۰۱۵ء
منیر نیازی، کلیات منیر، دوست پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

مورس۔ای۔ایس، تعلیم کی نفسیاتی اساس، مترجم، عبداللہ ولی بخش قادری، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء
نادر علی خان، اردو صحافت کی مختصر تاریخ، بُک چینل، سمن آباد، لاہور، ۱۹۹۳ء
وزیر آغا، ڈاکٹر، تخلیقی عمل، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۰ء
ولیم شیکسپئر، ہیملٹ، مترجم، فراق گورکھپوری، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء
یوسف شیدائی، پروفیسر، مسلم فلسفہ، عزیز پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۴ء

انگریزی کتب

1. E.L Thorndike, Seott, Foresman Advanced ,Dictionary, Foresman and company, Glenview illionis, America, 1941

اخبارات ورسائل

روزنامہ دنیا، ۸ جولائی ۲۰۱۸ء
روزنامہ نئی بات، ۸ نومبر ۲۰۱۸ء
روزنامہ دنیا، ۶ مئی ۲۰۱۸ء
نوائے وقت، ۱۷ دسمبر ۲۰۱۶ء

لغات

راجیسور راؤ اصغر، راجہ، ہندی اردو لغت (جلد دوم)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء
سیّد احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء
سید تصدق حسین رضوی، مولوی، لغات کشوری (فارسی اردو)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء
شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء
فیروز اللغات، اردو جامع، مرتبہ، الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۲ء
محمد امین بھٹی، محمد ثقلین بھٹی، اظہر اللغات، اظہر پبلشرز، لاہور
محمد عبداللہ خان، خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء
نور الحسن نیّر، مولوی، نور اللغات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء
وارث سرہندی: ''علمی اردو لغت (جامع)'' علمی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳ء

وارث سرہندی، قاموس مترادفات (طبع چہارم)،اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۱۷ء

انٹرنیٹ

ا. /pk/19578/lubaba-najmi-com-humsub-https://www

۲. آشو مشرا، www.rekhta.com